پوپ کو کیا لے ڈوبا ؟ خفیہ حقائق افشا کرتی رپورٹ

دو پھلوں کی ناراضی

/urdudigest.pk

اُردو ڈائجسٹ

مئی 2013ء

جاپانی اپنا ہدف نہیں بھولتے

پاکستان میرا دوسرا گھر ہے

سینئر جاپانی سفارت کار

توشی کاشی ایسوموورا

مزید اس شمارے میں

سیلف ہیلپ

ہنسی سے بھری زندگی

آسودگی کا دوسرا نام

صحت

ورزش کے 7 سچ جو اصل میں جھوٹ ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا قرآن

دعا مانگنے کے آداب

جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔ جب دعا مانگیں تو چاہیے میرا حکم مانیں O

(بقرہ:186:2)

اور تمھارے رب کا ارشاد ہے کہ تم مجھ سے دعا مانگو کہ میں تمھاری دعا قبول کروں۔ بیشک جو لوگ میری بندگی سے تکبّر کرتے ہوئے منہ موڑتے ہیں عنقریب ذلیل ہو کر جہنّم میں داخل ہوں گے O

(مؤمن:60:40)

رسول ﷺ کا فرمان

دعا پورے اعتماد سے مانگیں

حضرت انسؓ سے روایت ہے رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص جب دعا مانگے تو بڑے عزم و اعتماد سے اللہ تعالیٰ سے سوال کرے۔ یہ ہرگز نہ کہے: اے اللہ اگر تو چاہے تو مجھے دے دے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے کہ جسے کوئی مجبور کرنے والا نہیں ہے۔'' (امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کام کرتا ہے اپنی خوشی اور مرضی سے کرتا ہے اس لیے بندے کو یہ شرط لگانا: کہ اگر تو چاہے تو ایسا کر دے مناسب نہیں۔ اس میں ایک طرح کی لاپروائی جھلکتی ہے۔ غلام کو چاہیے کہ اپنے آقا سے بہ اصرار اور گڑگڑا کر مانگے اور اس حقیقت کا علم کہ دینا مناسب ہے یا نہ دینا اس کے لیے چھوڑ دے وہ بہتر جانتا ہے)

(صحیح بخاری کتاب 70۔ باب 21: مسلم کتاب الذکر۔ باب 3)

اُردو ڈائجسٹ

مئی 2013ء
جمادی الثانی 1434ھ
جلد نمبر 53 شمارہ نمبر 5
www.urdudigest.pk

صدر مجلس ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ الطاف حسن قریشی
مینیجنگ ایڈیٹر طیب اعجاز قریشی

ایڈیٹر اختر عباس
مجلس تحریر حافظ افروغ حسن ، سید عاصم محمود ، صفیرہ بانو شیریں
نوید اسلام صدیقی ، سلمٰی اعوان
مہتمم طباعت فاروق اعجاز قریشی انچارج کمیونیکیشن افنان کامران قریشی
تخلیق و تزئین محمد شہباز، محمد شبیر ، راسخ رضا کمپوزر اشرف سکندر
پروف خواں کلیم اللہ فاروقی معاونین غلام سجاد، حنا انور

مارکیٹنگ / اشتہارات

advertisement@urdu-digest.com

ڈائریکٹر مارکیٹنگ ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ احمد فیاض 0322-7474010
لاہور ندیم حامد 0300-4242620
گجرات / گوجرانوالہ احسان اللہ بٹ 0300-9620294

سالانہ خریداری

خریداری نمبر ضرور تحریر کیجیے
subscription@urdu-digest.com فون: +92-42-37589957

اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے

پاکستان 1080 کے بجائے 750 روپے میں
330 روپے کی شاندار رعایت کے ساتھ

بیرونِ ملک 50 امریکی ڈالر

اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731
editor@urdu-digest.com

قیمت: 90 روپے

طارق محمود نے الطاف حسن قریشی کے جسارت پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سمن آباد لاہور سے شائع کیا

منیجنگ ایڈیٹر نوٹ

16 سال پہلے مجھے جاپان جانے کا موقع ملا۔ جاپان کے سفارتخانے نے پورے پاکستان سے تقریباً 8 نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو یوتھ کلچرل ایکسچینج پروگرام کے تحت منتخب کیا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق یہ منتخب نوجوان آنے والے سالوں میں پاکستان کے مختلف شعبہ جات میں نمایاں خدمات انجام دیں گے۔ ایک ایف ایم ریڈیو کے مشہور مگر نوجوان ڈی جے تھے اور کچھ خواتین کا تعلق صحافت سے تھا۔ ایک غالباً نیوز میں لکھتی تھیں اور دوسری فرائی ڈے ٹائمز میں، دو تین ابھی اسٹوڈنٹ تھے۔ اس وقت غیر معروف شخصیت لیکن آج کے ہر دل عزیز شاعر، اینکر اور کالم نگار وصی شاہ بھی اس ٹیم کا حصہ تھے۔ میری ملاقات ان سے کراچی کے پی سی ہوٹل میں ہوئی اور پھر یہ ملاقات اور جاپان کا سفر عمر بھر کی دوستی میں بدل گیا۔ اس وقت کے جاپان کے کلچرا تاشی محترم ایسو مورا نے ہم سب سے کراچی میں ملاقات کی اور اس سفر اور پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ خوبصورت اردو تلفظ جاپانی لہجے کے ساتھ، لمبا قد اور مسکراتا چہرہ ہم سب پر گہرا نقش چھوڑ گیا۔

ہم سب تھائی ایئرویز کے ذریعے ٹوکیو کے اکٹھے پہنچے۔ وہاں دنیا بھر سے ہماری طرح کے وفود آئے ہوئے تھے۔ مختلف ممالک کے نوجوانوں کے ساتھ وقت گزارنے اور تبادلہ خیال کا موقع میسر آیا اور پہلی بار ہندوستان کے نوجوان لڑکوں، لڑکیوں سے ملاقات ہوئی۔ ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چند کلومیٹر دور رہنے والے ہمسایوں کے خیالات، ہزاروں میل دور تیسرے ملک میں جاننے کا موقع ملا۔ زبان کی یکسانیت اور پڑوسی ہونے کے احساس نے ہمیں بہت جلد قریب کر دیا حتیٰ کہ ہمارے میزبان جاپانیوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ملکی سطح پر دشمنی اور انفرادی سطح پر دوستی اور کشش متضاد احساسات کو یکجا کیے ہوئے تھی۔

میرے اور وصی کے لیے باعث حیرت یہ تھا کہ ہندوستان سے آئی ہوئی لڑکیاں اپنے لباس اور کھانے پینے کے معاملہ میں بہت محتاط تھیں جب کہ ہمارے وفد کی لڑکیاں تو ٹوکیو پہنچتے ہی کسی مغربی ملک کی نمائندگی کرتی نظر آتی تھیں۔ نہ حلال و حرام کی تمیز، لباس بھی اسکرٹ اور جینز جب کہ ہم نے تو اپنے پاکستان کی نمائندگی کرنی تھی۔ خیر اس دورے کے دوران ہمیں جاپانی ثقافت، صنعتوں کی ترقی اور ایگری کلچر میں انقلاب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ کس طرح زلزلے اور ایٹم بم کی تباہ کاریوں کے بعد ہیروشیما، ناگاساکی اور کوبے کو ازسرِنو تعمیر کیا گیا۔ کس طرح لوگوں کو ان آفات اور مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی تربیت دی گئی۔ ہمیں نیشنل ڈیزاسٹر سینٹر میں جدید طریقوں سے زلزلے اور آگ کی تباہ کاریوں سے نمٹنے کی ایک دن کی ٹریننگ بھی دی گئی۔ کاواساکی شہر میں ایک ہفتہ ایک جاپانی فیملی کے ساتھ ان کے گھر میں رہنے کا موقع ملا۔ میرے میزبانوں کو انگریزی اتنی ہی آتی تھی جتنی مجھے جاپانی لیکن جس محبت سے انھوں نے میرا خیال رکھا اور میزبانی کا حق ادا کیا، اس نے لکڑی کے چھوٹے سے گھر میں دل کی کشادگی اور شاندار جاپانی ثقافت کا گہرا نقش مجھ پر چھوڑا۔ اس ماہ ہم آپ کی پاکستان میں 18 سال سے مقیم سینئر جاپانی سفارت کار محترم ایسو مورا سے ملاقات کرا رہے ہیں اور جاپانی ثقافت کے مختلف رنگوں کی جھلکیاں پیش کر رہے ہیں۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئیں گی۔

اس ماہ کے لیے میرا انتخاب

1۔ سینئر جاپانی سفارت کار توشی کاشی ایسو مورا سے ملاقات
2۔ پاپائے روم کا قبل از وقت انتخاب
3۔ ڈاکٹر شرمیلا چندر بوس کے بڑے حقائق
4۔ ساحلی شہر کا غم

طیب اعجاز قریشی
tayyab.aijaz@urdu-digest.com

پڑھیے، پڑھائیے، سُنیے اور لطف اُٹھائیے

کوّر سٹوری

دو پھلوں کی ناراضی کا ماجرا
118

پرانے پوپ کو کیا لے ڈوبا؟
خفیہ حقائق افشا کرتی رپورٹ
145

جاپانی اپنا حدف نہیں بھولتے
جاپانی مزاج اور ثقافت کا احاطہ کرتی دلچسپ تحریر
56

مئی 2013ء

فہرست

کہانیوں سے بڑے حقائق

آزادی ہند کے بھارتی راہنما سبھاس چندر بوس کی پوتی ڈاکٹر شرمیلا چندر بوس کی تہلکہ خیز تحقیق جس نے تجزیہ نگاروں کو ہلا کر رکھ دیا۔

87

مستقبل کے پیامبر

77

2040ء تک ایسی نینو مشینیں ایجاد ہو چکی ہوں گی جن کی مدد سے انسان اپنی عمر 50 برس تک بڑھا سکے گا۔

صحت

ورزش کے سات سچ

جو دراصل غلط ہیں

97

کیل مہاسے نکلنے کی 10 وجوہات

ان بنیادی وجوہات کا ذکر جو لڑکے اور لڑکیوں کی زندگی مشکل بنا دیتی ہیں۔

100

اردو ادب

آرسی

عقیدت اور رفاقت کی ہمیشہ ایک قیمت ادا کرنا پڑتی ہے

161

بلاوا

اس نے اپنی ساری زندگی کی کمائی اپنے ہی ہاتھوں سے لٹا دی تھی۔

248

سیلف ہیلپ

توہمات کا شکار بیچارہ انسان

ایسی سچائی جسے جانتے ہوئے بھی یقین نہیں آتا

137

مزا ہی نہیں ناقابل یقین مزا

زندگی کو خوشگوار طریقے سے گزاریئے

81

تحقیق

انتھک مسافر

ایک سائنسی کھوجی کی حیرت انگیز کہانی، اسے کسی اپنے جیسے وجود کی تلاش تھی

139

اولمپک

انعام یافتہ باکسر

آپنے ہاتھوں اپنا سنہرا مستقبل تاریک کرنے والوں کے لیے خاص

150

مسلمانوں اور مصریوں کے ساتھ 14 دن

غزہ میں پہلا قدم

تاریخی سفر نامہ

کیا خوش کن، خوشگوار اور خوبصورت لمحہ تھا

225

فہرست مئی 2013ء

اداریہ

15 کچھ اپنی زبان میں ——— الطاف حسن قریشی

16 ہم کہاں کھڑے ہیں ——— الطاف حسن قریشی

اسلامی زندگی کی کہکشاں

33 تختہ دار کا جواں مرد ——— خالد محمد خالد
ایک شیریں رو، پاکیزہ نفس، پختہ ایمان اور شاداب ضمیر کا تذکرہ

39 ماں اور قانون دوراہے پر ——— عبدالمالک مجاہد
ایک بوڑھے بیٹے کا حیران کن مقدمہ

42 پیشین گوئی جو پوری ہوئی ——— رضوان علی شاہ
شاندار بحری جہاز پر سب بادشاہوں کی طرح براجمان تھے

شکاریات

113 آدم خور بھالو ——— صبا شفیق
8 شکاریوں کی ٹیم کو ایک مکار درندے سے واسطہ پڑا تھا

طنز و مزاح

124 عجب ہے یہ شہر شور و غوغا ——— احمد حاطب صدیقی
غضب خدا کا یہاں تو ہر وقت بس باجا ہی بجتا رہتا ہے

تحقیق و جستجو

65 بیٹے نے گوگل سے ماں کو ڈھونڈ نکالا ——— شیر عالم محمود
بھوک اور نقاہت اُسے اپنوں سے دور لے گئی

91 مفادات کی جنگ ——— ایرک وٹی کوف
سرخ سیارے پہ پائی جانے والی زندگی کا ماجرا

130 واخان ——— سعید انصاری
جہاں کاغذی کرنسی کا گزر نہیں

152 آپ کی قسمت، مقدر اور منزل ——— شکیل احمد
زندگی کو کامیاب کیسے بنایا جائے؟

فیچرز

154 خبر بنانے والی کبھی خود بھی خبر بنتی ہیں ——— حنا انور
ملک کے موثر و موقر اخبارات کی لیڈی ایڈیٹرز سے گفتگو

105 گلاب ——— سخی رشید اعوان
ایک پھول کا تذکرہ جس کی پنکھڑیاں سوکھ کر بھی خوشبو دیتی ہیں۔

اُردو ادب

177 مورکھا ——— نجمہ ثاقب
ایک اتھرے بھائی کا ماجرا، اسے معاملہ فہم بنانے کی بہت جلدی تھی

182 انسان کی موت ——— فکر تونسوی
کچھ لوگ زندگی گزارتے ہیں مگر کچھ لوگوں کو خود زندگی گزارتی ہے

190 آخری جلسہ ——— ستار طاہر
ایک بوڑھے شخص کی پُرتاثر کہانی

193 بہار ——— ذکیہ علی بیگ
کیا بہار کی زندگی میں بھی بہار آئے گی

200 ہوٹل کی رات ——— زیکفرٹ لینس
ایک باپ کی حیران کن پریشانی کا ماجرا

204 دوبوری اناج ——— آمنہ ابوالحسن
ایک ساہوکار کی عبرت اثر کہانی

210 سوانگ ——— سبین علی
اونچی ذات کی ایک بیوہ کے دُکھ کی کہانی

213 پچھتاوا ——— کیٹ شوپن
ایک بڑھیا کی سونی زندگی میں اچانک بہار آگئی تھی

217 خوبصورت انگلیاں ——— بیکر یلدز
ایک ہنرمند بیوی کا عبرت اثر ماجرا

243 خالی دامن ——— وقار الرحمن
زادِ راہ کے بغیر کوئی بھی سفر طے نہیں ہو پاتا

222 موموسے میلیے ——— گل جانہ شاہ
ہر خاص و عام کی پسندیدہ اداکارہ

باتیں نئی تحریریں نئی

241 ساحلی شہر کا غم ——— صفیہ کریم
ایک شہر نابینا سا کا تذکرہ جو روز اک نیا دُکھ عطا کرتا ہے۔

245 لفظوں کی حرمت ——— نورین قادر قریشی
تربیت کے لیے لفظوں کی حرمت کس قدر ضروری ہے

254 روشی شہر سارا کی سڑکیں ——— عمران ملک
شہریوں میں خوف و ہراس کی لہر

261 واہ! ماؤ ئیر صاحب ——— نور الحسن
دو روپے کے چنے دینا! چٹنی کے ساتھ

مستقل سلسلہ اور کالم

باتیں دانش کی (رفیدہ کلیم فاروقی) 47، اصل میں ڈائیٹ کیا ہے؟ (نوشین ناز) 257، ماہِ رواں کی شخصیات (محمد خلیل چودھری) 263، مشورہ حاضر ہے (صغیرہ بانو شیریں) 265، قصہ کوئز (غلام سجاد) 268، حوالہ میری پسند کا (نوید غازی) 270، تھینک یو جنید (وصی شاہ) 274، چمنِ خیال (خطوط) 279، در دل پہ دستک (اختر عباس) 284

مستقبل کے فیصلے

تحریک

طالبان پاکستان اور بلوچستان میں علیحدگی پسند گروپس انتخابی عمل کو سبوتاژ کرنے کے لیے سیاسی قائدین اور انتخابی کارکنوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں اور یوں خیبر پختون خواہ، کراچی اور بلوچ بیلٹ میں انتخابی سرگرمیاں جاری رکھنا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ پچھلے دنوں ایک علیحدگی پسند گروپ نے ہڑتال کی کال دی تو مکران میں کئی روز تک پورا کاروبارِ زندگی معطّل رہا۔ سرکاری دفاتر اور بینک بھی بند ہو گئے تھے۔ اب ایک عسکریت پسند تنظیم بلوچ نیشنل فرنٹ نے ۵ مئی سے ۱۱ مئی تک شٹر ڈاؤن ہڑتال کی اپیل کی ہے۔ اِسی دوران ایک قاتلانہ حملے میں نواز لیگ کے صوبائی صدر سردار ثناء اللہ زہری کا بھائی، بیٹا اور بھتیجا شہید ہوئے اور وہ خود بال بال بچے ہیں۔ تربت میں ڈاکٹر عبدالمالک جو نیشنل پارٹی کے صدر ہیں، اُن پر بھی حملہ ہوا ہے۔ جبکہ ایک دوسرے لیڈر اسد بلوچ بھی دہشت گردوں کی زد میں ہیں۔ کراچی اور حیدرآباد میں ایم کیو ایم کے اُمیدواروں اور کارکنوں کے خلاف پُرتشدد کارروائیاں جاری ہیں جبکہ پشاور اور ڈیرہ اسماعیل خاں میں انتخابی عمل شدید خطرات سے دوچار ہے۔ کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ملک دشمن اور جمہوریت کی مخالف قوتیں پاکستان کے عوام کو اندھیروں میں دھکیل دینا اور مستقبل کی شمعیں گل کر دینا چاہتی ہیں۔ اِس وقت اہم ترین سوال یہ ہے کہ آیا اٹھارہ کروڑ انسانوں کو چند ہزار انتہا پسندوں کی طغیانیوں کے آگے سر جھکا دینا چاہیے یا آئین اور جمہوریت کا علم بلند رکھنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینی چاہیے۔

چند روز پہلے ایک درجن صحافیوں، دانش وروں اور نوجوانوں پر مشتمل پاکستان کا وفد کوئٹہ گیا اور اُسے قدم قدم پر یہی محسوس ہوا کہ وہاں کی سیاسی جماعتیں، مشکل حالات میں کام کرنے والے جواں ہمت صحافی، سول انتظامیہ اور قومی سلامتی کے ادارے بروقت اور شفاف انتخابات کے بارے میں پوری طرح یکسو ہیں اور ہر نوع کے چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لیے فول پروف انتظامات کا ایک حصار تعمیر کر رہے ہیں۔ اِن اداروں کے سربراہوں اور نگران وزیرِاعلیٰ جناب نواب غوث بخش باروزئی سے مل کر بہت حوصلہ ملا کہ وہ جواں مردی اور اعلیٰ منصوبہ بندی سے دشمن کے ارادے خاک میں ملا دیں گے اور بلوچستان کے عوام اپنے مستقبل کی صورت گری اپنے ہاتھوں سے کریں گے۔ یہی قابلِ قدر جذبہ خیبر پختون خواہ میں بھی نظر آتا ہے۔ پنجاب کے نگران وزیرِاعلیٰ جناب نجم سیٹھی بھی اِسی

عزم کا اظہار کر رہے ہیں اور جناب صدر زرداری بارہا عوام کو یقین دلا چکے ہیں کہ انتخابات میں خلل ڈالنے کی ہر سازش ناکام بنا دی جائے گی۔ مگر ایم کیو ایم کے قائد جناب الطاف بھائی کا ردعمل کسی قدر مختلف ہے۔ وہ شروع ہی سے انتخابات میں التوا کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ حال ہی میں اُنہوں نے ایک ناخوشگوار واقعے پر اپنے تمام انتخابی دفاتر بند کرنے اور سوگ منانے کا اعلان کیا ہے اور یہ سوال اُٹھایا ہے کہ دہشت گردی کے دوران آزادانہ انتخابات کیسے منعقد ہو سکیں گے اور اُمیدوار کیونکر انتخابی مہم چلا پائیں گے۔

الطاف بھائی کا سوال بظاہر اپنے اندر بڑا وزن رکھتا ہے' لیکن ہم نے دیکھا کہ خوفناک جنگ و جدل کے زمانے میں افغانستان کے اندر تین بار انتخابات ہوئے جن کی بنیاد پر وہاں کے حالات میں کسی قدر تبدیلی بھی آئی اور غاصب فوجوں کے انخلا کے لیے امریکی صدر اوباما کو ایک ٹائم ٹیبل بھی دینا پڑا۔ افغانستان کے مقابلے میں پاکستان کے احوال یقینی طور پر بہت بہتر اور اُمید افزا ہیں اور عوام کے اندر انتخابات میں حصہ لینے کی بہت گہری اور انتہائی شدید تڑپ موجزن ہے۔ ریاست کی یہ آئینی ذمہ داری ہے کہ وہ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات میں شہریوں کا اپنا ووٹ استعمال کرنے کے محفوظ انتظامات بروئے کار لائے تاکہ منتخب حکومتیں کاروبارِ مملکت چلائیں اور قومی ادارے اپنے اپنے دائرے میں خوش اسلوبی سے کام کرتے رہیں۔ دستور میں اسمبلیوں کی مدت کا واضح تعین موجود ہے۔ اگر ایک بار اس میں تعطل پیدا ہو گیا' تو ہمارے مسائل جو پہلے ہی بہت اُلجھے ہوئے اور نہایت گھمبیر ہیں' اُن کی سنگینی میں ہولناک اضافہ ہو جائے گا اور بلوچستان میں جمہوریت سے وابستہ معتدل قوتوں اور بیرونی طاقتوں کی اشیر باد سے چلنے والی علیحدگی کی تحریکوں کے درمیان جو ایک جنگ جاری ہے' اس پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ اِس کے علاوہ انتخابات کی گاڑی اگر ایک بار آئین کی پٹڑی سے اُتر گئی اور دہشت گردوں کے حوصلے بڑھتے گئے' تو عوام کی قوتِ ارادی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا جبکہ ریاست کی قوت نافذہ بھی بُری طرح متاثر ہو گی۔

یہ غیر جمہوری عناصر کے سامنے کامل استقامت کے ساتھ ڈٹ جانے اور کامل بصیرت سے اپنے مستقبل کی قیادت کے انتخاب کا وقت ہے۔ یہ ہیبت سے سجدے میں گرنے کے بجائے پورے قد کے ساتھ قیام کرنے' اپنے اعصاب پر قابو رکھنے اور گروہی مفادات سے اوپر اُٹھنے کا وقت ہے۔ تسلیم کہ نگران حکومت، پاکستان الیکشن کمیشن اور قانون نافذ کرنے والے بعض ادارے اپنے فرائض ادا کرنے میں سہل انگار ثابت ہوئے ہیں' مگر آزاد اور اولوالعزم سیاسی کارکنوں' لیڈروں' صحافیوں' پولیس' ایف سی' لیویز اور فوج کے سپاہیوں اور افسروں کو سلامِ عقیدت پیش کرنا ضروری ہے جو اپنی جان کی پروا کیے بغیر دہشت گردوں اور علیحدگی پسندوں کے آگے عزم کی چٹان بنے ہوئے، وطنِ عزیز میں انتخابی عمل کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اُن کی عزیمت اور شجاعت سے ہمارے عوام مستقبل کے درست فیصلے کرنے میں یقیناً کامیاب ہوں گے۔ اِس نازک موڑ پر ایم کیو ایم کو حوصلے سے کام لینا اور انتخابی عمل میں وسیع تر مفادات کی خاطر شامل رہنا چاہیے اور اُنہیں تاریخ سے یہ سبق سیکھ لینا ہو گا کہ بائیکاٹ کے نتیجے میں مستقبل کا سفر کس قدر دشوار ہو جاتا ہے۔

الطاف حسن قریشی

مستحکم حکومت کے لیے دوررس حکمتِ عملی

انتخابات جس آب و ہوا میں منعقد ہوں گے' وہی حکومت سازی میں فیصلہ کن ثابت ہو گی۔ اِس آب و ہوا کو شفاف رکھنے میں سیاست دان' میڈیا' سول سوسائٹی یقیناً ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں جبکہ قومی سلامتی کے اداروں کو غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔

فیصلہ کن لمحات کا تجزیہ..... الطاف حسن قریشی کے قلم سے

پانچ برسوں میں پاکستان نے انتخابات کے حوالے سے بڑی فتوحات حاصل کی ہیں۔ عدلیہ اور میڈیا آزاد ہے اور ایک آزاد اور خودمختار الیکشن کمیشن وجود میں آ چکا ہے۔ آئینی اعتبار سے صدرِ مملکت کا نگران حکومتوں کی تشکیل میں اب کوئی کردار نہیں رہا۔ تمام قومی اور علاقائی سیاسی جماعتیں انتخابات میں حصہ لے رہی ہیں اور دہشت گردی کے خوں آشام واقعات کے باوجود عوام تک پہنچنے میں بڑی پُرجوش اور پُرعزم دکھائی دیتی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ فوجی قیادت شفاف اور پُرامن انتقالِ اقتدار کے بارے میں پوری طرح یکسو ہے اور جمہوری قوتوں کی پشت پر کھڑی ہے۔ عدالتِ عظمیٰ کی سرتوڑ کوشش بھی یہی ہے کہ انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہوتے دکھائی دیں اور بدعنوان لوگ اِس عمل سے خارج کر دیے جائیں اور سیاست دانوں کو پوری سیکورٹی فراہم کی جائے' مگر آج کی صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف پاکستانی طالبان اے این پی' ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کے سیاسی کارکنوں پر تابڑ توڑ حملے کر رہے ہیں' تو دوسری طرف بلوچستان میں علیحدگی پسند تنظیمیں جمہوریت اور آئین پر یقین رکھنے والے اور عوام کے ووٹ کی طاقت سے صوبے کی تقدیر بدلنے کے عزم سے سرشار سیاسی قائدین کو نشانہ بنا رہی ہیں۔ اِس ہیبت زدہ ماحول میں انتخابات کی گہما گہمی بہت کم ہے اور الطاف بھائی انتخابات میں چند ماہ کے التوا کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ایم کیو ایم کے انتخابی دفاتر پر حملوں میں نصف درجن کارکن لقمۂ اجل بن چکے ہیں اور اے این پی کے سیاسی کارکن بھی حملوں کی زد میں ہیں' مگر سیکورٹی فورسز کی طرف سے کوئی مؤثر

کارروائی دیکھنے میں نہیں آرہی جبکہ نگران حکومت بے عملی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

صاف محسوس ہوتا ہے کہ بیسویں آئینی ترمیم کے ذریعے نگران حکومت کا جو نظام رائج ہوا ہے' وہ بہت مصنوعی ہے۔ بعض مقامات پر سابق وزیروں کے کارندے وزیر اعلیٰ اور وزیر بن گئے ہیں۔ ہمارے نگران وزیر اعظم اسی طرز پر حکومت چلا رہے ہیں جس طرز پر فالج زدہ گورنر جنرل ملک غلام محمد چلایا کرتے تھے۔ ایک وزارت میں ایک ہفتے کے دوران چار سیکرٹری تبدیل کیے جا چکے ہیں اور سارا وقت قیل و قال میں صرف ہو رہا ہے اور انتخابات کے حوالے سے انتہائی حساس معاملات نظر انداز ہو رہے ہیں۔ سیکورٹی جو آج سب سے زیادہ اعصاب شکن مسئلہ ہے' اس کے بارے میں الیکشن کمیشن کی رائے یہ ہے کہ وفاقی اور صوبوں کی خفیہ ایجنسیوں میں رابطوں کا بڑا فقدان ہے۔ اب تک قوم کے سامنے ووٹروں اور اُمیدواروں کے تحفظ کا ایک مربوط پلان سامنے آ جانا چاہیے تھا' مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اسی طرح عوامی سطح پر بھی نوجوان رضا کاروں کی ایسی کوئی تحریک منظم نہیں ہو سکی جو انتخابات دشمن عناصر کا ڈٹ کر مقابلے کا پروگرام رکھتی ہو۔ جناب وزیر اعظم ہماری قومی زندگی کے ایک انتہائی اہم اور نازک موڑ پر قیادت فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں جس کے باعث کسی بھی وقت ایک خوفناک حادثے سے دوچار ہونے کے خطرات منڈلا رہے ہیں۔ سیاسی اور عسکری قیادت کو مشاورت سے ایک ایسی حکمتِ عملی وضع کرنی چاہیے تھی جس کے نتیجے میں دہشت گردوں کے حملے اور دھماکے تھم جاتے اور انتخابات کا ماحول روایتی رونقوں کے ساتھ وجود میں آجاتا۔ اعلیٰ حلقوں کی طرف سے یقین دہانیاں بہت کی جا رہی ہیں' مگر ایک غیر یقینی صورتِ حال اپنے ہیبت ناک پر پھیلائے ہوئے ہے۔

☆☆☆

انتخابی اکھاڑے میں ۱۸۰ کے لگ بھگ انتخابی نشانات کے ساتھ سیاسی جماعتیں اُتر چکی ہیں اور تقریباً گیارہ سو قومی اور صوبائی نشستوں میں ساڑھے سولہ ہزار اُمیدوار کھڑے ہیں۔ یہ جوش و خروش کئی اعتبار سے حوصلہ افزا اور جمہوریت سے پختہ وابستگی کا عکاس ہے' لیکن اس اژدہام سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ سیاسی جماعتیں بازیچۂ اطفال بنتی جا رہی ہیں۔ جمہوریت کی مضبوطی کا انحصار سیاسی جماعتوں کی مضبوطی پر ہے جبکہ ہمارے ہاں ''جگر لخت لخت'' کا یہ عالم ہے کہ پاکستان الیکشن کمیشن میں ۲۲۷ سیاسی جماعتیں رجسٹرڈ ہیں۔ اس کثرت نے سیاسی انتشار پھیلایا ہے اور اس کی روک تھام کی بنیادی ذمے داری الیکشن کمیشن پر عائد ہوتی ہے' تاہم آج سب سے بڑی ضرورت تمام سیاسی جماعتوں کو دہشت گردی اور علیحدگی پسندی کے خلاف ایک متحدہ محاذ تشکیل دینے اور ایم کیو ایم اور اے این پی پر ہونے والے حملوں کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کرنے کی ہے۔ اسی طرح سردار ثناء اللہ زہری' ڈاکٹر عبدالمالک اور اسد بلوچ پر ہونے والے حملوں کے خلاف بھی پورے ملک میں آواز اُٹھنی چاہیے

جس سے عسکریت پسندوں کے حوصلے پست ہوں گے اور عام بستیوں میں اُن کے لیے سر چھپانے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ مذہبی جماعتوں کو بھی اُن انسان دشمن عناصر کے خلاف متفقہ فتوے جاری کرنے چاہئیں جو بچوں' عورتوں اور بوڑھوں سے زندگی کی نعمت چھین لیتے ہیں اور مسجدوں اور امام بارگاہوں میں تباہی پھیلاتے ہیں اور اسلام اور پاکستان کا نام بدنام کرتے ہیں۔ اس اجتماعی طرزِ عمل سے انتخابی عمل پر اعتماد گہرا ہوتا جائے گا۔

۲۰۱۳ء کے انتخابات اس اعتبار سے قدرے منفرد ہیں کہ ان کے ساتھ عوام کی لامحدود توقعات وابستہ ہیں۔ دراصل پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت نے گزشتہ پانچ برسوں میں کرپشن' نااہلی' بدانتظامی اور اخلاقی پستی کا جو ریکارڈ قائم کیا ہے' اُس کے ردِعمل میں ایک صاف ستھری حکومت کی شدید خواہش نے جنم لیا۔ پھر اچانک شیخ الاسلام نمودار ہوئے اور دستور کے آرٹیکل ۶۲ اور ۶۳ کی مالا جپنے لگے۔ الیکشن کمیشن کی طرف سے یقین دلایا گیا کہ ہم نے ایف بی آر' اسٹیٹ بینک اور نادرا کے تعاون سے ایک ایسا میکانزم تیار کر لیا ہے جس کے ذریعے سات روز میں اُمیدواروں کے جملہ کوائف حاصل کر لیے جائیں گے' مگر عملاً ایسا نہ ہو سکا' تاہم سکروٹنی کے غیر منظم طریق کار نے بڑی افراتفری پھیلائی' سیاسی جماعتوں کو اپنے اُمیدواروں کے ناموں کا باقاعدہ اعلان کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوا اور اپریل کے تیسرے ہفتے تک انتخابی مہم شروع ہی نہ ہو سکی۔ اس غیر فطری خواہش نے ایک ایسا ماحول پیدا کیا جس میں انتخابی اُمیدوار عوام کی عدالت میں بہت بڑے مجرم قرار پائے۔ یہ تاثر پھیلایا گیا کہ سیاست دان اپنی کرتوتوں کے باعث بہت ناقابلِ اعتبار ہیں۔ اس پر سنجیدہ قومی حلقوں میں شدید اضطراب دیکھنے میں آیا اور وہ قوم کو سمجھانے لگے کہ سیاست دان خودرو جھاڑیوں کی طرح نہیں اُگتے' وہ تو تجربات کی بھٹی سے گزر کر قیادت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں اور اُنہی کے ذریعے قوم کی شیرازہ بندی ممکن ہے کہ وہی ملک چلاتے ہیں' اس لیے اُن کی اصلاح کی کوششوں کے ساتھ ساتھ اُن کی قدر و منزلت بھی ضروری ہے۔ دو چار مہینوں کی اس ہنگامہ آرائی کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ سیاسی جماعتوں نے اپنے اُمیدواروں کا اعلان کرنے سے پہلے کئی سطح پر فلٹر لگا دیے اور یوں ایک حد تک صاف ستھری قیادت کے امکان پیدا ہو چلے ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ بہتر ہوتے چلے جائیں گے۔

☆☆☆

اچھی حکمرانی کی طرف تصوراتی پیش رفت کے پہلو بہ پہلو ہمیں ایک مستحکم حکومت کے قیام پر بھی توجہ دینا ہو گی۔ مستحکم حکومت کی تشکیل وہی سیاسی جماعت ہی کر سکتی ہے جسے قومی اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل ہو' تاہم ایک سے زائد جماعتیں بھی مل کر ایک مضبوط حکومت بنا سکتی ہیں۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب اُن کے مابین ایک واضح قومی ایجنڈے پر اتفاق پایا جاتا ہو۔ دراصل سیاسی جماعتوں میں شکست و ریخت کے باعث اب ایک بھی

سیاسی جماعت چاروں صوبوں میں یکساں مقبول نہیں رہی' کیونکہ فوجی اور سول آمریتوں نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے سیاسی جماعتوں کے حصے بخرے کرتے ہوئے قومی وحدت کے حوالے سے سنگین مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک وقت وہ تھا جب نیشنل عوامی پارٹی میں بلوچ اور پشتون شانہ بشانہ کام کرتے اور صوبہ سرحد اور بلوچستان میں وہ غالب سیاسی حیثیت کی مالک تھی۔ جناب بھٹو برسرِ اقتدار آئے' تو اُنہوں نے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے سردار عطاء اللہ مینگل کی حکومت برطرف کر دی۔ اِس توڑ پھوڑ کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج بلوچستان میں بلوچ اور پشتون ایک دوسرے کے مدِ مقابل کھڑے ہیں اور آنے والے انتخابات میں اے این پی زیادہ سے زیادہ شاید ایک نشست حاصل کر سکے گی۔ جنرل پرویز مشرف کے دورِ آمریت میں نون لیگ بھی ایک ایسی ہی کڑی آزمائش سے گزری ہے۔ رینجرز اور انٹیلی جنس کے افسروں نے جابرانہ حربوں سے قاف لیگ کا صنم تراشا اور اُس کے پجاریوں پر انعام واکرام کی بارش ہونے لگی' مگر اُنہوں نے جونہی فوجی وردی اُتاری' اس جماعت کو زوال نے آلیا۔ جناب نواز شریف کی بے مثل قیادت' متانت اور استقامت کی بدولت پاکستان کی خالق مسلم لیگ کو نشاۃِ ثانیہ حاصل ہوئی ہے اور بیشتر انتخابی سروے اُس کی مقبولیت کی گواہی دے رہے ہیں۔

پنجاب میں وزیرِ اعلیٰ جناب شہباز شریف نے حیرت انگیز ترقیاتی کام کیے جن سے روزگار کے مواقع پیدا ہوئے اور عوام کو بہتر بنیادی سہولتیں میسر آئیں۔ جنوبی پنجاب کے علاقے سیلاب کی زد میں آئے' تو وہ دیوانہ وار ایک ایک علاقے میں پہنچے' حفاظتی پشتوں اور مکانات کی تعمیر کی خود نگرانی کرتے رہے۔ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں امن عامہ کی صورتِ حال بھی تسلی بخش رہی۔ اُنہوں نے جنگی بنیاد پر جس طرح ڈینگی پر قابو پایا' اُسے ترقی یافتہ دنیا ایک معجزہ قرار دیتی ہے۔ نوجوانوں میں لیپ ٹاپ کی تقسیم سے اُن کی تخلیقی سوچ میں ایک انقلاب آیا ہے اور صلاحیتوں کو ٹھیک طور پر بروئے کار لانے کا ایک ویژن اُبھرا ہے۔ لاہور خوبصورت پھولوں کے تختوں کے رنگ اور خوشبو سے مہک اُٹھا ہے۔ جناب نواز شریف بار بار بلوچستان اور سندھ گئے اور وہاں کے سیاست دانوں اور عوام سے ملتے رہے اور خیبر پختون خواہ میں بھی اپنے دیرینہ سیاسی رشتے مستحکم کرنے میں کامیاب رہے۔ سندھ میں نون لیگ دس جماعتی اتحاد کا حصہ ہے جس کی قیادت پیر پگاڑا کر رہے ہیں۔ بلوچستان کی قومیت پرست جماعتیں مسلم لیگ نون کی طرف مائل ہیں اور قومی دھارے کی سیاست کو ترجیح دے رہی ہیں۔ اِس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ این ایف سی ایوارڈ میں پنجاب نے اپنے حصے میں سے دس ارب روپے بلوچستان کو برادرانہ جذبے کے تحت دیے۔ اِس جماعت کے سربراہ نے سردار عطاء اللہ مینگل سے ملاقات اور سردار اختر مینگل کے ساتھ انتخابی معاہدے میں پہل کی ہے اور یوں قومی یک جہتی کو فروغ دیا ہے۔

☆☆☆

انتخابی نتائج کے متعلق صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ساڑھے تین کروڑ کے لگ بھگ نئی نسل کے ووٹ بنے ہیں۔ عمران خاں کہتے ہیں کہ یہ سارے ووٹ اُن کے ہیں اور وہ باری لینے والے حکمرانوں کے لیے سونامی ثابت ہوں گے' مگر آزاد تجزیوں کے مطابق یہ ووٹ مختلف جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے اور تحریکِ انصاف کو تیس پینتیس کے لگ بھگ نشستیں مل سکیں گی۔ انتخابات میں اَنہونے واقعات کی بڑی گنجائش ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ بہت بڑا سرپرائز دے ڈالے' تاہم اُسے حکومت سازی کے لیے دوسری پارلیمانی جماعتوں کی حمایت پر انحصار کرنا ہوگا' اِس لیے اُسے سیاسی مکالمے اور سمجھوتے کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا ہوگا' کیونکہ ہوشمندی اور عالی ظرفی سیاست کا اصل جوہر اور اُس کا قدرتی حسن ہے۔ سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق پیپلز پارٹی کو اندرون سندھ بھی شدید مخالفت کا سامنا ہے اور اُس کے لیے لاڑکانہ کی نشستیں جیت لینا بھی دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن کی جمعیت علمائے اسلام بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور اُسے شدید مزاحمت کا سامنا ہے۔ ایم کیو ایم دہشت گردی کے ہاتھوں نڈھال ہے۔ اِس طرح ایک مخلوط حکومت کی تصویر اُبھرتی ہے جس میں چھوٹی جماعتوں کا پارلیمانی کردار غیر معمولی اہمیت اختیار کر جائے گا' چنانچہ انتخابی مہم چلاتے وقت ہمارے سیاسی راہنماؤں کو خود فریبی میں غوطہ زن رہنے کے بجائے مستقبل کے امکانات پر بھی نظر رکھنا ہوگی۔

مستحکم حکومت کے لیے ووٹوں کے ٹرن آؤٹ کی شرح میں غیر معمولی اضافہ بہت ضروری ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ چند روز میں ایک بڑے اضافے کے امکانات کس قدر ہیں اور کس جماعت میں ووٹروں کے اندر ہمہ گیر تحریک پیدا کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اگر مسلم لیگ نون کی میڈیا مینجمنٹ جدید تقاضوں کا احاطہ کرتے ہوئے دلوں کو گرما دینے والے طور طریق اختیار کر سکے' تو شہروں میں ہزاروں نوجوان گلی گلی اور قریے قریے نکل آئیں گے اور شہریوں کے اندر ووٹ ڈالنے کا جذبہ اُبھار سکیں گے۔ اِس ضمن میں خطیب حضرات بھی انتہائی مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔ وہ جمعے کے خطبوں میں ووٹ کی شرعی حیثیت واضح کرنے کے ساتھ ساتھ یہ تلقین بھی کر سکتے ہیں کہ ووٹ کے ذریعے مشاورت میں شریک ہونا ایک دینی فریضہ ہے۔ یہی کام تحریکِ انصاف کے پُرجوش نوجوان بھی سرانجام دے رہے ہیں' کیونکہ گھر گھر کنوینسنگ کرنے سے ٹرن آؤٹ میں قابلِ ذکر اضافہ سیاسی عمل کو تقویت پہنچانے اور ایک مستحکم حکومت کی تشکیل میں یقینی طور پر معاون ثابت ہوگا۔ ہم دینی مدارس کے نوجوانوں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اِس دفعہ وہ بھی حیرت انگیز طور پر سرگرم نظر آتے ہیں اور مولانا فضل الرحمٰن نے مختلف شہروں میں جو عظیم الشان جلسے کیے ہیں' اُن میں انہی نوجوانوں کی شبانہ روز کاوشیں شامل ہیں۔ اِس ضمن میں ووٹروں کو پولنگ اسٹیشنوں تک لانا ایک بہت بڑا مسئلہ ہوگا۔ الیکشن کمیشن نے ٹرانسپورٹ

فراہم کرنے پر تو پابندی لگا دی ہے' مگر اُسے متبادل کے طور پر پبلک ٹرانسپورٹ فراہم کرنے کی منصوبہ بندی کرنا چاہیے تھی۔ اگر پابندیوں پر عمل درآمد ہوا' تو ووٹوں کے ٹرن آؤٹ پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ دہشت گردی کا خوف اُس کے علاوہ ہے جبکہ سیکورٹی انتظامات انتہائی ناقص اور حددرجہ ناکافی ہیں اور ٹکٹوں کی تقسیم پر مسلم لیگ نون اور تحریکِ انصاف کے اندر ایک داخلی ہیجان پایا جاتا ہے' تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جناب عمران خاں اِس بھنور سے باہر نکل آئے ہیں اور اُن کے اُمیدوار بڑی بے جگری سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

☆☆☆

ایک اچھی اور مضبوط حکومت کی فضا بنانے میں ہمارا میڈیا زبردست کردار ادا کرسکتا ہے جو بے لاگ تجزیوں کے ذریعے اِس امر کا تعین کرسکتا ہے کہ کس جماعت کو ایک اہل اور دیانت دار ٹیم دستیاب ہے اور اُس کا ایجنڈا کتنا قابلِ عمل اور بنیادی مسائل کا حقیقی ادراک رکھتا ہے۔ اِن تحقیقاتی رپورٹوں کی روشنی میں ملک گیر سطح پر ووٹر اُسی باصلاحیت پارٹی کی طرف رجوع کریں گے اور یوں ایک مستحکم حکومت کا راستہ ہموار ہو جائے گا۔ تحریکِ انصاف کے ۸۰ فی صد اُمیدوار پارلیمانی امور سے ناواقف ہیں اور ۳۰ فی صد کے لگ بھگ وہ نوجوان ہیں جو پہلی بار انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں۔ وہ یقیناً ہنرمند بھی ہوں گے اور مختلف شعبوں کے ماہر بھی' البتہ اُنہیں سیاسی اپروچ اختیار کرنے میں خاصا وقت لگے گا۔ میڈیا کو اُن کی صلاحیتوں کا سراغ لگا کر عوام کی صحیح راہنمائی کرنی چاہیے۔ دیانت دار اور قابل افراد کو قومی ریڈار پر لانے ہی سے حقیقی تبدیلی آسکے گی۔ سوشل میڈیا بھی انتہائی کم وقت میں قوم کو راہنمائی فراہم کرسکتا ہے۔ اِس کام کے لیے غیر جانب داری اور دیانت داری پہلی شرط ہے۔ آج تو اُسے مختلف سیاسی جماعتیں اپنے مقاصد کے لیے نہایت شاطرانہ انداز سے استعمال کر رہی ہیں اور کردار کشی کا گھناؤنا کاروبار جاری ہے۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک قابلِ اعتماد نیٹ ورک وجود میں آئے جو سیاسی جماعتوں کا ماضی اور حال ضروری تفصیلات کے ساتھ پیش کرتا رہے' کیونکہ انتخابات کے بعد بھی بہت سارے نازک مرحلے آئیں گے جو آگاہی اور بیداری کی حالت ہی میں سر کیے جاسکیں گے۔

انتخابات ملک میں استحکام پیدا کرنے اور اُسے کمزور کردینے کا باعث بن سکتے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پاکستان سیاسی طور پر دولخت ہوگیا تھا جبکہ یقینِ واثق ہے کہ ۲۰۱۳ء کے انتخابات بلوچستان کو قومی دھارے میں لانے کی نوید سنائیں گے۔ ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں جماعت اسلامی اور تحریکِ انصاف کے علاوہ بلوچستان کی تمام قومیت پرست جماعتوں نے بائیکاٹ کیا تھا جس کے نتیجے میں ایک مصنوعی حکومت قائم ہوگئی تھی اور سردار اختر مینگل جلاوطنی اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ نواب اکبر بگٹی کی شہادت نے بلوچ نوجوانوں میں باغیانہ جذبات اُبھارے جو ریاست کی رِٹ کو چیلنج کرنے کے لیے پہاڑوں پر چلے گئے ہیں۔ جاوید مینگل' حربیار مری

اور ڈاکٹر نذر نے علیحدگی کی تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں اور بلوچستان میں بدترین حکمرانی کے باعث انتظامی مشینری اپنی افادیت کھو بیٹھی تھی اور یوں محسوس ہوا جیسے بلوچستان سیاسی تنہائی کا شکار ہے۔ دراصل سیاسی تنہائی ہی سے مہیب خطرات جنم لیتے ہیں اور بیرونی طاقتیں فائدہ اُٹھاتی ہیں' چنانچہ پاکستان کے معروف تھنک ٹینک پائنا نے پنجاب یونیورسٹی کے تعاون سے دو روزہ بلوچستان کانفرنس کا اہتمام ۲۔۳ جنوری ۲۰۱۳ء کو لاہور میں کیا۔ اِس میں بلوچستان سے سبھی نامور سیاست دان' دانش ور اور صحافی شریک ہوئے۔ آزادانہ تبادلۂ خیال سے یہ طے پایا کہ بلوچستان کو وفاق کے پالیسی ساز اداروں میں بڑی مؤثر نمائندگی دی جائے اور صدر' وزیراعظم اور وفاقی وزراء کو اِس صوبے میں طویل قیام اور انفراسٹرکچر تعمیر کرنے پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ اِس کانفرنس میں بلوچ اور پشتون سیاست دانوں سے انتخابات میں حصہ لینے کی اپیل کی گئی اور یہ امر زیرِ بحث آیا کہ صوبائی خودمختاری اور قومی مالیاتی ایوارڈ میں مناسب حصہ مل جانے کے بعد بلوچستان کی حکومت کو اپنے مسائل خود حل کرنے کی روش اپنانی چاہیے کہ اب ترقی اور خوشحالی کی کلید اسلام آباد کے بجائے کوئٹے کے پاس ہے۔ لاہور کے دانش وروں' سیاسی تجزیہ نگاروں اور کانفرنس کے شرکاء نے بلوچستان کے قائدین کا والہانہ خیر مقدم کیا اور منصفانہ جدوجہد میں اپنی حمایت کا مکمل یقین دلایا۔

☆☆☆

کانفرنس میں سبی سے نواب غوث بخش باروزئی بھی تشریف لائے تھے۔ اُنہوں نے ورکنگ سیشن کی صدارت کی اور اپنی صاف گوئی اور پاکستان کے ساتھ غیر متزلزل وابستگی سے حاضرین کو بہت متاثر کیا۔ قومی سطح پر اُن کی شخصیت اُجاگر ہوئی اور اُن کے خیالات اعلیٰ حلقوں میں دلچسپی کے ساتھ سنے گئے۔ بلوچستان کی اسمبلی تحلیل ہوئی' تو تمام جماعتوں نے اتفاقِ رائے سے اُنہیں نگران وزیراعلیٰ نامزد کیا۔ وقت ضائع کیے بغیر وہ تمام سیاسی قائدین سے تبادلۂ خیال کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور سردار اختر مینگل کو بھی انتخابات میں حصہ لینے پر آمادہ کرنے میں کامیاب رہے۔ دریں اثنا آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی کوئٹہ پہنچے' گورنر اور وزیراعلیٰ سے ملے اور بروقت اور پُرامن انتخابات کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا۔ اُنہوں نے تمام قوم پرست سیاسی جماعتوں کو شفاف انتخابات اور پُرامن انتقالِ اقتدار کی ضمانت دی۔ اِس طرح بلوچستان کی سیاسی تنہائی ختم ہوگئی جو پاکستان کی سالمیت کے حوالے سے ایک بہت بڑے مژدے سے کسی طرح کم نہیں۔ نواب صاحب نے پائنا کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے مجھے صحافیوں اور دانش وروں کے وفد کے ساتھ کوئٹہ آنے اور حالات کے چشم دید مشاہدے کی دعوت دی۔ میری درخواست پر جناب مجیب الرحمٰن شامی' جناب سجاد میر' جناب قیوم نظامی' جناب رؤف طاہر' پروفیسر ڈاکٹر مغیث الدین شیخ' جناب محمد طاہر' جناب سلمان عابد اور جناب حبیب اکرم بخوشی تیار ہوگئے۔ دو

روزہ بلوچستان کانفرنس کے مہمانوں کی نگہداشت میں عزیزم کامران الطاف' عزیزی حسن صدیقی اور عزیزی افنان کامران نے شب و روز کام کیا تھا اور پائنا کے نیشنل ڈائریکٹر جناب رحمت علی مجاہد جو بلوچستان میں صوبائی الیکشن کمشنر کے طور پر کام کر چکے ہیں' وہ بھی اِس وفد کا حصہ بنے۔

ہم شاہین ائیر لائنز سے وقتِ مقررہ پر چار بجے شام کوئٹہ ائیر پورٹ پہنچے۔ ڈپٹی ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز جناب وحید ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ بریگیڈیئر عبدالرحیم بھی تشریف لائے تھے کہ اُن سے بلوچستان کانفرنس کے دوران رابطہ قائم ہوا تھا۔ ہم سیکورٹی کے بغیر سرینا ہوٹل پہنچے جہاں بلوچستان کے معروف صحافی جناب انور ساجدی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے اُنہیں وفد کے آنے کی پیشگی اطلاع دے دی تھی۔ اُن سے چند جملوں ہی کا تبادلہ ہو پایا تھا کہ پیغام آیا کہ ہوم سیکرٹری جناب اکبر درانی اپنے ساتھیوں سمیت انتخابات پر بریفنگ دینے کے لیے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے انور ساجدی صاحب سے معذرت کرنا پڑی اور ہم سب گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ ہاؤس پہنچ گئے۔ وہاں سیکرٹری اطلاعات' سیکرٹری خزانہ اور صوبائی الیکشن کمشنر بھی موجود تھے۔ بریفنگ اس قدر معلومات افزا' حقیقت پسندانہ اور چشم کشا تھی کہ ہم اُس کے سحر میں کھو گئے۔ اُنہوں نے ہر بات کھول کر بیان کی اور حالات کی سنگینی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ چیلنج سے نمٹنے کے لیے فول پروف سیکورٹی نظام کی تفصیلات بیان کیں۔ بریفنگ میں بتایا کہ پشتون علاقے پُرامن ہیں جبکہ جنوب میں بڑی گڑبڑ ہے جس کی روک تھام کے لیے ہم نے لیویز' ایف سی اور فوج کے ساتھ مشاورت سے ایک سیکورٹی پلان تیار کیا ہے اور کوئیک ریسپانس فورس تشکیل دی ہے جو انتہائی کم وقت میں انتہائی مشکل مقام تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ بلوچستان میں قبائل کی شاخیں ڈیڑھ سو سے زائد ہیں اور اُن میں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں' زیادہ تر بلوچ بیلٹ ہی میں حالات دگرگوں ہیں اور ہم اُن پر قابو پانے کا پختہ عزم کیے ہوئے ہیں۔ ہوم سیکرٹری نے انکشاف کیا کہ انتخابی فہرستوں کی جانچ پڑتال کے نتیجے میں دس لاکھ ووٹر کم ہو گئے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ خطرات کے باوجود ٹرن آؤٹ پہلے سے کہیں زیادہ ہو گا' کیونکہ تمام سیاسی جماعتیں انتخابی عمل میں پوری یک سوئی اور جواں ہمتی سے شریک ہیں۔ ڈھائی گھنٹے کی بحث و تمحیص کے بعد جب ہم وہاں سے اُٹھے' تو اِس یقین سے سرشار تھے کہ سول ادارے اپنی ذمے داریوں سے پوری طرح آگاہ اور اپنے فرائض ادا کرنے پر کمربستہ ہیں' اِس لیے انتخابات بروقت ہوں گے اور شفاف بھی کیونکہ صوبائی الیکشن کمشنر بہت صاحبِ نظر اور بڑے تجربے کار ہیں اور پوری سول انتظامیہ اور قومی سلامتی کے ادارے اُن کی پشت پر کھڑے ہیں۔

☆☆☆

اِسی رات ہمیں جناب انوار الحق کاکڑ نے کوئٹہ کلب میں عشائیے کی دعوت دی۔ وہ دو روزہ بلوچستان

کانفرنس میں آئے تھے اور یہ پیغام دے گئے تھے کہ اگر مدینے کی طرز پر پاکستان میں معاشرہ قائم کر لیا جائے' تو ہمارے پیچیدہ اور گھمبیر مسائل بھی حل ہو سکتے ہیں اور قومی یک جہتی کا جذبہ رگ و پے میں سرایت کر سکتا ہے۔ اُنہوں نے عشائیے میں تقریباً سبھی جماعتوں کے قائدین کو دعوت دی تھی۔ وہاں عبدالخالق ہزارہ بھی تھے اور ڈاکٹر جہاں زیب جمال دینی بھی' جناب لیاقت شاہوانی بھی اور جناب عبدالقیوم کاکڑ اور جمعیت علمائے اسلام کے نمائندے بھی۔ اُنہوں نے انتخابات کے بارے بعض خدشات کا اظہار کیا کہ دہشت گردی کے واقعات سے حالات قابو سے باہر ہو سکتے ہیں' مگر اُنہیں پوری اُمید تھی کہ سیاسی جماعتیں انتخابی عمل کو سبوتاژ نہیں ہونے دیں گی اور ہر قیمت پر عوام کا مینڈیٹ حاصل کرنے کے لیے سخت جدوجہد کریں گی۔ اُنہوں نے بتایا کہ فوج اس معاملے میں پوری طرح سنجیدہ اور پُرعزم ہے اور وہ کسی مداخلت کے بغیر انتخابات کا پُل صراط عبور کرنے میں ہر ممکن مدد فراہم کرنے کا یقین دلا چکی ہے۔ عبدالخالق ہزارہ لاہور سے آئے ہوئے صحافیوں کو اپنے زخم دکھاتے اور اِس امر کی شکایت کرتے رہے کہ الیکٹرانک میڈیا میں بلوچستان کے مسائل شاذونادر ہی زیرِ بحث آتے ہیں اور ہمیں یوں لگتا ہے کہ ہم اپنے ہی ملک میں تنہا ہیں۔ حاضرین نے اُنہیں یاد دلایا کہ جب اُن پر قیامت ٹوٹی تھی' تو پورے ملک نے احتجاج میں حصہ لیا اور زخموں پر مرہم رکھا تھا۔

دوسرے روز ہمیں ایف سی کے آئی جی میجر جنرل عبیداللہ خاں سے بریفنگ لینا تھی جنہیں اچانک راولپنڈی جانا پڑ گیا تھا۔ وہ ائیر پورٹ سے سیدھے ہمارے پاس آئے۔ اُن کے حیرت انگیز انکشافات نے ایف سی کے بارے میں ہمارے تصورات میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔ اُنہوں نے بتایا کہ وہ سپریم کورٹ میں ۱۷ بار پیش ہو چکے ہیں اور اُنہوں نے فاضل چیف جسٹس کے چیمبر میں زمینی حقائق پوری دیانت داری سے بیان کیے تھے۔ اُن کی بریفنگ کے مطابق ایف سی کا بنیادی مقصد افغانستان اور ایران سے ملحقہ علاقوں کی نگرانی کرنا اور اِن علاقوں میں مقامی انتظامیہ کو اپنے فرائض کی بجا آوری میں تعاون اور مدد پہنچانا اور مقامی قبائل کے جوانوں کو فرنٹیئر کور میں بھرتی کر کے مقامی طور پر امن بحال رکھنا ہے۔ اُنہوں نے تفصیل سے بیان کیا کہ اُن کے نوجوان جانوں کی پرواہ کیے بغیر امن و امان کے قیام میں صوبائی حکومت کی مدد' قومی اثاثوں' ترقیاتی منصوبوں اور اہم تنصیبات کی حفاظت کر رہے ہیں اور اُن کے ۲۳ اسکول اور کالج بلوچستان میں تیرہ ہزار بچوں کو تعلیم دے رہے ہیں جن میں جشنِ آزادی کی تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اُن سے پوچھا گیا کہ آپ کی اِن عظیم الشان فتوحات کا احوال لوگوں تک کیوں نہیں پہنچ رہا' تو اُنہوں نے جواب دیا کہ ماضی میں اعتماد کا بحران تھا جس پر قابو پانے کی سنجیدہ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اُنہوں نے جس قومی اور انسانی جذبے سے بلوچستان کی صورتِ حال کی تصویر کشی کی' اُس کی تفصیلات کسی اور موقع پر بیان کی جا سکیں گی' تاہم ہمیں بھرپور احساس ہوا کہ بلوچستان محفوظ

ہاتھوں میں ہے اور سیکورٹی اداروں کا مائنڈ سیٹ بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔

☆☆☆

ہمیں سدرن کمان کے اعلیٰ افسروں نے فوجی سرگرمیوں کے بارے میں ایک فکر انگیز بریفنگ دی اور کھانے پر میجر جنرل مظہر سلیم، میجر جنرل نصیر اور میجر جنرل عامر کے ساتھ نہایت فکر انگیز گفتگو ہوئی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ بلوچستان میں کوئی فوجی آپریشن اب نہیں ہو رہا اور فوج کی اِس وقت پوری توجہ بلوچستان کو تعلیمی، اقتصادی اور سماجی طور پر اِس قدر ترقی دینا ہے کہ وہ دوسرے صوبوں کے برابر آ جائے۔ اِس ضمن میں جنرل اشفاق پرویز کیانی کا ویژن بہت واضح ہے اور وہ بلوچستان کی خوشحالی کو پاکستان کے مستقبل کے لیے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ اِن اعلیٰ فوجی افسروں کی جس بات نے ہمیں سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ سیاست دانوں کے بارے میں اُن کی خوشگوار سوچ تھی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سیاسی زعماء کا احترام اِس لیے ضروری ہے کہ وہ ہمیں قیادت فراہم کرتے اور ملک کے مختلف حصوں کو متحد رکھتے ہیں۔ اُنہیں پرنٹ میڈیا سے شکایت تھی کہ وہ دہشت گردی کے واقعات کو بار بار دہرا کر عوام کو خوفزدہ کرتے رہتے اور پاکستان کے امیج پر عالمی برادری کو نکتہ چینی کا موقع دیتے ہیں۔ اُنہوں نے فوج کی تحویل میں تعلیمی، صنعتی اور انفراسٹرکچر کے منصوبوں پر پریزینٹیشن دی، تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اِس یقین کو بڑی تقویت پہنچی کہ بلوچستان تیزی سے آگے کی طرف بڑھ رہا ہے اور اگلے آٹھ دس برسوں میں وہ نوجوان زمامِ حکومت سنبھالیں گے جو کیڈٹ کالجوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

اِسی شام ہمیں کوئٹہ پریس کلب کے صدر کی دعوت پر صحافیوں کی بڑی تعداد سے ملنے کا موقع ملا۔ اُنہوں نے بتایا کہ گزشتہ پانچ سات برسوں میں ۳۴ صحافی اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر چکے تھے اور اُن کے لواحقین کو صوبائی حکومت کی طرف سے کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا گیا نہ ہماری حفاظت کا کوئی قابلِ اعتماد نظام کام کر رہا ہے۔ اُنہوں نے بتایا کہ بلوچستان کے صحافی بڑے ہی مشکل حالات میں اپنے فرائض بجا لا رہے ہیں۔ اُنہیں یہ بھی گلہ تھا کہ کراچی، لاہور اور اسلام آباد کے ٹی وی چینلز بلوچستان کی بہت کم کوریج کرتے ہیں جس سے بے تعلقی اور بیگانگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اُنہوں نے حال ہی میں ماشکیل میں آنے والے زلزلے کا حوالہ دیا جس کی تفصیلات بڑے چینلز پر بہت کم دکھائی گئیں اور صحافیوں کو اِس مقام تک پہنچنے میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم نے اُن سے گزارش کی کہ ہمیں قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے لیے ایک دوسرے کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھانا اور ایک دوسرے کا نقطۂ نظر خندہ پیشانی سے سننا اور سمجھنا چاہیے۔ پیشہ ور تنظیموں اور حکومتوں پر لازم آتا ہے کہ وہ صحافیوں، طالب علموں اور ادیبوں کے وفود کے تبادلوں کا پروگرام ترتیب دیں اور ایک دوسرے کے قریب آنے کے مواقع فراہم کریں۔ اِس طرح بدگمانیاں دور ہوں گی اور ایک ساتھ مل کر کام کرنے

کا جذبہ نشوونما پائے گا۔ ہمیں چھوٹی چھوٹی باتوں میں اُلجھنے کے بجائے بڑے مقاصد کے حصول پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ دو گھنٹے کی ملاقات کے بعد ہمارے ساتھیوں نے بازار کا رُخ کیا جس میں روایتی چہل پہل تھی۔ لوگ اِس بات پر بہت خوش دکھائی دیے کہ تمام سیاسی جماعتیں انتخابات میں حصہ لے رہی ہیں اور دہشت گردوں سے ذرا خوفزدہ نہیں، کیونکہ بڑے بڑے قبائل کے سردار انتخابات کے میدان میں اُتر چکے ہیں اور اُن کے علاقوں سے دہشت گرد فرار ہونے پر مجبور ہوتے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

نگران وزیرِ اعلیٰ جناب نواب غوث بخش باروزئی نے عشائیہ دیا اور نہایت گرم جوشی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ وہ لاہور میں ہونے والی دو روزہ کانفرنس سے بڑے متاثر تھے اور اِس خیال کا اظہار کر رہے تھے کہ ایسی کانفرنسیں وقفے وقفے سے مختلف مقامات پر منعقد کی جانی چاہئیں۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم بلوچستان کے مالک ہیں اور ہم اُسے سنوارنے اور نکھارنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھیں گے۔ ہمارا معاشرہ بڑی حد تک قبائلی ہے جس میں لڑائی جھگڑے زندگی کا معمول ہیں۔ تھوڑا بہت خون خرابہ انتخابات کے دنوں میں بھی ہو سکتا ہے، مگر ہم نے اِس کی پیشگی روک تھام کے لیے فول پروف بندوبست کیا ہے۔ فوج عوام کی طاقت ہے اور ہم اُسے عوام کے تحفظ کے لیے ضرورت کے وقت بلا تامل استعمال کریں گے۔ ایف سی امن و امان کے قیام میں زبردست کردار ادا کر رہی ہے اور اب پولیس بھی پہلے کے مقابلے میں بڑی چوکس ہے۔ لیویز کی تربیت کے بھی نہایت عمدہ انتظامات کیے گئے ہیں۔ ہمارا اصل سرمایہ ہماری سیاسی جماعتیں ہیں جن کے ساتھ میرے خوشگوار تعلقات ہیں۔ ابھی ماشکیل میں زلزلہ آیا تو رات ہی کو فوج نے امداد فراہم کی اور ایف سی کے آئی جی سب سے پہلے وہاں پہنچے اور اُنہوں نے فرض شناسی کا قابلِ رشک مظاہرہ کیا۔ ان شاء اللہ بلوچستان میں بروقت اور شفاف انتخابات ہوں گے اور ووٹروں کو تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ جناب مجیب الرحمٰن شامی نے شہید ہونے والے ۳۴ صحافیوں کا مسئلہ اُٹھایا تو چیف سیکرٹری جناب بابر یعقوب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور یقین دلایا کہ فہرست ملتے ہی اِس پر کارروائی کی جائے گی۔ ہم دیر تک نواب صاحب کی شگفتہ بیانی، حاضر دماغی اور فکری گہرائی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ لذیذ کھانوں کا لطف اِس کے سوا تھا۔ ہم اُن کے شکر گزار تھے کہ اُنہوں نے ہمیں اِس امر کا موقع فراہم کیا کہ ہم بلوچستان کو انتخابات کی لڑی سے منسلک ہونے کا حیات آفریں منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

ہم کوئٹہ وسوسوں اور اندیشوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے آئے تھے، مگر دو روز بعد واپس آئے تو ہمارے دل ایقان سے سرشار اور اُمیدوں کی مہک سے مشک بار تھے کہ بلوچستان قومی دھارے میں آتا جا رہا ہے اور انتخابات کے نتیجے میں قومی یک جہتی کو فروغ حاصل ہوگا اور وہ بتدریج پاکستانی معاشرے کے ساتھ سماجی اور اقتصادی طور پر پیوست ہوتا جائے گا۔

■■■

تختہ دار کا

جواں مرد

حضرت خُبَیبؓ بن عدی

ایک شیریں رو، پاکیزہ نفس، پختہ ایمان اور شاداب ضمیر کا تذکرہ
انہوں نے موت کو سامنے دیکھ کر ڈرنے سے انکار کر دیا

ارشاد الرحمٰن/خالد محمد خالد

اور اب.....

لوگو!..... اب اس بہادر کے لیے راستا چھوڑ دو!

آؤ..... ہر طرف اور ہر مقام سے آؤ!

آؤ..... ہلکے ہو یا بوجھل، چلے آؤ!

تیزی کے ساتھ آؤ مگر پورے ادب و احترام اور انکساری و تواضع کے ساتھ آؤ! اور ہمہ تن گوش ہو جاؤ کہ تم فدا کاری و جاں سپاری کا ایسا درس پڑھنے والے ہو جس کی کوئی نظیر نہیں۔

ان کے حسن و جمال کی خوبی یہ ہے کہ اپنے مثیل و نظیر سے ایک انفرادیت رکھتے ہیں۔ آپ فنِ فدا کاری و جاں بازی کے ایک نئے استاذ کا ذکر سننے والے ہو۔

ایسے استاذ..... کہ اگر آپ ان کی جائے شہادت کا تذکرہ سننے سے محروم رہ گئے تو آپ خیرِ کثیر و خیرِ عظیم سے محروم رہ جائیں گے۔

اے ہر قوم و ملک کے صاحبِ عقیدہ لوگو! ہماری طرف توجہ کرو۔

اے ہر وقت اور ہر جگہ بلندیوں سے عشق کرنے والو! ہماری طرف دیکھو۔

اے غرور و تکبّر سے بوجھل دماغو! تم بھی توجہ کرو۔

تم نے تو دیگر ادیان اور ایمان کے بارے میں برے تصورات قائم رکھے ہیں۔ تم اپنے دماغوں میں غرور و تکبّر رکھو، لیکن ہماری بات بھی سنو۔

آؤ..... اور دیکھو کہ اللہ کا دین..... اسلام کس طرح کے انسان تیار کرتا ہے۔

آؤ..... اور دیکھو کہ اس دین کے ماننے والے کے اندر کیسی عزت نفس، کیسی پختگی، کیسی ثابت قدمی، کیسی اطاعت شعاری اور کیسی فدا کاری اور کیسی وفاداری موجود ہے۔ اگر ہم اس بات کو ایک جملے میں بیان کرنا چاہیں تو کہیں گے کہ کیسی ماورائے عقل عظمت ہے جسے حق پر ایمان و یقین اپنے ماننے والے مخلصین پر پانی کی طرح بہاتا ہے۔

توجہ فرمائیے.....!

کیا آپ اس مصلوب نعش کو دیکھ رہے ہیں؟

اے بنی نوعِ انسان!..... آج ہمارے درس کا موضوع یہی ہے۔

ہاں..... یہی مصلوب جسد ہمارا موضوعِ درس ہے۔

یہی درس ہے اور یہی استاذ ہے۔

اس جلیل القدر اور عظیم المرتبت اسمِ گرامی کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے۔

اسے یاد بھی کر لو اور گنگناتے بھی رہو کیونکہ یہ ساری انسانیت کا شرف ہے، وہ انسانیت جو کسی اور دین و مذہب سے وابستہ ہو یا کسی بھی دَور کی، کسی بھی نسل سے تعلق رکھتی ہو۔

جی ہاں آبروئے ملت اور تحفظِ دین کی خاطر کٹ مرنے والوں کے لیے ابدی و دائمی درس ہے۔

حضرت خبیب بن عدیؓ مدینے کے اوس انصاریوں میں سے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ کی طرف ہجرت فرما گئے تو آپؐ متعدد بار دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے اور اللہ رب العالمین پر ایمان لے آئے۔

آپؓ شیریں رو، پاکیزہ نفس، پختہ ایمان اور شاداب ضمیر کے مالک تھے۔

جب غزوۂ بدر نے اپنے جھنڈے بلند کیے تو اس موقع پر حضرت خبیب بن عدیؓ ایک جرأت مند سپاہی اور پیش قدم جنگجو تھے۔ ابتدائے معرکہ میں وہ ان مشرکین کے حصار میں آ گئے جو ان کے راستے میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ حضرت خبیب بن عدیؓ نے انھیں اپنی تلوار کے زور پر بھگا ڈالا اور حارث بن عامر بن نوفل کو زندگی سے محروم کر دیا۔

اختتام جنگ کے بعد مشرکین کا شکست خوردہ بقیہ لشکر مکہ کی طرف لوٹا تو حارث کے بیٹوں نے اپنے باپ کے مقتل کو معلوم کیا اور اس مسلمان کا نام اچھی طرح ازبر کر لیا جس نے حارث کو میدانِ جنگ میں قتل کیا تھا یعنی خبیب بن عدیؓ کا نام ذہن نشین کر لیا۔

مسلمان اپنے دلوں میں ایک نئے معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے ارمان لے کر بدر سے مدینہ کی طرف لوٹے۔ حضرت خبیبؓ ایک عابد و زاہد آدمی تھے وہ صوفیوں جیسی طبیعت اور عابدوں جیسا شوق عبادت رکھتے تھے۔ وہ عشق سے لبریز روح کے ساتھ عبادت کی طرف مائل ہو گئے۔ رات کو قیام کرتے، دن کو روزہ رکھتے اور اللہ رب العالمین کی تحمید و تقدیس بیان کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتے۔

ایک روز رسول اللہ ﷺ نے چاہا کہ قریش کی خفیہ سرگرمیوں کا کھوج لگایا جائے اور نئی جنگ کے لیے ان کی حرکات و سکنات اور تیاری کے بارے میں آگاہی حاصل کی جائے۔ اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے اپنے صحابہ میں سے دس آدمیوں کا انتخاب کیا اور عاصمؓ بن ثابت کو ان کا امیر مقرر کیا۔ خبیب بن عدیؓ بھی ان میں شامل تھے۔

قافلہ اپنی منزل کی طرف چل پڑا یہاں تک کہ عسفان اور مکہ کے درمیان ایک جگہ پہنچ گیا۔ جس کی خبر ''ھذیل'' کے ایک محلے کو ہو گئی جسے ''بنولحیان'' کہا جاتا تھا۔ وہ فوراً اپنے سو ماہر تیراندازوں کے ساتھ ان کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے اور ان کا کھوج لگاتے ہوئے ان کے پیچھے چل پڑے۔

اگر بنولحیان کا ایک آدمی وہاں گری کھجور کی بعض گٹھلیاں نہ دیکھتا تو قریب تھا کہ وہ دس افراد کے اس قافلے کو نہ پا سکتے۔ ایک نے گٹھلی پکڑی اور اہل عرب

کی سی عجیب قیافہ شناسی کے انداز میں قیافہ لگایا۔ پھر اپنے ساتھیوں سے بآواز بلند یوں مخاطب ہوا:

''یہ تو یثرب کی گٹھلی ہے ہمیں ان گٹھلیوں کے نشانات پر چلتے جانا چاہیے یہاں تک کہ یہ ہمیں ان لوگوں تک پہنچا دیں۔''

بنولحیان زمین پر گری ہوئی ان گٹھلیوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے دور سے اپنا گمشدہ شکار دیکھ لیا۔

مسلمانوں کے امیر قافلہ حضرت عاصم بن ثابتؓ نے سوچا کہ وہ ہمیں بھگا ماریں گے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے ساتھیوں کو پہاڑ کے اوپر بلند چھوٹی پر چڑھ جانے کا حکم دیا۔ ادھر بنولحیان کے یہ تیر انداز پہاڑ کے قریب پہنچ گئے اور مسلمان دستے کو دامنِ کوہ میں گھیر لیا، ان کا محاصرہ سخت کر دیا اور پیش کش کی کہ تمھیں کچھ نہیں کہا جائے گا لہٰذا اپنا آپ ہمارے حوالے کر دو۔

دستے کے افراد نے اپنے امیر جناب عاصم بن ثابت انصاریؓ کی طرف مشاورتی نظروں سے دیکھا اور اس انتظار میں رہے کہ وہ انھیں کیا حکم دیتے ہیں۔ اتنے میں حضرت عاصمؓ نے فرمایا: ''جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ اللہ کی قسم میں تو کسی مشرک کی پناہ میں نہیں جاؤں گا۔ اے اللہ ہمارے بارے میں اپنے نبیؐ کو خبر دے دے۔''

ادھر بنولحیان کے تیر اندازوں نے ان پر تیر و نیزے پھینکنے شروع کر دیے۔ مسلمان دستے کے امیر حضرت عاصم بن ثابتؓ زخمی ہو گئے اور شہادت کے اعزاز سے سرخرو ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کے سات ساتھی بھی زخمی ہو کر جامِ شہادت نوش کر گئے۔ باقی بچ جانے والے تین آدمیوں سے کافروں نے کہا کہ اگر تم اپنا آپ ہمارے حوالے کر دو تو پختہ وعدہ ہے کہ تمھیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔

یہ تینوں آدمی پہاڑ سے نیچے اتر آئے۔ کفار کے تیر انداز اور نیزہ باز حضرت خبیبؓ اور حضرت زید بن دثنہؓ کے قریب ہوئے اور اپنے ازار بند کھول کر انھیں باندھ لیا۔

تیسرے مسلمان نے اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کرنا اطاعت امیر کی خلاف ورزی سمجھا اور عزم کر لیا کہ وہ بھی موت کو ویسے ہی قبول کرے گا جس طرح عاصمؓ اور ان کے ساتھیوں نے قبول کیا ہے۔ پھر یہ صاحب بھی اپنی آرزو کے مطابق رتبۂ شہادت پر فائز ہو گئے اور اس طرح ایمان کے اعتبار سے عظیم ترین اور عہد کے اعتبار سے مضبوط ترین یہ آدمی آٹھ کی تعداد کو پہنچ گئے۔ جنھوں نے اللہ و رسول ﷺ سے کیے ہوئے عہد کو زندگی کے آخری سانس تک نبھایا۔

حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ نے اپنے بندھن کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اس قدر مضبوط تھے کہ یہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر سرکش و جابر تیر انداز ان دونوں اصحاب کو لے کر مکہ چلے گئے جہاں انھیں مشرکین کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔

شہر میں ہونے والی نیلامی میں ''خبیبؓ'' نام پکارا گیا تو مقتولِ بدر حارث بن عامر کے بیٹوں کا ماتھا ٹھنکا۔ انھوں نے ذہن پر دباؤ ڈال کر اس نام کو پرکھا تو ان کے دلوں میں حسد و بغض کی آگ بھڑک اٹھی۔ وہ فوراً اس نام کے شخص کو خریدنے کے لیے بھاگے۔ ان کی اس انتقامی دوڑ میں مکہ کے وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جو میدان بدر میں اپنے باپوں اور سرداروں کو قتل کروا چکے تھے۔

بالآخر یہ سب ان پر پل پڑے اور انھیں اس مقام کی طرف لے جانے لگے جہاں جا کر وہ ان کے، بلکہ تمام مسلمانوں کے خلاف اپنے حسد کی آگ ٹھنڈی کرنا چاہتے تھے۔

کچھ لوگوں نے اپنے ہاتھ میں حضرت خبیبؓ کے ساتھ زید بن دثنہؓ پر ڈالے اور ان کو بھی تشدد سے دو چار کرنے کے لیے لے جانے لگے۔

حضرت خبیبؓ نے اپنا دل، اپنا معاملہ اور اپنا انجام، سب کچھ اللہ رب العلمین کے حوالے کر دیا اور قلبی اطمینان اور نفسی جرأت کے ساتھ عبادت کی طرف متوجہ ہوئے تو ان پر اللہ تعالیٰ کی ایسی سکینت چھائی ہوئی تھی جو پتھر پر نازل ہوتی تو اسے پگھلا کر رکھ دیتی اور خوف و ہیبت پر اس کا نزول ہوتا تو اسے معدوم کر ڈالتی۔

دراصل اللہ ان کے ساتھ تھا اور وہ اللہ کے ساتھ تھے۔ اللہ کا ہاتھ ان کے اوپر تھا۔ قریب تھا کہ وہ دست قدرت کی انگلیوں کی ٹھنڈک اپنے سینے میں محسوس کرنے لگتے۔

حضرت خبیبؓ، حارث کے گھر میں قید تھے۔ ایک روز حارث کی ایک بیٹی ان کے پاس آئی تو فوراً بھاگتی ہوئی باہر چلی گئی اور لوگوں کو عجیب وغریب چیز دیکھنے کے لیے پکارنے لگی، کہنے لگی: ''اللہ کی قسم! میں نے اسے انگور کا ایک بہت بڑا گچھا پکڑے دیکھا ہے جس سے یہ انگور کھا رہا تھا اور یہ تو لوہے میں جکڑا ہوا (کہیں جا نہیں سکتا) ہے اور نہ مکہ میں اس موسم میں انگور کا پھل ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے خبیبؓ کو عطا کیا ہے۔''

یقیناً..... یہ وہ رزق تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے صالح بندے کو عنایت کیا، جس طرح اس سے قبل مریم بنتِ عمران علیہا السّلام کو عطا کیا تھا جسے قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

ترجمہ: ''زکریا جب کبھی اس کے پاس محراب میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا، پوچھتا: مریم یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ جواب دیتی: اللہ کے پاس سے آیا ہے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔''

ایک روز ان مشرکوں نے حضرت خبیبؓ کو ان کے ساتھی حضرت زید بن دثنہؓ کی شہادت کی خبر سنائی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ یہ خبر سنا کر ان کے اعصاب شل کر دیں گے اور اس طرح اسے دگنی سزا دیں گے لیکن انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ اللہ نے اپنے اس بندے کو اپنا مہمان بنا لیا ہے اور اس کے اوپر اپنی رحمت وسکینت نازل فرما دی ہے۔

پھر مشرکین ان کے ایمان کا سودا کرنے لگے اور ان سے کہنے لگے کہ تم اللہ اور محمد ﷺ پر جو ایمان رکھتے ہو اگر اس سے انکار کر دو گے تو ہم تجھے چھوڑ دیں گے۔ لیکن افسوس ان عقل کے اندھوں پر! ان کی کوشش تو اس آدمی جیسی تھی جو سورج کو پتھر مارنے کی کوشش کر رہا ہو۔

جب دشمنانِ حق اپنے اس منصوبے میں ناکام ہو کر ناامید و مایوس ہو گئے تو وہ اس ''بہادر'' کو پھانسی گھاٹ کی طرف لے چلے۔ وہ انھیں اس مقام کی طرف لے جا رہے تھے جس کا نام ''تنعیم'' تھا اور یہی حضرت خبیبؓ کا مقتل قرار پایا۔

وہ حضرت خبیبؓ کو لے کر اس مقررہ جگہ پر پہنچے ہی تھے کہ آپؓ نے ان سے دو رکعت نماز ادا کرنے کی

مہلت مانگی۔ انھوں نے اس خیال سے اجازت دے دی کہ شاید وہ اس طرح اللہ و رسول اور دین سے کفر کا اعلان کرنے کے لیے کچھ سوچنا چاہتے ہوں۔

حضرت خبیبؓ نے بڑے سکون اور خشوع سے آواز خفی میں دو رکعت ادا کیں۔ اس دوران میں ان کی روح میں حلاوتِ ایمان یوں مچل رہی تھی کہ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ان رکعات کو لمبا کریں اور پڑھتے ہی رہیں۔ لیکن انھوں نے قاتلوں کی طرف دیکھا اور فرمایا:

ترجمہ: ''اللہ کی قسم! اگر تم یہ گمان نہ کر لو کہ میں موت سے خائف ہوں تو میں ضرور اس نماز کو مزید طویل کرتا۔''

پھر انھوں نے آسمان کی طرف اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے بددعا کی:

''اے اللہ! ان کو ایک ایک کر کے گن لے اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے مار دے۔''

پھر بڑی جرأت اور اطمینان سے ان کی طرف متوجہ ہو کر یہ اشعار گانے لگے:

''اور جب میں مسلمان کی حیثیت سے قتل ہو رہا ہوں تو مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ کس پہلو پر مجھے موت آتی ہے۔ میں جس پہلو پر بھی مارا جاؤں گا اللہ کی خاطر ہی جان دوں گا اور موت تو اللہ کی خاطر قبول کر رہا ہوں اگر وہ چاہے تو ان ٹکڑے ٹکڑے ہڈیوں میں بھی برکت ڈال دے گا۔''

دشمنانِ حق نے کھجور کے تنوں سے ایک بہت بڑی صلیب تیار کی اور اس کے اوپر حضرت خبیبؓ کو باندھ دیا۔ ہر طرف سے مضبوطی کے ساتھ انھیں باندھا ہوا ہے اور مشرک دشمنی کا بدترین مظاہرہ کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ نیزہ باز اٹھتے ہیں اور اپنے نیزے پھینکنے کے لیے نیزہ بدست کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سولی پر لٹکے بہادر کے سامنے بہیمیت کا یہ بدترین مظاہرہ بڑے سکون سے جاری ہونے والا ہے۔ اس کے باوجود یہ بہادر اپنی آنکھیں بند نہیں کرتا۔ ان کے چہرے پر عجیب نورانی سکینت نازل ہو رہی ہے۔ نیزے ان کے بدن میں پیوست ہونے اور تلواریں ان کی بوٹیاں اڑانے کے لیے تیار ہیں۔

ایسی محبّت کرنے والا کوئی نہیں دیکھا
ان الفاظ نے ابوسفیانؓ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا
اللہ کی قسم! میں نے کسی سے محبّت کرنے
والا کوئی آدمی نہیں دیکھا جس طرح محمدؐ کے
ساتھی ان سے
محبّت کرتے ہیں۔

اس موقع پر قریش کا ایک سردار ان کے قریب آتا ہے اور ان سے کہتا ہے:

''کیا تو چاہتا ہے کہ اس وقت محمد تیری جگہ ہوں اور تو صحیح وسلامت اپنے اہلِ خانہ میں ہو؟''

حضرت خبیبؓ نے لمحہ بھر کا توقف کیے بغیر اپنے

قاتلوں کو مخاطب کر کے بآواز بلند کہا:

''اللہ کی قسم! مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک کانٹا چبھے اور میں اپنے اہل و اولاد میں رہوں اور دنیا کی نعمت و سلامتی مجھے میسر ہو۔''

یہی وہ عظیم اور غضبناک الفاظ ہیں جو حضرت خبیبؓ کے ساتھی حضرت زید بن دثنہؓ نے بھی اپنی شہادت کے موقع پر فرمائے تھے۔ کفر کے ایوانوں میں لرزہ طاری کر دینے والے یہ ہیبت ناک الفاظ کل حضرت زیدؓ نے کہے تھے اور آج حضرت خبیبؓ کہہ رہے تھے۔ ان الفاظ نے ابوسفیان کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ: ''اللہ کی قسم! میں نے کسی سے محبت کرنے والا کوئی آدمی نہیں دیکھا جس طرح محمد ﷺ کے ساتھی محمد سے محبت کرتے ہیں۔''

حضرت خبیبؓ کے یہ الفاظ گویا نیزوں اور تلواروں کو اپنا کام کر دکھانے کی اجازت دینا تھا اور یہی ہوا کہ یہ نیزے اور تلواریں وحشیانہ انداز میں ان کے جسم پر برس پڑیں۔

اس مقتل کے قریب آسمان پر پرندے اڑ رہے تھے گویا وہ اس انتظار میں تھے کہ یہ قصاب اپنے کام سے فارغ ہوں تو ہم اپنا کام شروع کریں۔ لیکن یہ چیل اور گدھ چیختے ہیں اور ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں، اپنی چونچیں ایک دوسرے کے قریب کرتے ہیں گویا یہ آپس میں کوئی سرگوشی اور مشاورت کر رہے ہوں۔ پھر اچانک اڑتے ہیں اور فضا میں بکھر کر دور دور چلے جاتے ہیں۔ شاید ان پرندوں نے صالح اور فرمانبردار آدمی کے جسم سے آنے والی خوشبو کو محسوس کر لیا تھا اور شرمندہ ہو گئے تھے کہ اس پاکیزہ جسد سے کوئی بوٹی نوچ کھائیں۔

پرندوں کا یہ غول حضرت خبیبؓ کے جسد کو چھوئے بغیر دور فضا میں جا چھپا اور مشرکین ظلم و بغاوت کا بدترین مظاہرہ کرنے کے بعد واپس مکہ میں اپنے حسد بھرے گھروں میں آ گئے اور حضرت خبیبؓ کا جسدِ شہید اس حال میں وہیں چھوڑ آئے کہ نیزہ بازوں اور تلوار زنوں کی ایک جماعت اس کی نگرانی پر مامور تھی تا کہ مسلمان اس کو اتار کر لے نہ جائیں۔

جس وقت ان لوگوں نے حضرت خبیبؓ کو باندھ کر صلیب پر لٹکایا تھا تو حضرت خبیبؓ نے آسمان کی طرف رخ کر کے گڑگڑا کر اپنے رب سے عرض کیا تھا۔

''اے اللہ! ہم نے تو تیرے رسول ﷺ کا پیغام پہنچا دیا۔ اب تو بھی اپنے رسول ﷺ تک اس کی خبر پہنچا دے جو ہمارے ساتھ ہوا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے آپؓ کی دعا قبول فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ کے اندر یہ شدید احساس پیدا ہوا کہ آپ ﷺ کے صحابہؓ مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ کو ان میں سے ایک صحابی کا جسد لٹکا ہوا بھی دکھایا گیا۔ آپ ﷺ نے فوراً حضرت مقداد بن عمروؓ اور زبیر بن عوامؓ کو بلایا اور ان آدمیوں کی خبر کے لئے روانہ کر دیا۔ دونوں جوانمرد اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور نہایت تیز رفتاری سے چل پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیا اور انھوں نے اپنے ساتھی حضرت خبیبؓ کو صلیب سے نیچے اتار لیا۔ آج تک کسی کو معلوم نہیں کہ حضرت خبیبؓ کی قبر کہاں ہے۔ شاید یہی ان کے زیادہ شایان شان تھا کہ وہ تاریخ کے تذکرے اور زندگی کے ضمیر میں باقی رہیں تو انھیں ''تختۂ دار پر موجود جوانمرد'' کے طور پر ہی یاد کیا جائے۔

■■■

ماں اور قانون

دوراہے پر

ایک بوڑھے بیٹے کا حیران کن مقدمہ
سعودی عرب کے شہر بریدہ کے لوگ اور عدالت دونوں کے لیے فیصلہ دشوار ہی نہیں دو بھر ہو گیا تھا

عبدالمالک مجاہد، ریاض سعودی عرب

عبدالمالک مجاہد، ریاض سعودی عرب

سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض سے ایک روزنامہ نکلتا ہے۔ شہر ریاض ہی کی نسبت سے اس کا نام روزنامہ ''ریاض'' ہے۔ اخبار کے مطابق دو بھائیوں کے درمیان جھگڑے کا مقدمہ اس قدر سنگین صورت اختیار کر گیا کہ اس کا فیصلہ پنچایت میں نہیں ہو سکا، بلکہ مقدمہ ہائی کورٹ تک پہنچ گیا۔ دراصل یہ مقدمہ بالکل نرالی نوعیت کا تھا، اس لیے بہت سے عربی اخبارات نے اسے نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ ہم روزنامہ ''الریاض'' کے حوالے سے واقعے کا خلاصہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

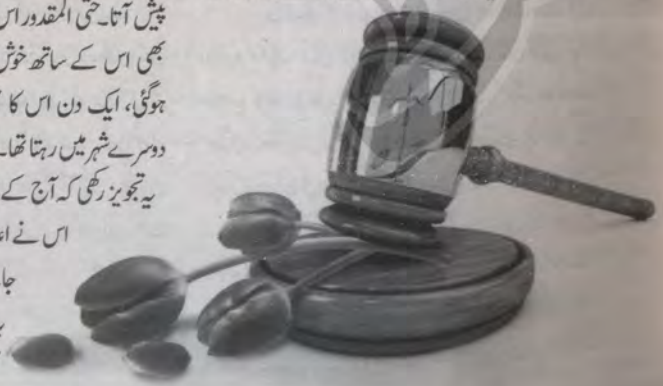

اس کا نام حیزان تھا۔ سعودی عرب کے معروف شہر ''بریدہ'' سے 90 کلومیٹر کے فاصلے پر ''اُسیاح'' نامی ایک بستی ہے۔ حیزان نامی بوڑھا اسی بستی کا رہنے والا تھا۔ جب مقدمہ ہائی کورٹ پہنچا تو وہ بوڑھا شخص لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی عدالت میں اس قدر رویا کہ اس کے آنسوؤں سے اس کی داڑھی بھیگ گئی، آخر کیوں؟

اس بوڑھے نے بھری عدالت میں لوگوں کے سامنے آنسو کیوں بہائے؟ کیا اس لیے کہ اس کے بیٹوں نے اس کے ساتھ ناروا سلوک کیا تھا؟ کیا اس لیے کہ زمین کے کسی مقدمے میں اس کی ہار ہونے والی تھی؟ یا اس لیے کہ اس کی بیوی نے اس عمر میں اس پر خلع کا مقدمہ دائر کر دیا تھا؟

جی نہیں، ان میں سے کوئی بھی وجہ نہیں تھی۔ دراصل وہ بھائی کے مقابلے میں اپنی ماں کا مقدمہ ہارنے کی وجہ سے تڑپ رہا تھا۔ اس ماں کا مقدمہ، جس کے پاس پیتل کی ایک انگوٹھی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

یہ بڑھیا اپنے بڑے بیٹے حیزان کے ساتھ رہتی تھی۔ حیزان اپنی ماں کے ساتھ انتہائی حسن سلوک سے پیش آتا۔ حتی المقدور اس کی خدمت کرتا تھا۔ بوڑھی ماں بھی اس کے ساتھ خوش تھی۔ جب حیزان کی عمر زیادہ ہو گئی، ایک دن اس کا چھوٹا بھائی اس کے گھر آیا۔ وہ دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ اس نے بڑے بھائی کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آج کے بعد ماں اس کے ساتھ رہے گی۔

اس نے اعلان کیا کہ وہ شہر سے ماں کو لے جانے کے لیے ہی آیا ہے۔

یہ بات حیزان کے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔ وہ کہنے لگا: بھائی!

اگرچہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور تم میرا بڑھاپا دیکھ کر یہ سمجھ رہے ہو کہ میں اپنی والدہ کی اچھی طرح خدمت نہیں کرسکوں گا، لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں آج بھی اپنی والدہ کی خدمت اسی طرح کرنے کے قابل ہوں جیسا کہ اس سے پہلے کرتا تھا۔ تمہیں میرے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ہرگز گوارا نہیں کرسکتا کہ میری ماں میری آنکھوں سے اوجھل رہے۔ میں جیتے جی ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں زندگی بھر بے قرار رہوں گا۔ اس لیے مجھ پر احسان کرو اور ماں کو اپنے ساتھ شہر لے جانے کی کوشش نہ کرو۔

چھوٹے بھائی نے جواباً عرض کیا: بھائی جان! آپ طویل عرصے سے ماں کی خدمت کررہے ہیں اور بلاشبہ آپ نے والدہ کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ جتنا ہوسکا آپ نے والدہ کی خدمت کی۔ اب آپ بوڑھے ہو چکے ہیں، ایسی صورت میں آپ خود اپنے بچوں کی خدمت کے محتاج ہیں، اس لیے آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ والدہ کو میرے ساتھ شہر جانے دیں۔ میں ابھی جوان ہوں، میرے بچے بھی دادی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ میری بیوی بھی ساس کی خدمت کرنا چاہتی ہے، اس لیے آپ ہمیں ماں کی خدمت کا موقع فراہم کریں۔

دونوں بھائیوں میں بحث ہوتی رہی۔ دونوں میں سے کوئی بھی اپنی ماں کو خود سے جدا کرنے پر راضی نہ تھا۔ دونوں ہی ماں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے اصرار کررہے تھے۔ ہر چند حیزان بوڑھا ہو چکا تھا، مگر اسے ماں سے جدائی گوارا نہ تھی۔ دونوں بھائیوں کے درمیان بحث بڑھتی دیکھ کر پڑوس کے لوگوں نے معاملہ سلجھانے کی کوشش کی۔ لیکن لوگوں کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ دونوں بھائیوں میں سے کوئی بھی ماں سے جدا رہنے پر تیار نہ تھا۔ دونوں اپنی اپنی دلیل سے ایک دوسرے کا مسکت جواب دے رہے تھے۔

جب یہ معاملہ حل نہ ہوسکا اور لوگوں کی مصالحانہ جدوجہد بھی اس مقدمے کو حل کرنے سے قاصر رہی تو آخرکار یہ مقدمہ ہائی کورٹ پہنچ گیا۔ مقدمہ دونوں بھائیوں کی طرف سے دائر ہوا۔

جج کے پاس یہ مقدمہ پہنچا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے اس کیس کو ہر اعتبار سے جانچا، دیکھا، تولا اور پرکھا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے؟ پھر اس نے دونوں بھائیوں کو اپنے چیمبر میں بلایا اور یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ان میں سے کوئی ایک بھائی اپنی ماں کو دوسرے بھائی کے پاس رکھنے پر راضی ہوجائے۔ مگر جج کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ دونوں بھائیوں میں سے کوئی بھی ماں کے فراق پر راضی نہ تھا۔ جج کو جب کسی طرح بھی بات بنتی نظر نہ آئی تو اس نے بوڑھی ماں کو عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ جج کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس معاملے میں ماں کی رائے سے بھی آگاہ ہوجائے کہ آخر خود ماں کی کیا مرضی ہے؟ وہ اپنے بڑے بیٹے حیزان کے ساتھ رہنا چاہتی ہے یا چھوٹے بیٹے کے ساتھ جانا چاہتی ہے؟

جج کے حکم کے مطابق دونوں بھائیوں نے اپنی والدہ کو ایک وہیل چیئر پر بٹھا کر عدالت میں پیش کیا۔ بڑھیا کا وزن کوئی بیس 20 کلوگرام تھا، کیونکہ وہ بہت بوڑھی ہوچکی تھی۔ اس کے جسم میں گوشت پوست کی بجائے ہڈیاں ہی ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔ عدالت حاضرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ چونکہ یہ اپنی نوعیت کا انوکھا مقدمہ تھا، اس لیے لوگ اس کا فیصلہ سننے کے لیے بے تاب تھے۔ عدالت میں دونوں بھائیوں نے مل کر ماں کو پیش کیا۔ جج کی ساری توجہ بوڑھی ماں کی طرف

تھی۔ اس نے خاتون سے مخاطب ہوکر پوچھا:

"محترمہ! دونوں بیٹے تمہاری خدمت کے لیے تمہیں اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں کی خواہش ہے کہ تمہاری خدمت کریں۔ ان میں سے کوئی بھی تم سے جدا ہونے کو تیار نہیں۔ میں نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ کوئی ایک اپنی بات سے رجوع کرلے مگر یہ دونوں اپنی بات اور دلیل پر مصر ہیں۔ مجھے اس مقدمے کا فیصلہ کرنے میں بڑی دشواری پیش آرہی ہے۔ اب یہ فیصلہ میرے ہاتھ میں نہیں بلکہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم جو کہو گی میں اسی کی بنیاد پر فیصلہ کردوں گا۔ میرا سوال یہ ہے کہ تم خود بتادو کہ ان دونوں بیٹوں میں سے کس کے پاس رہنا چاہتی ہو؟"

سچ تو یہ ہے کہ اس مقدمے کا فیصلہ جج کے لیے جتنا دشوار تھا، اس سے کہیں زیادہ ماں کے لیے دُوبھر تھا۔ دونوں بیٹے اس کی آنکھوں کے تارے تھے۔ وہ ان دونوں ہی سے بے لوث محبت کرتی تھی اور ان دونوں ہی نے ماں کی خدمت میں بڑے خلوص کا ثبوت دیا تھا۔ ماں کو چپ لگ گئی۔ جج خاتون کے جواب کا شدت سے منتظر تھا۔ خاتون نے چند لمحے بعد زبان کھولی اور کہنے لگی:

"جج صاحب! میں کیا فیصلہ سناؤں؟ آپ نے اپنے فیصلے کا انحصار میرے جواب پر رکھا ہے۔ بھلا میں کیا عندیہ ظاہر کروں؟ میں تو ان دونوں کی ماں ہوں۔ یہ دونوں ہی میرے بچے ہیں۔ میری ایک آنکھ میرے بڑے بیٹے حیزان کی طرف دیکھ رہی ہے اور دوسری آنکھ اس کے چھوٹے بھائی کی طرف۔ میں دوراہے پر حیران کھڑی ہوں۔ میرے لیے یہ فیصلہ مشکل ہے کہ میں کس راہ پر قدم بڑھاؤں؟

جج کے لیے اب یہ مقدمہ اور بھی پیچیدہ ہوگیا۔ اب اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جو مناسب سمجھے وہ فیصلہ سنادے۔ چنانچہ جج نے کافی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ سنایا:

'حیزان نے ایک عرصے تک اپنی بوڑھی والدہ کی خدمت کی ہے اور اب وہ خود بھی بوڑھا ہوچلا ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح چابکدستی سے اپنی ماں کی خدمت نہیں کرسکتا۔ اس کے مقابلے میں اس کا چھوٹا بھائی ابھی جوان ہے۔ اس کے پاس ماں کی خدمت کرنے کی صلاحیت بھی ہے، اس لیے عدالت یہ فیصلہ سناتی ہے کہ بوڑھی ماں اب اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہے۔ کیونکہ وہ اپنی والدہ کی بخیر وخوبی خدمت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

یہ فیصلہ سننا تھا کہ حیزان کی چیخیں نکل گئیں۔ اس کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ وہ بھری عدالت میں سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ وہ اپنے اوپر افسوس کررہا تھا کہ آہ! آج میں بوڑھا ہوجانے کی وجہ سے اپنی ماں کی خدمت کرنے سے محروم کردیا گیا ہوں۔ عدالت نے میرے خلاف فیصلہ صادر کیا ہے۔ کاش! میں بوڑھا نہ ہوتا، تاکہ اپنی والدہ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرکے اپنی خوشی مناتا۔"

اس واقعے کو ذہن میں رکھیں اور اپنے گردونظر دوڑائیں تو آپ کو کتنی ہی مائیں کسم پرسی کی حالت میں زندگی بسر کرتے نظر آئیں گی جن کے کئی کئی بیٹے ہیں لیکن کوئی ماں کو ساتھ رکھنے پر تیار نہیں ہوتا بعض بیویوں کی وجہ سے اور بعض بدنصیب اپنی بدفطرت کی وجہ سے ماں کی خدمت کے شرف سے محروم ہیں۔ ■■■

ریاض، سعودی عرب میں مقیم عبدالمالک مجاہد اسلام کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے دارالسّلام کے سربراہ ہیں۔ وہ کئی تاریخی اور سوانحی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اُردو ڈائجسٹ کے لیے یہ اُن کی خصوصی تحریر ہے۔

پیشین گوئی جو پوری ہوگئی

نئے نویلے شاندار بحری جہاز پر سب یوں بیٹھے تھے جیسے بادشاہ بیٹھے ہوں۔ اور وہ ان میں موجود تھیں۔

رضوان علی شاہ

عرب میں زمانہ قدیم میں جہاں نخلستان واقع تھے، وہاں عربوں نے بستیاں بسالی ہیں۔ بعض بستیاں مثلاً مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ ترقی کرتے کرتے شہر بن گئیں۔ لیکن حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں بیش تر عرب صحراؤں ہی میں رہتے بستے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہمیں علم ہوتا ہے کہ ایک عرب خاتون اور وہ بھی عظیم المرتبت صحابیہ نے اسلامی فوج کے ساتھ بحری جنگ میں شرکت فرمائی تو حیرت ہوتی ہے۔ آج انہی صحابیہ کی روح پرور داستان پیش ہے۔

☆☆

یہ 620ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے کہ بہ موقع حج رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ سے آئے 12 حاجیوں میں تبلیغ اسلام فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا دل ایمان کے نور سے بھر دیا اور وہ مسلمان ہو گئے۔ انہی نومسلموں میں حضرت عبیدہؓ بن صامت بھی شامل تھے جن کا شمار بعدازاں جلیل القدر صحابہ میں ہوا۔ یہ بیعت عقبہ اولیٰ تھی۔ اگلے سال مدینہ منورہ سے 73 حاجی حج کرنے مکہ آئے۔ ان میں بھی حضرت عبیدہؓ شامل تھے۔ یوں انھیں دونوں اولیں بیعتوں میں شمولیت کا اعزاز حاصل ہوا۔

مدینہ منورہ کے صحابہ کرام نے جب اصرار کیا تو یکم ہجری 622ء میں نبی کریم ﷺ نے ہجرت فرمائی۔

آپ نے مدینہ میں مقیم ہونے سے کچھ عرصہ قبل نواحی بستی، قبا میں قیام فرمایا۔ حضرت عبیدہؓ بن صامت اسی بستی میں رہتے تھے۔ آپ کا شمار خزرجی قبیلے، بنی عوف کے سرداروں میں ہوتا تھا۔ آپ نے ایک بڑا سا گھر تعمیر کر رکھا تھا۔ وہاں آپ کی زوجہ محترمہ، حضرت ام حرامؓ بنت ملحان کے علاوہ ان کی بہن، حضرت ام سلیمؓ بھی رہتی تھیں۔

چونکہ نبی کریم ﷺ نے قبا میں آرام فرمایا تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ کو اس بستی سے خاص اُنس رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ اکثر قبا تشریف لاتے اور مختلف صحابہ کرام کے گھر آرام فرماتے۔ انہی مبارک گھروں میں حضرت عبیدہؓ کا مکان بھی شامل تھا۔

حضرت ام حرامؓ کے بھائی، حضرت حرامؓ بن ملحان بھی نہ صرف صحابی بلکہ حافظ قرآن تھے۔ آپ ان قراء میں شامل تھے جو حادثہ بئیر معونہ میں شہید ہوئے۔ یہ دلدوز واقعہ غزوہ اُحد کے بعد 4 ہجری 625ء میں پیش آیا تھا۔

حادثے کے بعد رسول مقبول ﷺ حضرت اُمِ حرامؓ پر خاص شفقت فرمانے لگے۔ آپ ﷺ جب قبا تشریف لاتے تو کچھ عرصہ ان کے گھر گزارتے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کے گھر دوپہر کا کھانا تناول فرمایا اور ستانے کے لئے لیٹ گئے۔

حضرت اُمِّ حرامؓ ہولے ہولے آپ ﷺ کا سر مبارک سہلانے لگیں۔ اس دوران آپ ﷺ اونگھ کی آغوش میں پہنچ گئے۔

تھوڑی دیر بعد آپ ﷺ بیدار ہوئے تو آپ ﷺ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ حضرت ام حرامؓ نے جسارت کر کے اس مسکراہٹ کا سبب دریافت کیا

قولِ حضرت علیؓ

کارخانۂ قدرت میں غور کرنا عبادت ہے۔
عادت پر غالب آنا کمالِ فضیلت ہے۔
معافی بہترین انتقام ہے۔
ادب بہترین کمال اور صدقہ بہترین عبادت ہے۔

(انتخاب: شاہد ملک لاہور)

تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا، ''مجھے (خواب میں) دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت بغرض جہاد بحری جہاز میں سوار جا رہی ہے۔ وہ یوں اپنی نشستوں پر براجمان ہیں جیسے بادشاہ تخت پر بیٹھے ہوں۔''

یہ سن کر حضرت ام حرامؓ کہنے لگیں، ''رسول اللہ ﷺ! دعا فرمائیے کہ میں بھی اس جماعت میں شامل ہوں۔''

نبی کریم ﷺ نے فرمایا، ''ان میں تم بھی شامل ہو گی۔'' کچھ دیر بعد رسول اللہ ﷺ پھر نیند کی وادی میں چلے گئے۔ جب آنکھ کھلی تو پھر حضرت ام حرامؓ نے آپ ﷺ کو مسکراتے پایا۔ پوچھنے پر رسول اللہ ﷺ نے وہی پہلے والا جواب دیا۔ تب انھوں نے پھر فرمائش کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ''نہیں، تم مسلمانوں کی پہلی جماعت میں شامل ہوگی۔''

اس زمانے میں مسلمان صرف مدینہ منورہ تک محدود تھے۔ سمندر وہاں سے کئی سو میل دور تھا۔ کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مسلمان جہاد کی غرض سے بحری جہاز میں سوار ہوں گے۔ اس کے باوجود حضرت ام حرامؓ کو یقین تھا کہ آپ ﷺ کی پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت سنبھالی۔ ان کے دور میں حضرت عبیدہ بن صامتؓ نے روما کی جنگوں میں داد شجاعت دی۔ حضرت عمر فاروقؓ

کے دور حکومت میں وہ شام جانے والی فوج میں شامل ہوئے۔ اس کے امیر حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ تھے۔

شام میں بھی حضرت عبیدہؓ سمیت تمام مسلمانوں نے زبردست دلیری کا مظاہرہ کیا اور کئی معرکوں میں رومیوں کو شکست دی۔ یہاں تک کہ شام و فلسطین کا سارا علاقہ فتح ہو گیا۔ بعدازاں فلسطین کے نو مسلموں نے حضرت عمرؓ کو ایک درخواست بھجوائی۔ انھیں ایسے استاد کی ضرورت تھی جو ان کو قرآن پاک پڑھائے اور اسلامی تعلیمات و قوانین سے آگاہ کرے۔

حضرت عمرؓ، حضرت عبیدہؓ بن صامت کی دانش، معلومات اور ذمے دار شخصیت سے خوب واقف تھے۔ لہٰذا آپ نے فلسطینیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے انہی کو بھجوایا۔ اس طرح حضرت عبیدہؓ کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ وہ فلسطین میں پہلے قاضی اور فلسطینیوں کے استاد مقرر ہوئے۔

فلسطین میں حضرت ام حرامؓ بھی شوہر کے ساتھ مقیم رہیں۔ فلسطین میں حضرت عبیدہؓ کو تقریباً حاکم جیسا مقام حاصل تھا، لیکن طاقت انھیں دنیاوی آلودگیوں میں مبتلا نہیں کر سکی۔ پاک باز خاوند کی مانند ام حرامؓ بھی سادگی اور نیکی کی زندگی گزارتی رہیں۔

حضرت ام حرامؓ کو وقتاً فوقتاً رسول اللہ ﷺ کا خواب اور پھر پیشین گوئی بھی یاد آتی۔ گو مسلمان سمندر تک پہنچ گئے تھے، لیکن دور دور تک کسی سمندری سفر کے آثار نہ تھے۔ اس کے باوجود ام حرامؓ کو سو فیصد یقین تھا کہ حضور اکرم ﷺ کی پیشین گوئی پوری ہو کر رہے گی اور وہ براہ سمندر جہاد پر جانے والی پہلی مسلم جماعت میں شامل ہوں گی۔

مصر میں اب بھی رومیوں کی حکومت تھی اور یہ

شیطان کا دوست

حضرت یحییٰ بن زکریا نے ابلیس کو دیکھا اور اس سے دریافت کیا، ''بتاؤ تم کس شخص کو اپنا دوست رکھتے ہو اور کس کو اپنا دشمن تصور کرتے ہو۔''

ابلیس نے جواب دیا کہ بخیل زاہد کو میں بے حد عزیز رکھتا ہوں۔ کیونکہ وہ عبادت میں اپنی جان ہلکان رکھتا ہے ریاضت اور مجاہدہ بھی کرتا ہے لیکن اس کا بخل اس کے تمام کیے دھرے پر پانی پھیر دیتا ہے اور میں اس فاسق کو اپنا بدترین دشمن سمجھتا ہوں جو سخی ہو کیونکہ اس کی زندگی بھی عیش و عشرت میں گزرتی ہے۔ خوب چین اور مزے سے رہتا ہے اور پھر بھی مجھے یہ خوف بھی مارے دیتا ہے کہ کہیں وہ اپنی سخاوت کی وجہ سے بخش نہ دیا جائے کہ حق تعالیٰ کہیں اسے توبہ کی توفیق نہ عطا کر دے۔

(صباحت صباح: چناری ہٹیاں بالا)

خطرہ موجود تھا کہ رومی فوج کسی بھی وقت شام پر حملہ کر دے۔ چناں چہ حضرت عمرؓ کی اجازت سے حضرت عمروؓ بن العاص نے مصر پر حملہ کر دیا۔ وہاں اسلامی لشکر نے کئی معرکوں میں رومیوں کو ہار کا مزہ چکھایا اور انھیں پسپا ہونے پر مجبور کیا۔

اندرون مصر میں ایک قلعہ رومی فوج کا مضبوط گڑھ تھا۔ رومی فوج شکست کھاتے کھاتے وہاں محصور ہو گئی۔ جب حضرت عمروؓ بن العاص سے وہ قلعہ فتح نہ ہوا تو انھوں نے مکہ مکرمہ درخواست بھیجی کہ کمک بھجوائی جائے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے پھر بطور کمک ایک فوج مصر بھیج دی۔ حضرت عبیدہ بن صامتؓ کو اس

کے ایک حصے کا سردار بنایا گیا۔

مصر جانے والے اس اسلامی لشکر میں ام حرامؓ بھی شوہر کے ہمراہ تھیں۔ مصر میں حسب معمول حضرت عبیدہؓ نے دادِ شجاعت دی اور کئی مقابلوں میں رومیوں کے دانت کھٹے کیے۔ اسلامی لشکر کی زبردست دلیری کا یہ نتیجہ نکلا کہ رومی مصر سے بھی نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ مسلمانوں کی ایک بڑی فتح تھی۔

مصر کی فتوحات کے بعد حضرت عبیدہؓ بن صامت دمشق، شام میں مقیم ہو گئے۔ اس علاقے کے گورنر حضرت امیر معاویہؓ تھے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کی وجہ سے رومی بہت چراغ پا تھے۔ انھوں نے جزیرہ قبرص کو اپنا فوجی مستقر بنایا اور وہاں سے شامی ساحلی بستیوں پر بحری حملے کرنے لگے۔

رومی بحری جنگی جہاز حملے کرتے اور فرار ہو جاتے۔ چونکہ مسلمانوں کے پاس بحری بیڑہ موجود نہ تھا لہٰذا وہ رومیوں کا تعاقب نہیں کر پاتے۔ امیر معاویہؓ کی خواہش تھی کہ اسلامی بحری بیڑہ بنایا جائے تاہم انھیں حضرت عمر فاروقؓ کی طرف سے اجازت نہ مل سکی۔ اور حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ سوم منتخب ہوئے۔ تاہم امیر معاویہؓ خلیفہ سوم کو یہ یقین دہانی کرانے میں کامیاب رہے کہ مسلمان اب مضبوط بحری بیڑہ تیار کر سکتے ہیں۔

چناں چہ امیر معاویہؓ نے شامی بندرگاہوں میں بحری جنگی جہاز تیار کرائے۔ جب تمام تیاریاں مکمل ہو چکیں تو 30 ہجری 650ء میں اسلامی لشکر بحری جہازوں پر سوار ہو کر جزیرہ قبرص کی طرف روانہ ہو گیا..... اور اس لشکر میں حضرت عبیدہؓ بن صامت اور حضرت اُمِ حرامؓ دونوں موجود تھے۔

اس طرح کئی سال قبل آنحضورؐ نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی وہ پوری ہو گئی۔ نئے نویلے بحری اور شاندار جہاز پر سفر کرتے ہوئے ام حرامؓ کو یہی محسوس ہوا کہ سبھی مسلمان ''بادشاہوں کے مانند تخت'' پر سوار ہیں۔

اس اولین اسلامی بحری فوج کے کمانڈر امیر معاویہؓ تھے۔ رومیوں پر مسلمانوں کی دہشت اتنی چھائی ہوئی تھی کہ اہل قبرص نے لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیئے اور جزیہ دینا قبول کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے مسلم فوج نے بغیر لڑے قبرص فتح کر لیا۔

اسلامی لشکر نے پھر اسی جگہ قیام کیا جو آج لارناکا کہلاتا ہے۔ وہاں ایک دن ام حرامؓ خچر کی سواری کر رہی تھیں کہ جانور کے ٹھوکر کھانے پر گر پڑیں۔ انھیں شدید چوٹیں آئیں، علاج ہوا مگر وہ جانبر نہ ہو سکیں اور انتقال فرما گئیں۔ حضرت عبیدہؓ نے پھر اپنی چہیتی زوجہ کو غم ناک آنکھیں لیے دفن کر دیا۔ حضرت عبیدہؓ بن صامت پھر اسلامی لشکر کے ساتھ واپس شام چلے گئے۔ آپ نے 636ء میں جنگ یرموک میں شرکت فرمائی اور اسی میں شہادت کا اعزاز پایا۔

جس جگہ حضرت ام حرامؓ دفن ہوئیں، وہاں رفتہ رفتہ ایک قبرستان وجود میں آ گیا۔ بعدازاں عثمانی ترک سلاطین نے حضرت ام حرامؓ کا مقبرہ بنا دیا۔ پھر قریب ہی ایک مسجد بھی تعمیر ہو گئی۔ نیز ایک مدرسہ بھی بنایا گیا۔ چناں چہ آج اللہ تعالیٰ کی برکت سے حضرت ام حرامؓ کا مقبرہ پورا کمپلیکس بن چکا اور وہاں مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی برکت حاصل کرنے آتے ہیں۔

■■■

باتیں دانش کی

رفیدہ کلیم فاروقی

امام شافعیؒ

امام محمد ادریس الشافعی 150ھ میں فلسطین میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق خاندان قریش سے تھا۔ دس سال کی عمر میں مکہ معظمہ تشریف لائے۔ آپ کا حافظہ بلا کا تھا۔ چنانچہ صرف 7 سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرلیا۔ 15 سال کی عمر میں مؤطا امام مالک حفظ کر چکے تھے۔ 20 سال کی عمر تک اسلامی فقہ کی تعلیم مکہ المکرمہ کے مفتی سیدنا مسلم بن خلیل زانجی اور سفیان بن عیینیا نہؒ سے حاصل کی۔ امام مالک بن انسؒ بھی آپؒ کے اساتذہ میں سے تھے۔ عراق کا گورنر مدینہ منورہ آیا تو امام شافعیؒ کے علم وفضل سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے آپ کو منتظم کے عہدے پر فائز کیا۔ لیکن حکومت سے نزاع کی وجہ سے آپ کو عراق بھیج دیا گیا جہاں آپکو ہارون الرشید کے سامنے پیش کیا گیا۔ ہارون آپؒ سے بہت عزت واحترام سے پیش آیا۔ یہاں آپؒ نے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمد عیش شعبانیؒ سے اسلامی فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کو حنفی اور شافعی فقہ کے ماہر کا درجہ حاصل ہے۔

سفر مصر کے دوران میں اور قیام مکہ کے دوران میں آپؒ وعظ اور درس وتدریس میں مشغول رہتے۔ امام احمد بن حنبلؒ وہاں ایک طالبعلم کی حیثیت سے موجود تھے۔ انھوں نے آپ سے خوب فیض حاصل کیا۔ مکہ سے امام شافعیؒ بغداد تشریف لے گئے۔ وہاں 3، 4 سال قیام کے بعد تقریباً 50 سال کی عمر میں آپ مصر چلے گئے۔ مصر میں آپ کا حلقۂ تدریس بہت وسیع تھا اور دنیا بھر کے علماء آپ کے علم سے مستفید ہوتے۔ ان میں حضرت ربیع بن سلیمانؒ، حضرت یعقوب رواہہؒ، حضرت ابوابراہیم بن یحیٰ المزانیؒ جیسے جید علما شامل تھے۔ فقہ اسلامی پر آپ کی دو کتب 'الام' اور 'الرسالہ' بہت مشہور ہیں۔

آپؒ نے 204ھ میں مصر میں دارِ فانی سے کوچ فرمایا اور قاہرہ (مصر) کے جنوبی قبرستان واقع القرافہ الصغریٰ میں مدفون ہوئے۔ ایوبی سلطان ملک الکامل کو آپ کے مزار مبارک کی تعمیر کا شرف حاصل ہوا۔

اقوال:

1۔ ضرورتیں کم کروگے تو راحتیں زیادہ پاؤ گے۔

2۔ جو تمھارے ایسے اوصاف بیان کرے، جو تم میں نہ ہوں وہ تمھارے ایسے عیوب بھی بیان کرے گا جو تم میں نہیں۔

3۔ سخاوت دنیا اور آخرت کے عیبوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔

4۔ چونکہ جاہل کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ عالم ہے اس لئے وہ کسی کی بات نہیں مانتا۔

5۔ مخلوق میں سب سے زیادہ ہمدردی کے قابل وہ ہے جو تنگ حالی کے باوجود ہمت سے زندگی بسر کرتا ہے۔

6۔ اگر تم اپنے نفس کو حق میں مشغول نہ کروگے تو وہ تم کو باطل میں مشغول کردے گا۔

7۔ اپنے اوپر سب سے زیادہ ظلم کرنے والا شخص وہ ہے جو ایسے شخص کی عزت کرے جو اس کی عزت نہ کرتا ہو، ایسے شخص سے دوستی کرے جو اسے نفع نہ پہنچا سکتا ہو، ایسے شخص کی تعریف کرے جو اسے نہ پہچانتا ہو۔

امام احمد بن حنبلؒ

آپؒ 20 ربیع الاول 164ھ کو وسط ایشیا (موجودہ ترکمانستان) میں شاہراہِ ریشم پر واقع شہر مرو میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کے والد حضرت محمد بصرہ کے ایک مجاہد تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ بہت ذہین تھے اور اسلامی تعلیم کے حصول میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ انھوں نے 16 سال کی عمر میں حدیث کا مطالعہ شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں دس لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ آپ بحیثیت فقیہہ بہت مشہور ہوئے۔

آپؒ کے اساتذہ میں حضرت امام شافعیؒ، حضرت بشار بن المفضل، حضرت اسمٰعیل بن علیہ، حضرت جریر بن عبدالحامد اور حضرت یحییٰ بن سعیدؒ جیسے نابغۂ روزگار علما محدثین اور فقہا شامل تھے۔ آپؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد حضرت ابو یوسف سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ حدیث میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ حتیٰ کہ ان کے استاد امام شافعیؒ بھی ان سے حدیث روایت کرتے ہیں۔ ان کے شاگردوں میں حضرت ابوبکر الحرم، حضرت حنبل بن اسحٰق اور حضرت ابوالقاسم ال بغوی مشہور ہیں۔

آپ بہت متقی اور پرہیزگار تھے یہاں تک کہ کسی حکومتی اہلکار کے گھر سے کبھی کچھ نہ کھاتے تھے۔ اگرچہ آپؒ انتہائی مفلس تھے لیکن کسی کی امداد قبول نہ فرماتے تھے اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسا کرتے تھے۔

آپؒ کی کتاب الاعمال، کتابۃ التفسیر، کتاب الناسخ والمنسوخ، کتاب الزاہد، کتاب المسائل، کتاب الفضائل اور کتاب المنسک کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی مشہور و معروف تصنیف 'مسند' 50000 تا 70000 ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کو اس زمانے کے ظالم و جابر حکمرانوں کے غیر اسلامی فیصلوں پر مخالفت کی وجہ سے ظلم و تعدّی کا سامنا کرنا پڑا۔ خلقِ قرآن کے مسئلہ پر آپ نے خلیفہ مامون الرشید کی مخالفت کی اور قید و بند کی صعوبت برداشت کی۔ اس کے بعد خلیفہ معتصم باللہ نے امام صاحب کو 'معتزلہ' کے باطل عقائد قبول کرنے پر زور دیا۔ آپ کے انکار پر اتنا تشدّد کیا گیا کہ ان کے جوڑ علیحدہ ہو گئے۔ انھیں زنجیریں پہنا کر 30 ماہ تک بغداد کے قید خانے میں محبوس رکھا گیا۔ پھر بھی جب انھوں نے باطل نظریات کو ماننے سے انکار کر دیا تو انھیں اتنا مارا گیا کہ کہ بے ہوش ہو گئے۔ 25 رمضان 221ھ کو خلیفہ معتصم کو اپنے گناہ کا احساس ہوا چنانچہ اس نے آپؒ کو آزاد کر دیا۔ امام صاحب نے سوائے معتزلہ کے سب کو معاف کر دیا۔ آپ نے 5 بار حج کی سعادت حاصل کی۔ جن میں سے دو بار پاپیادہ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ نے 241ھ بمطابق 855ء کو بغداد میں وفات پائی۔ آپ کے جنازے میں 800,000 لاکھ مردوں اور 60,000 خواتین نے شرکت کی۔

اقوال:

1۔ قرآن مجید ایک ایسا دریچہ ہے جس سے ہم اگلی دنیا کو دیکھ سکتے ہیں۔

2۔ مومن کو گناہ یوں نظر آتے ہیں گویا ایک پہاڑ آہستہ آہستہ نیچے آ رہا ہے جو اسے پیس کر رکھ دے گا۔

3۔ نظر اسی وقت تک پاک رہتی ہے جب تک جھکی رہے۔

4۔ میں اس وقت تک علم حاصل کرتا رہوں گا جب تک قبر میں نہ پہنچ جاؤں۔

5۔ اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ وہ چیزیں تمھیں عطا کرتا رہے جو تمھیں محبوب ہیں تو وہ اعمال کرتے رہو جو اللہ کو محبوب ہیں۔

6۔ کھانے پینے سے زیادہ علم کی ضرورت ہے۔ کیونکہ کھانے پینے کی ضرورت تو دن میں دو یا تین مرتبہ ہوتی ہے جبکہ علم کی ضرورت ہمیشہ ہوتی ہے۔

7۔ عورتیں اپنے مردوں سے وہ چیزیں پسند کرتی ہیں جو ان کے مردان سے پسند کرتے ہیں: لطیف گفتگو، اچھی نگاہ، صاف لباس، اور اچھی خوشبو..... لہٰذا ہمیشہ ایسی حالت میں رہو۔

کور سٹوری

گوادر میں جو کچھ کیا سڑک کے بغیر کسی کام کا نہیں

پاکستان میرا دوسرا گھر ہے

سینیئر جاپانی سفارت کار توشی کاشی ایسوموورا سے ایک دلچسپ ملاقات کا احوال

تحریر و تہذیب: اختر عباس انٹرویو پینل: طیب اعجاز قریشی / وصی شاہ

پہلی نظر میں وہ جاپانی نہیں لگے، خوش شکل، خوش لباس اور سرو قد، جاپانی تو ایسے نہیں ہوتے۔ دھیمے، شرمیلے، چھوٹے قد کے بات کرنے میں محتاط، مشورہ دینے میں اور بھی محتاط، کھل کر مسکراتے اور قہقہہ لگاتے دیکھ کر میری حیرت دوچند ہو گئی تھی۔ سینیئر جاپانی سفارت کار ایسوموورا سے ملاقات بے حد خوشگوار ثابت ہوئی۔ سب سے دلچسپ بات یہ رہی کہ انگریزی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ اتنی روانی سے اور عمدگی سے اردو بولتے ہیں کہ بہت دیر یقین ہی نہیں آتا۔ خیال تھا ان سے جاپان کی صورت حال، چین میں ہونے والے جاپان مخالف مظاہرے، جاپان میں ین کی بڑھتی ہوئی قیمت سے پیدا ہونے والے معاشی مسائل، خودکشی کے رجحان میں روز افزوں اضافہ جاپانی صنعتی اداروں کا ملک میں اپنے پروڈکشن پلانٹ بند کر کے دوسرے ممالک خصوصاً چین جانے پہ تفصیلی بات چیت کریں گے۔ سوال میں نے لکھے ہوئے بھی تھے اور گفتگو کے دوران ضمنی سوال بھی خوب ہوئے۔ جناب طیب بھی کئی بار اپنے سوالات سے مدد کو آئے اور سید وصی شاہ نے بھی سیاسی کالم نگاروں کی طرح بڑے سلیقے سے اندر کی بات پوچھنی چاہی۔ کئی گھنٹوں کی

ملاقات کا احوال آپ کی نذر ہے۔ یہ بہرحال طے ہے کہ جناب توشی کاشی ایسوموراایک کامیاب سفارت کار ہیں۔ ملاقات جتنی چاہے دوستانہ ہو، وہ طرح دینا سمجھتے بھی ہیں اور جانتے بھی ہیں۔ پاکستانی سیاسی منظرنامے پر ان کی بڑی گہری نظر ہی نہیں ایک پختہ رائے بھی ہے۔ ان کے روابط پاکستان پیپلز پارٹی کی اعلیٰ قیادت سے لے کر لاہور شہر کی قیادت تک قائم ہیں اور وہ اس پر کوئی لاگ لپٹی رکھے بغیر اظہار بھی کرتے ہیں کہ پیپلز پارٹی حکومت میں آکر بھی رہنے کی پالیسی بنانے کی بجائے جلدی جانے کی پالیسی میں دلچسپی رکھتی ہے۔ جماعت اسلامی اور خاص کر الخدمت کے ساتھ حکومت جاپان نے سندھ اور دور افتادہ علاقوں میں پینے کے صاف پانی کے منصوبوں پر کام کر کے جو تجربہ حاصل کیا ہے اسی کے باعث قدرتی آفات کے دوران حکومتی امداد کو زیادہ موثر اور عمدگی سے خرچ کرنے کا ''وے آؤٹ'' بھی انھیں بھایا ہے۔ جناب نواز شریف، ان کی پارٹی اور ان کے دور رس کاموں کے حوالے سے بھی ان کا مشاہدہ گہرائی لیے ہوئے ہے۔

گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا کہ پاکستان میں اتنے طویل قیام کا تجربہ کیسا رہا؟

جواب: ''پاکستان میرا دوسرا گھر ہے۔'' انھوں نے خوش دلی سے کہا۔

سوال: وہ کیسے؟ فارن سروس والے تو اپنی جاب کی وجہ سے ملکوں ملکوں گھومتے ہیں۔

جواب: ''مجھے یہاں اٹھارہ سال ہونے کو آئے۔'' انھوں نے بتانا شروع کیا۔ میں نے تعلیم مکمل کی تو امتحان دیا۔ میری سلیکشن کے ساتھ ہی پوسٹنگ سے پہلے مجھے لاہور جانے کا حکم ملا۔

''وہ کیوں؟'' سب ان کی باتیں توجہ سے سن رہے تھے۔

''مجھے لاہور آکر پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں داخلہ لینا تھا اور اُردو زبان سیکھنی تھی۔ یہیں میری ملاقات ڈاکٹر سہیل احمد خاں سے ہوئی اور اُردو کے ان اساتذہ سے بھی جو بعد میں اپنی تحقیق اور تنقید کے حوالے سے معروف ہوئے۔ ایک سال کے بعد واپس گیا تو اردو لکھنا، پڑھنا آچکا تھا۔ اُردو بے حد آسان زبان ثابت ہوئی۔ ہماری زبان کے تین ہزار حروف تہجی کے مقابلے پر اس کے کل 26 حروف یاد کرنا، پہچاننا بہت آسان ہے۔ ٹریننگ کے بعد میری پہلی پوسٹنگ پاکستان ہوئی اور میں جو لاہور بھجوائے جانے پر سوچتا تھا کہ یہاں کیوں بھجوایا گیا۔ آسانی سے سمجھ پایا۔ یہ 1985ء کا سال تھا، بے نظیر بھٹو پاکستان آرہی تھیں۔ میں مال روڈ پر کئی گھنٹے انتظار کرنے کے بعد واپس چلا گیا کہ رات کو ٹی وی پہ دیکھ لوں گا۔ یہ میری پہلی غلطی تھی، لاہور میں لوگوں کے ہجوم کو میں نے نیلا گنبد کے پاس وائی ایم سی اے ہال کی چھت پر کھڑے ہو کر خود دیکھا تھا۔ ان ہزاروں لوگوں کا رات ٹی وی سکرین پر کوئی وجود تو دور کی بات ہے، ذکر ہی نہیں تھا۔ تب سیکھا کہ سفارت کاری کرنی ہے تو اپنی آنکھوں پہ یقین کرنا لازم ہے۔ دوسروں کی امید پر رہے تو اہم تاریخی لمحات کی گواہی ممکن نہ ہوگی۔

سوال: آپ نے ان برسوں میں ہونے والی سیاسی اور

سونامی خان صاحب تو بس ٹھیک ہی ہیں

سماجی تبدیلیوں کو تو خوب دیکھا؟

جواب: بالکل بالکل! بڑی اچھی تبدیلیاں آتی رہیں۔ سماج بھی بڑا بدلا ہے، تعلیم اور دولت دونوں زیادہ دیکھی جا رہی ہیں، سیاست میں البتہ لوگوں کی توقع پوری نہیں ہوئی۔

سوال: سیاسی حوالے سے پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے، آپ کی نظر میں کیسا ہے؟ آپ کی سیاسی بصیرت کیا کہتی ہے؟

جواب: سونامی خان صاحب تو بس ٹھیک ہی ہیں۔ اگر پاکستانی سیاست میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو جدوجہد کریں اب تک جو ہوا ہے اس کا نتیجہ بہت حوصلہ افزا نہیں ہے۔ اُن کے ساتھ جاوید ہاشمی اور شاہ محمود قریشی صاحب جیسے سیاستدان آرہے ہیں تو اچھی بات ہے وہ کرپٹ نہیں ہیں مگر اور کئی لوگ آئے ہیں جن کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ انھوں نے پارٹی کے اندر انتخابات کرائے ہیں۔ پنجاب اور خیبر میں تو یہ ہو گئے ہیں باقی صوبوں کا پتا نہیں کیا بنا؟ بلوچستان اور سندھ میں پارٹی کا اتنا زور نہیں لگتا۔ سوال یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے اندر کبھی انتخابات کیوں نہیں ہوئے؟ پیپلز پارٹی والے خود کو جمہوریت کا زیادہ بڑا علمبردار کہتے ہیں۔ اندر اگر جمہوریت نہ ہو تو باہر کس طرح سے ہو سکتی ہے۔

میرے ایک دوست پچھلے دنوں ایک صاحب کو ملانے کے لیے لے کے آئے، تقریباً ایک ہفتہ پہلے۔ اسد قیصر نام ہے ان کا۔ تحریک انصاف خیبر پختونخواہ کے نئے صدر ہیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے کچھ معلوم ہوا کہ وہ باقاعدہ منتخب ہوئے ہیں۔ ان کی ذاتی تربیت اور رجحان میں جماعتی Sense تھا، باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ جماعت اسلامی کے سپورٹر رہے ہیں۔ سیٹ ایڈجسٹمنٹ کی بات بھی ہوئی وہ کہہ رہے تھے خیبر پختونخواہ میں تحریک انصاف جماعت سے مل کر کافی سیٹیں لے سکتی ہے۔

سوال: پنجاب پر آپ کی کافی گہری نظر ہے، لوگوں سے ملتے رہتے ہیں۔

جواب: پنجاب سے بھی تین چار سیٹیں لے جائیں گے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ پنجاب کے چند بڑے شہروں میں سرپرائز ہوگا۔ تحریک انصاف پاکستان کی موجودہ سیاست میں تبدیلی لانے کا محرک ثابت ہوگی یا نہیں ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ میں تو اس بات کا حامی ہوں کہ تبدیلی ہونی چاہیے۔ آپ پیپلز پارٹی یا مسلم لیگ نواز سے تبدیلی کی توقع تو نہیں کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے اپنے

انداز میں پکے ہیں۔

اس کے بعد گفتگو جاپان کے معاشی حالات اور بدلتی ہوئی صنعتی صورت حال کی طرف مڑ گئی۔ جاپان کئی عشروں کے بعد معاشی دباؤ کا شکار ہو رہا ہے۔

سوال: جاپان کی مختلف کاروباری کمپنیاں ٹویوٹا، سونی، شارپ، توشیبا جو دنیا پر حکومت کر رہی تھیں۔ لیکن آج کل ٹویوٹا اور سونی جیسی کمپنیاں بھی مسائل میں گھر چکی ہے۔ کیا وجہ ہے اس کی؟

جواب: اب تو حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے، جاپان میں بہت سارے کارخانے دوسری جگہ منتقل ہو رہے ہیں کیونکہ جاپان میں ہوتے ہوئے وہ compete نہیں کر پا رہے۔ اگر سونی کی ایک چیز کی قیمت ایک لاکھ ہے اور وہی چیز چائنا میں بن رہی ہو تو اس کی قیمت 50 ہزار ہے۔

یہ بہت بڑا چیلنج ہے، الیکٹرانک چیزوں کے لئے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ کیونکہ ایک تو اسے آسانی سے کاپی کیا جا سکتا ہے اور دوسرا ہم قیمت بھی کم نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہماری Investment جاپان سے باہر بڑھ رہی ہے۔

سوال: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جاپانی سرمایہ باہر شفٹ کرنا اچھی بات ہے؟

جواب: اچھی بات تو نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اپنے ملک میں ہو تو 200 لوگوں کو روزگار مل رہا ہوتا ہے۔ اور اگر بنکاک میں ہے تو وہاں تو صرف دو تین جاپانی ہوں گے، باقی تو وہاں کے مقامی ہوں گے۔ اب وہاں سے تو تقریباً 198 لوگوں کا روزگار باہر چلا گیا۔

اسی دوران عرشیاں میاں ایک مشکل سوال لے کر محفل میں شریک ہوئے اور مہمان سے پوچھنے لگے یہ چین میں آپ کے خلاف مظاہرے کیوں ہو رہے ہیں؟ معزز مہمان کسمسائے اور بولے کافی پرانا معاملہ ہے۔ چند جزیروں پر چین بھی ملکیت کا دعوے دار ہے۔ ان پر کبھی کبھار بات چیت تو ہو جاتی ہے مگر ابھی ہمارے چینی دوستوں نے اس پر زیادہ توجہ مرکوز کر دی ہے، جس وجہ سے معاشی تعلقات میں بھی بگاڑ آ رہا ہے۔ ہماری کوشش یہی ہے کہ تنازعہ کو زیادہ ہوا نہ دی جائے، گفت و شنید اور افہام و تفہیم سے مسئلے کا حل نکالا جائے مگر دباؤ بڑھانے کے لیے چین میں مظاہرے ہوئے ہیں۔

سوال: معاشی اور ثقافتی لحاظ سے پاکستان اور جاپان کے تعلقات کیسے ہیں؟

جواب: ہمارے خیال میں پاکستان اور جاپان کے تعلقات میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ صرف ایک بار مسئلہ ہوا تھا۔ جب نواز شریف صاحب نے دھماکا کیا تھا تب ہم نے کچھ پابندیاں لگائیں اور ہم نے رابطے بند کر دیئے۔ بعد میں جب بحال ہوئے تو اب تک چل رہے ہیں اور پچھلے سال تو سفارتی تعلقات بھی بڑھ گئے۔

سوال: آپ کے ہاں تعلیمی اداروں میں ہمارے طلبہ کی تعداد بڑھ رہی ہے؟

جواب: جی ہاں یہ درست ہے یہ رجحان بڑھ رہا ہے۔ پاکستان کی نسل نو پہلے کی نسبت اب زیادہ جانتی ہے۔ جاپان کے بارے میں خاص طور پر انٹرنیٹ کی وجہ سے بہت فائدہ ہوا ہے۔ طلبہ خود سے یونیورسٹیوں کے پروفیسروں سے رابطے کر رہے ہیں۔ اسکالرشپ لے رہے ہیں۔

سوال: آپ پاکستان سے زیادہ بھارت میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: نہیں، پاکستان میں بھی ہماری کافی سرمایہ کاری ہے۔ کراچی میں سوزوکی کمپنی اور لاہور میں ہنڈا کمپنی ہے۔ ہندوستان نے پرانے زمانے سے اس طرح کی پالیسی اپنائی تھی کہ خواہ چیزیں اچھی نہ ہوں پر ان کی اپنی جگہ پر بنائی جائیں۔ ہندوستان کے پاس انڈسٹری کا ڈھانچہ موجود ہے۔ اس لئے اس کو بہتر بنانا اتنا مشکل نہیں تھا۔ لیکن پاکستان میں اس طرح سے نہیں ہے کیونکہ پاکستان زیادہ تر درآمد کرتا ہے۔ یہاں پر انڈسٹری کا جو ڈھانچہ موجود ہے اس کو بنانا آسان کام نہیں ہے اور اس کے لیے وقت بھی کافی درکار ہے۔

سوال: کیا ہماری پالیسیاں بھی رکاوٹ بنیں اس معاشی ترقی میں؟

جواب: میں یہی کہوں گا کہ منتخب حکومت جو بھی آئے اس کی پالیسی میں تسلسل ہو۔ آج ایسے کرنا ہے کل اس کے اُلٹ کرنا ہے۔ اس طرح سے نہ ہو۔ جو پالیسی ایک حکومت نے بنائی ہے، ضد میں آ کر اسے بدلا نہ کریں۔ اس سے ملک اور قوم کے پیسے کا ہی نہیں وقت کا بھی بہت نقصان ہوتا ہے۔

جاپان میں خودکشی، کیا یہ رواج میں شامل ہے!

جاپان میں انفرادی ہی نہیں اجتماعی خودکشی کا بھی رواج رہا ہے۔ کبھی خودکشی اس لئے کی جاتی تھی کہ زندگی میں سکون اس قدر درد آتا تھا کہ کوئی مزاحمت، کوئی رکاوٹ کوئی چیلنج ہی نظر نہ آتا تھا۔ کوئی کب تک اس قدر سکون کو جھیلے۔ پھر وقت کے ساتھ self respect اہم ہو گئی۔ اس پر ذرا سی زد پڑتی تو خودکشی فوری حل۔ دفتر میں مسئلہ ہوا، ٹارگٹ حاصل نہیں ہوا، کسی باس نے زیادہ ڈانٹ ڈپٹ کر دی، یہاں تک کہ دل میں صرف خطرہ اور خدشہ ہی جاگا تو جیسے خودکشی کو باہر دروازے پر منتظر پایا اور اسے جا گلے لگایا۔

گذشتہ ایک دہائی نے جہاں جاپان کو بدل ڈالا وہاں خودکشی کے بارے میں نظریات، حالات اور حوالہ جات بھی بدلے ہیں۔ گذشتہ سال پہلی مرتبہ حکومتی سطح پر کئی وزرا نے خودکشی کے بڑھتے ہوئے واقعات کو روکنے کی مہم چلائی۔ سب سے اہم کام یہ کیا گیا کہ ان ویب سائٹس کو بند کر دیا گیا جن کے چلانے والے خود تو زندہ رہنا چاہتے تھے۔ البتہ دوسروں کو مرنے کے طریقے بہت دل و جان سے بتاتے تھے۔ بظاہر ان اقدامات سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ جاپان کی قومی پولیس ایجنسی نے تو عجیب اور پریشان کن صورت کی نشان دہی کر ڈالی۔ ان کی معلومات اور اعداد و شمار کے مطابق 60 سال سے زائد عمر کے بوڑھوں میں خودکشی کا رجحان 9 فیصد بڑھا ہے۔ ایک سال میں بارہ ہزار ایک سو سات واقعات، یہ کل خودکشی کے واقعات کا 40 فیصد بنتا ہے۔ جاپانی معاشرے میں خاندانی نظام کی گرفت ہمیشہ سے مضبوط رہی ہے۔ مگر صنعتی دور میں معاشی ترقی کی دوڑ نے خاندانی نظام کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ بزرگوں کو احساس ہونے لگا ہے کہ وہ اپنے بچوں پر بوجھ کی صورت ہیں اور ان کی ٹھیک سے دیکھ بھال نہیں ہو پا رہی۔ دوسری طرف طبی انشورنس کی پالیسی بدلتے ہوئے حکومت نے اس کو مہنگا کر دیا ہے۔ عمر رسیدہ افراد بجا طور پر سمجھنے لگے کہ خاندان اور ریاست دونوں کی دیکھ بھال میں دلچسپی کم ہو رہی ہے۔ پولیس حکام نے تو خودکشی کے بڑھتے ہوئے واقعات میں دو اعشاریہ 9 فیصد اضافہ نوٹ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ خودکشی کرنے کی مقبول وجوہات میں قرضہ، بیماری اور ڈپریشن نے بھی جگہ بنالی ہے۔ اس لئے خودکشی کے معاملات و واقعات کی تعداد چالیس ہزار کو چھونے لگی ہے ہمارے معزز مہمان اس حقیقت کو ماننے پر آمادہ نہ تھے، میں نے انہیں خود ایک جاپانی کنسلٹنٹ کا واقعہ سنایا جو ہنڈا فیکٹری سے ہمارے ساتھ ہی لاہور کے لئے نکلے تھے۔ پی سی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے صرف اپنے اہداف حاصل نہ کر سکنے اور پالیسی کی بہتر کمیونی کیشن نہ کر پانے پر اسی رات اپنے آپ کو زندگی سے محروم کر لیا۔ پی سی میں ہونے والی یہ اپنی نوعیت کی پہلی خودکشی تھی جسے کئی سال پہلے اخبارات نے شہ سرخیوں کے ساتھ رپورٹ کیا تھا۔

پاکستان اور جاپان کے تعلّقات میں صرف نواز شریف کے عہد میں مسئلہ ہوا تھا۔

سوال: پیپلز پارٹی کی حکومت نے اپنے آخری دنوں میں بڑے اہم معاہدے کیے ہیں۔ یعنی ایران کے ساتھ پائپ لائن کا معاہدہ اور گوادر پورٹ چین کے حوالے کرنے کا معاہدہ، آپ انہیں کیسے دیکھتے ہیں؟

جواب: گوادر پہ جو ابھی ابھی جلد بازی میں کیا گیا، یہ بس دکھانے کے لئے ہے، یعنی زرداری صاحب یہ دکھانا چاہتے تھے کہ ہم کچھ کر رہے ہیں۔ تاکہ انتخابات کے آخری مراحل میں بتا سکیں کہ ہم نے یہ کیا۔ ہم نے بھی یہ سوچا ہے کہ گوادر پر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ گوادر پورٹ اس وقت کار آمد ہوگا جب گوادر سے کراچی تک کا راستہ کھلا ہو اور اس سے آگے افغانستان سے ترکمانستان تک سڑک جا سکے۔ اس وقت یہ کار آمد ہوگا اور چلے گا بھی۔ ابھی جہاز گوادر لے کے جائیے پھر کراچی سامان لانا پڑے گا، دو تین کیسز سامنے آئے ہیں۔ کروڑوں کا خرچہ ہوا ہے کراچی لانے میں۔ یہ بہت مہنگا پڑے گا۔ اس طرح گوادر پورٹ کو کار آمد بنانے کے لئے دوسٹر کیں بنانا ہوں گی ۔موٹروے کے معیار کی پھر اصل فائدہ ہوگا۔ فی الحال تو صورت یہ ہے کہ ہمارے چائنیز دوست جو ہیں وہ بلوچستان میں محفوظ نہیں ہیں۔ کیسے کام کر سکیں گے!

سوال: گوادر کے اپنے حالات اس معاہدے سے فوائد لینے میں رکاوٹ تو نہیں بنیں گے؟

جواب: چینی اپنا عملہ جاننا سے لے کے آئے ہیں۔ مقامی لوگ سوچ رہے تھے کہ ہمیں روزگار ملے گا جب ویسا نہیں ہوا تو بغاوت پیدا ہوئی۔ جب یہ وہاں کسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں تو میزائل فائر کیا جاتا ہے ۔ بلوچستان یا افغانستان میں جو چائنیز کمپنیاں کام کر رہی ہیں اس میں بلوچ لوگ ہیں اور وہ مطمئن بھی نہیں ہیں۔ اس لئے جب یہ وہاں جاتے ہیں تو انھیں اغوا کر لیتے ہیں یا حملہ کر دیتے ہیں تو اس طرح کے حالات میں کیا کریں گے۔

سوال: پاک ایران گیس پائپ لائن 2014ء تک مکمّل کرنا لازم ہوگا ورنہ یومیہ جرمانہ ہوگا۔

جواب: آپ کی بات درست ہے کہ اس معاہدے میں روزانہ کا جرمانہ لکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پاک ایران گیس معاہدے پر لاگت بہت زیادہ ہے۔ یہ اتنا پیسا کہاں سے لے کے آئیں گے۔ اور اگر امریکا کی منظوری نہ ہو تو کس طرح پیسا آپ کے پاس آجائے گا۔ کام شروع ہو جائے تو آپ کے اوپر پابندیاں شروع ہو جائیں گی۔ تو اس کے بعد کیا کریں گے۔

سوال: آپ کو نہیں لگتا کہ 2014ء تک یو ایس اے کو چونکہ واپس جانا ہے اور اسے اپنا سامان بھی واپس لے کے جانا ہے۔ وہ کیسے پابندیاں لگا سکے گا؟

جواب: ہاں: دیکھیں لے جانے والے سامان کا آہستہ آہستہ سائز چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ سال کے اندر اندر آدھا تو ہو جائے گا اور زیادہ تر سامان تو ادھر ہی چھوڑ کے جانا ہے، نیا سامان تو نہیں آنا ابھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے توں توں پاکستان کی اہمیت امریکا کے لئے کم ہوتی جا رہی ہے۔

کبھی لگتا ہے زرداری صاحب نے یہ جلدی میں کیا ہے

سوال: آنے والے چند برسوں میں افغانستان سے انخلا کے بعد کا منظر کیسا ہوگا؟

جواب: دو سال کے بعد جب امریکا افغانستان سے چلا جائے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ افغانستان میں تب کیا ہو رہا ہوگا۔ آپ کے علاقے پاکستان میں امن و امان کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ اس کو کس طرح سے ٹھیک کریں گے۔ اہم سوال یہ ہے کہ آپ کے ہاں بجلی نہیں ہے، گیس نہیں ہے، دلچسپ بات یہ کہ بجلی تو ہے، لیکن مس مینیجمنٹ ہے۔ اس کو کس طرح سے ٹھیک کیا جائے گا؟ میں سمجھتا ہوں اگر درست پالیسی بنائی جائے تو پاکستان کے حالات اور معاملات ٹھیک ہو سکتے ہیں۔

موجود حالات میں دیکھیں تو دس روز میں یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے ہاں بڑی حد تک بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے، یہ پہلے بھی تھی۔ بجلی پیدا ہوتی تھی، ضرورتیں پوری ہو رہی تھیں۔ بجلی کہیں غائب تو نہیں ہو گئی۔ اس کو صحیح طرح سے مینیج کریں تو معاملہ صحیح ہو جائے گا۔

سوال: ہم نے افغانستان کے حوالے سے امریکا کو سپورٹ کیا، قربانیاں دیں مگر دنیا نے نہ اس کو تسلیم کیا نہ ہمیں سپورٹ کیا، تیس ہزار جانیں بھی دیں اور بُرے بھی بنے۔ کیا اب بھی ہمیں Mess میں ڈال کے یہاں سے نکل جائیں گے تو کیا یہی ہمارا فیوچر ہے؟

جواب: دیکھیں اس لئے تو امریکا کہتا ہے کہ ایران کے ساتھ ایسا کام نہ کریں جو زرداری صاحب نے کیا۔ انھیں پالیسیاں پسند نہیں ہیں۔

کبھی تو یہ لگتا ہے کہ زرداری صاحب نے محض دکھانے کے لئے ایسا کیا ہے۔ بغیر سوچے سمجھے یہ سب کیا ہے۔ میری نظر میں اگر گوادر کی سڑک نہیں بنتی تو پھر کوئی فائدہ نہیں ہے پاکستان کو، امریکا الگ ناراض رہے گا۔ ہاں اگر سڑک بن جائے تو بہت فائدہ ہے۔

''توشی کاشی ایسومورا'' طویل گفتگو کے بعد بھی تروتازہ تھے۔ ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی تو طیب اعجاز کا مشورہ تھا کہ کھانا اواری چل کر کھایا جائے جہاں جاپانی کھانوں کا ماہر کک موجود ہے۔ جناب ایسومورا ہم سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ طیب اعجاز آتے ہوئے جناب الطاف حسن قریشی کو بھی ساتھ لائے۔ کھانے پہ گفتگو جاری رہی، وصی شاہ نے اپنے جاپان کے دورے کے حوالے سے یادیں تازہ کیں اور طیب اعجاز نے ایسومورا سے پہلی ملاقات کا تذکرہ کیا جس کے بعد وہ یوتھ پروگرام کے تحت جاپان گئے تھے۔ کھانے میں جاپانی ڈشیں تھیں، ایسومورا صاحب نے ایک بڑے سے باؤل میں تکوں کی مدد سے کھایا۔ شیف ہمارے ٹیبل پر ہی کھانا تیار کر کے سرو کر رہا تھا۔ اس نے مچھلی اور جھینگے جاپانی انداز میں پاکستانی ٹچ کے ساتھ پیش کیے۔ ہم مروت والے لوگ ہیں کھانے میں اپنی پسند کا ذائقہ نہ بھی ہو تو اظہار کا موقع تک نہیں آنے دیتے۔ ■■■

کوّر سٹوری

اہلِ جاپان

اپنا ہدف نہیں بھولتے

- ذاتی مہر اتنی اہم کیوں ہے
- شادی کے لیے 3K کیوں ضروری ہیں
- جاپان میں کتاب چوری نہ ہونے کی وجہ
- جاپانی روزانہ 14 کروڑ کارڈز کا کیوں تبادلہ کرتے ہیں

دنیا میں جاپان کی تہذیب وثقافت کو کئی اعتبار سے ممتاز حیثیت دی جاتی ہے۔ جاپان کے عوام بھی اپنی اس خصوصیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ یہ اپنے ٹھنڈے اور نرم مزاج کی وجہ سے دنیا بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ گذشتہ کئی عشروں میں جاپان کی صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے تین نمایاں رنگ بھی سامنے آئے۔ اس کا پہلا رنگ اور آہنگ انیسویں صدی میں دنیا نے دیکھا۔ لوگوں نے اپنی توجہ گیشا (Geisha)، فیوجی یاما (Fujiyama) اور یوکی یوی (Ukiyoe) پر مرکوز کی۔ یہ لکڑی کے بلاکس پر نقش کاری کا کام تھا۔ اس زمانے میں لوگوں کا مزاج تھا کہ وہ اعلیٰ ترین کام پر نظر رکھتے تھے۔ ان میں جستجو اور تلاش کا جوہر پایا جاتا تھا۔ دوسرا رنگ وآہنگ وہ تھا جب 1980ء کے عشرے میں جاپان کے مختلف مظاہر کے کارٹون بنائے گئے۔ ''مانگا'' نام کے یہ کارٹون دنیا بھر میں دکھائے گئے۔ ان کو ان کے اعلیٰ معیار، تفریح کے بہترین ذریعے اور فنکارانہ خوبی کی وجہ سے جاپان کے لوگوں کے نفیس مزاج کا عکاس سمجھا گیا۔ یہ تاثر 1990ء کے عشرے میں بھی برقرار رہا۔ اب یہ رجحان ختم ہو چکا ہے۔ تاہم اس کے مثبت اثرات اب بھی جاپانی ثقافت پر نمایاں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ جاپانی آج بھی پاپ کلچر کے حوالے سے مانگا (Manga) اور دوسرے کارٹون ورک کو فراموش نہیں کر پاتے صنعتی عروج کے زمانے میں جاپان دنیا میں کوالٹی، خوبصورتی اور معیار کا عنوان ٹھہرا۔ جاپان کبھی پھولوں اور کھلونوں میں سب سے آگے رہا اور کبھی کاروں، بجلی کے آلات اور ہوم اپلائنسز میں معیار ٹھہرا۔ ''زیرو ایرر (Zero error) کی اصطلاح اور حوالہ بھی جاپان سے شروع ہوا۔ کام اپنے سارے مراحل میں اتنا شاندار ہو کہ غلطی ہی نہ رہے۔ ہمارے دوست نواز صاحب ٹوکیو کے اس کارخانے سے ہو کر آئے جو تین بڑی کار کمپنیوں کو پرزے بنا کر دیتا ہے تو ان کی حیرت نہ جاتی تھی۔ ایک کمپنی کا معیار ہے دس ہزار پرزے ایک غلطی کا امکان، دوسری کمپنی ہنڈا کا معیار ایک لاکھ پرزے ایک غلطی کا امکان اور تیسری کمپنی مٹسوبیشی دس لاکھ پرزے پر ایک غلطی۔ جن دنوں میں ایچ آر کی سپیشلائزیشن کر رہا تھا۔ ایک کورس پی سی ہوٹل کی ڈائریکٹر رضوانہ اکرام نے پڑھایا۔ انھوں نے کمپنی سے وفاداری کی عجیب کہانی سنائی۔ Diakin جاپانی کمپنی ہے جو ہوم اپلائنسز بناتی ہے۔ اس کے مینیجر سے انھوں نے پوچھا: آپ کے ہاں ''برن آؤٹ ریٹ'' کیا ہے؟ اسے سمجھ نہیں آئی پھر پوچھا: الفاظ بدل کر سوال کیا، ساتویں آٹھویں سوال پر جواب ملا کہ آخری آدمی جس نے کمپنی چھوڑی۔ اکیس سال پہلے اپنی بیماری کے باعث رخصت ہوا۔ ہمارے ہاں لوگ کمپنیاں چھوڑ کر نہیں جاتے۔

جاپان نے سکس سگما (6-sigma) کا تصور دیا۔ یہ صنعتی ترقی میں ایک پوری سائنس مانی جاتی ہے۔ اس کے کورس الگ سے کرائے جاتے ہیں۔

Kiazan کے جاپانی تصور نے دنیائے صنعت کو ہی بدل کر رکھ دیا۔ یہ کوالٹی کنٹرول کے چودہ نکات ہیں اور اب دنیا میں کوالٹی کا سب سے بڑا ایوارڈ بھی اسی نام سے دیا جاتا ہے۔

جاپانی صنعت کاروں اور صنعتی طور پر شہ دماغوں کی زندگی کو لیڈر شپ کے دوسرے بڑے ماڈل کے طور پر مان لیا گیا۔ جاپانی کمپنیوں میں کام کرنے والے مینیجرز امریکا جا کر سب سے مہنگے ٹھہرے۔ کام کرنے کے انداز مثال بنے۔ یہاں تک کہ دنیا میں مینیجمنٹ کے گرو پیٹر ڈرکر (Peter Drucken) جاپان جا کر رہے اور پھر لکھا کہ میں نے نئی گاڑی لی اور ایک دور افتادہ جگہ پر رہائش اختیار کر کے لکھنے پڑھنے کا کام کرنے لگا۔ ایک ماہ بعد فون آیا کہ آپ کی گاڑی کی ٹیوننگ ڈیو ہے۔ ہماری کمپنی کی کوئی کار لے لیجیے۔ ٹیوننگ کے بعد کار کی واپسی تک وہ آپ کے زیر استعمال رہے گی۔ پیٹر ڈرکر نے لکھا میں نے دنیا کی مہنگی ترین گاڑی کا نام مذاق سے لے لیا۔ اگلے روز وہ میرے دروازے پر کھڑی تھی۔ اسی کمپنی کی طرف سے انھیں کچھ عرصے بعد شادی کی مبارک باد کا فون آیا، گلدستہ آیا۔ انھوں نے لکھا، ایسی سروس میں کوئی جاپان کا کیسے مقابلہ کرے گا؟

جاپان نے اپنی مصنوعات میں جدت پیدا کی انھیں قابل اعتماد، دیرپا بنایا اور یوں معیار کا دوسرا نام کہلایا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہاں سیاسی حالات میں عدم استحکام کے باوجود حکومتی سطح پر بار بار تبدیلیوں اور پارلیمنٹ میں سخت الفاظ کے تبادلے سے بڑھ کر ہاتھا پائی اور بار بار کے استعفے بھی ملک کی صنعتی، سماجی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے۔

جاپان کے کاروباری افراد اور اداروں نے چین کا رخ کیا تو وہاں کے کلچر اور مزاج میں بھی دخیل ہو گئے۔ ماضی کی تلخیوں، کچھ جزیروں کے جھگڑے اور جنگ عظیم دوم سے قبل جاپانی افواج کے مظالم کو یاد کرنے اور کرانے کے لیے جب جب چین میں مظاہرے ہوئے تو اہل جاپان نے خاموشی سادھ لی۔ وہ اپنا ہدف نہیں بھولتے۔ مظاہروں اور بیانات پر ان کی طرف سے صرف یہی ردعمل آیا کہ ہمارے چینی دوست کبھی کبھی

ہمارا باز و مروڑ کر ماضی یاد دلاتے ہیں۔

(We know our Chinese friends have their own way of twisting our arm)

آیئے کیمونو، سومو پہلوانوں، خوب صورت محنتی لڑکیوں اور اسمارٹ جاپانی تعلیم یافتہ نوجوانوں سے ملتے ہیں جو اپنی اپنی قسمت بنانے کی دھن میں مست ہیں۔ جہاں حیرتوں کا ایک جہان آپ کا منتظر ہے۔

جاپانیوں کا مثبت انداز فکر

جاپانی قوم اپنے بچوں کی تربیت کے حوالے سے بہت ہی حساس ہے۔ شاید ہی کبھی کسی نے جاپانی والدین کو اپنے بچوں پر غراتے، ڈانٹتے یا مارتے دیکھا ہو۔ ان کی محبت اور بچوں پر توجہ کے حوالے سے جو رویے پائے جاتے ہیں، وہ دنیا بھر سے نرالے ہیں اور اپنا خاص پس منظر رکھتے ہیں۔ بچوں کی تربیت کا سب سے نمایاں انداز ''شی چیگوساں'' کا تہوار ہے۔ جو گذشتہ چار سو سال سے پندرہ نومبر کو منایا جا رہا ہے۔

جاپانی عقائد کے مطابق بچے سات برس کی عمر تک خدائی تحفہ ہوتے ہیں۔ جنھیں انتہائی احتیاط، توجہ اور محبّت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سات برس تک بچوں کی ناز برداری اور نگہداشت کا عمل مکمل احتیاط اور توازن سے جاری رہتا ہے۔ تین سال کی عمر میں پہلی بار بچوں کے بال بڑوں کی طرز پر کاٹے جاتے ہیں۔ سات برس کا ہونے پر وہ پہلی بار بڑوں کی طرح ''اوبی اور کیمونو'' جیسے روائتی جاپانی لباس پہنتے ہیں۔ انھیں چاکلیٹ اور کھلونوں کی صورت میں ڈھیروں تحائف ملتے ہیں۔ خاندان بھر کے افراد اور دوستوں کو اس روز کھانے پر بلایا جاتا ہے۔ اس روز جاپان بھر میں ہر طرف سجی ہوئی دکانیں اور کیمونو کا کامایں ملبوس بچے پرندوں کی طرح ادھر سے ادھر اڑتے پھرتے دیکھائی دیتے ہیں۔ روایت پسند جاپانی بچوں کو گود میں اٹھا کر عبادت گاہوں میں جاتے اور ان کی آئندہ کی خوشحال زندگی کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔

جاپان میں سب اچھا نہیں ہے

معاشرتی طور پر ہر ملک اور معاشرہ کئی طرح کے مسائل کا سامنا کرتا ہے۔ رشوت انہی میں سے ایک ہے۔ جو لوگ اپنے جائز اور ناجائز کام نکلوانے کے لیے دیتے ہیں۔ دنیا بھر میں ناپسندیدہ سمجھے جانے والے اس کام کو اہل جاپان نے ایک نیا رخ دے دیا ہے۔ بڑی چالاکی کے ساتھ اس بُرے عمل کو ایک کھیل کا روپ دے دیا گیا ہے۔ اس کھیل کے قوانین بالکل مختلف ہیں۔ یہاں جیتنے والا ہار جاتا ہے اور ہارنے والا جیت جاتا ہے۔ یہ کھیل کاروباری ہی نہیں سیاسی حلقوں میں بھی بڑی باقاعدگی سے کھیلا جاتا ہے۔ تاش کے کھیل 'رمی' کے اصولوں کے قریب تر اس کھیل کا نام ہے ''ماہ جونگ'' (Mahjong)۔ اسے کھلانے کے لیے بڑی بڑی کاروباری شخصیات اور اعلیٰ سرکاری اہل کاروں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس کا اہتمام نجی رہائش گاہوں یا پُرتعیش آرام گاہوں اور کلبوں میں کیا جاتا ہے۔ جہاں افسران کو کھیل کر ہارنے والوں کے ساتھ جوڑا جاتا ہے اور ہارنے والا اتنی ہی رقم ہارتا ہے جو جیتنے والے کے سٹیٹس اور مقام و مرتبے کے مطابق ہوتی ہے۔ یہی عمل کیوروئی کیری (Kuroi-Kiri) کہلاتا ہے۔

14 کروڑ میشی روزانہ، ایک حیران کر دینے والی روایت

جب جب ہمارے کسی دوست کو جاپان جانے کا موقع ملا اس نے ایک حیران کن بات ضرور بتائی۔ اسے روایت کہیے، تہذیب کہیے، ادا سمجھیے یا بزنس کرتے

ہوئے دوسرے کے دل میں اترنے کا طریقہ۔ بزنس کارڈ یا تعارفی کارڈ تو ہمارے ہاں بھی ہر چھوٹے بڑے شہر اور کاروبار میں استعمال ہوتا ہے لیکن جاپان میں اسے ایک تقدس کا مرتبہ حاصل ہے۔ بزنس کارڈ میشی کہلاتا ہے۔ جاپان میں اس کو منی ریزیومے (Mini Resume) سمجھا جاتا ہے۔ یہ ملنے والے کے کام کی درجہ بندی میں مدد دیتا ہے۔ کارڈوں کا تبادلہ اتنا ہی اہم ہے جتنا خود بزنس۔ ملاقات شروع ہونے پر فوراً گفتگو بزنس پر نہیں چلی جاتی۔ کارڈز کا تبادلہ بہت دلچسپ انداز میں ہوتا ہے اور بالعموم جب تک ملاقات جاری رہے کارڈ ہاتھ میں رہتا ہے اور اسے مسلسل پڑھا اور دیکھا جاتا رہتا ہے۔ میشی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ روزانہ 12 سے 14 ملین کارڈز کا تبادلہ ہوتا ہے اور تقریباً 5 بلین کارڈز سالانہ کی بنیاد پر گردش کرتے ہیں۔ بزنس کارڈ کے بنا کسی سے ملنے جانا ایک ایسی انہونی بات ہے جیسے کوئی فوجی بغیر ہتھیاروں کے محاذ جنگ پر جا نکلے۔

کارڈ لیتے دیتے وقت اس قدر تعظیم کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ دونوں ہی تقریباً رکوع میں چلے جاتے ہیں۔ میشی کو اگر کوئی فوراً جیب میں ڈال لے تو یہ بدتہذیبی ہی نہیں، بدتمیزی کہلاتی ہے۔!

جاپان میں شادیاں ''میائی کیکون'' کی روایت

بہت سے جاپانی اگرچہ اپنے روایتی مزاج کے محافظ ہیں تو نئی نسل میں تبدیلی بھی دیکھی جا رہی ہے۔ مغربی تہذیب نے کسی نہ کسی حد تک نئی نسل کے ذہنوں تک رسائی پالی ہے۔

''میائی کیکون'' کو ہمارے ہاں کی ارینجڈ میرج ہی سمجھیے۔ دولہا دلہن اپنے والدین کے فیصلوں کو خاموشی اور خوشی سے مان لیتے ہیں۔ قریبی عزیزوں کا تعارف ہوتا ہے ایک دوسرے کی خاندانی نجابت اور شرافت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ تعلیم، سماجی مرتبے میں توازن کو دیکھا جاتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس دوران ضروری نہیں کہ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھ بھی پائیں۔ اکثر پسند جاننے کے لئے تصویر سے ہی کام چلا لیا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے بیگم اختر ریاض الدین نے لکھا تھا ''کہ ایک جاپانی دلھن پسند کرنے میں اتنی دیر نہیں لگاتا جتنی گلدان پسند کرنے میں لگاتا ہے۔''

بے بسی سے ہاتھ ملتے والدین

آج نئی نسل ''میائی کیکون'' سے بغاوت پر آمادہ نظر آتی ہے، سماجی اقدار اور اخلاقی اصولوں کی پامالی کی جو رفتار نظر آ رہی ہے وہ خطرے کے نشان کو چھو چکی ہے۔ روایت کی پاسداری سے بغاوت نے جو رخ اختیار کیا ہے وہ وقتی لذت اور جنسی تلذّذ کا ہے، رشتہ بنانے اور نبھانے کا نہیں۔ خاندان کا ادارہ داؤ پر لگ گیا ہے۔ فرد کی آزادی نے ایسے فیصلے کرنے کی آزادی کی راہ دکھائی ہے جو کبھی سوچے بھی نہ جا سکتے تھے۔ شہروں میں Love Hotels ایک وبا کی طرح پھوٹ پڑے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی ہمیشہ سے یہ بدصورتی رہی ہے کہ وہ آسانی سے اور زیادہ منافع کے لئے ہر اچھی رسم، رواج، تہذیب، روایت کو قربان کرنے میں پہل کرتا ہے۔ یہ ہوٹل کیا ہیں؟ بے راہ روی کا گڑھ سمجھیے۔ کچھ لوگ پیسے بنا رہے ہیں، گھنٹوں کے حساب سے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو کمرے دے کر۔ جاپانی والدین اپنی اولادوں کی بے راہ روی کو سڑک پر سرپٹ بھاگتے دیکھ کر بے بسی سے ہاتھ ملتے نظر آتے ہیں۔

سرمایہ دار وقتی اور لمحاتی خوشی کے چند پل دینے

کے نام پر کیا کچھ چھین لیتا ہے؟ یہ گنوانے والوں کو بھی بہت دیر بعد سمجھ آتا ہے۔

کوبان یا پولیس چوکی

جب کسی کی کوئی چیز گم ہوجائے، تو وہ پولیس کو اطلاع دیتا ہے۔ جبکہ اکثر جاپانی باشندے چیز ملنے پر اسے پولیس تک پہنچانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس طرح مالک کو گمشدہ چیز ملنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ جاپان میں چھوٹی پولیس چوکیاں ہر جگہ پائی جاتی ہیں، جنہیں کوبان کہا جاتا ہے۔ یہ نظام ہر علاقے کی حفاظت کے نکتہ نظر سے کوئی ایک سو برس قبل ٹوکیو میں قائم کیا گیا تھا، جسے بعد میں ملک بھر میں پھیلا دیا گیا۔ کوبان میں کام کرنے والے پولیس اہلکاروں کو عام طور پر San-omawari کہا جاتا ہے، جس کے معنی ہیں گشت کرنے والا۔ اس اصطلاح میں شہریوں اور پولیس کی قربت کا ایک احساس پایا جاتا ہے۔ گشت کے علاوہ، کسی وقوعے یا حادثے کی اطلاع ملنے پر فوری طور پر وہاں پہنچنا، بچوں یا راستہ معلوم کرنے والوں کی مدد کرنا وغیرہ بھی ان کے فرائض میں شامل ہیں۔ سنا ہے اب تک کسی نے اچھی روایات کے چوری ہونے کی رپورٹ درج نہیں کروائی۔

ذاتی مہر کا استعمال

جاپان کی ثقافت کا غیر ملکیوں کے لیے ایک حیرت ناک پہلو ذاتی مہر کا استعمال ہے، جسے جاپانی میں Inkan یا Hanko کہا جاتا ہے۔ بینک میں اکاؤنٹ کھولنے، یا مکان کرائے پر لیتے وقت معاہدہ کرنے، جیسے کاموں میں، دستخط کی بجائے ذاتی مہر استعمال ہوتی ہے۔ یہ لکڑی، پتھر یا پلاسٹک سے بنی ہوتی ہے، اور عام طور پر اس میں خاندانی نام کھدا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ کے پاس مہر نہیں ہے تو بھی فکر کی کوئی بات نہیں۔ بعض بڑے جاپانی بینک، اکاؤنٹ کھولنے کے لیے مہر کی بجائے دستخط کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔

اہم قانونی دستاویزات کے لیے باضابطہ طور پر رجسٹرڈ مہر استعمال ہوتی ہے۔ جبکہ پارسل وصول کرنے وغیرہ جیسے کاموں کے لیے غیر رجسٹرڈ عام مہر استعمال کی جاسکتی ہے۔ ساتو، سوزوکی، تاکاہاشی جیسے جاپان میں بہت زیادہ عام خاندانی ناموں کی مہریں تو دکانوں سے تیار بھی مل جاتی ہیں۔ آپ اپنے مکمل نام، نام کے کچھ حصے، یا عام پکارے جانے والے نام سے بھی آرڈر پر اپنی مہر بنوا سکتے ہیں۔

چار حرفی سلوگنز کی مقبولیت

جاپانی کمپنیاں اکثر اپنے اصول یا نظریے کو چار جاپانی حروف پر مشتمل مقولے یا نعرے کے ذریعے ظاہر کرتی ہیں۔ کوؤنگ کی کمپنی کا نعرہ seii-seishin ہے جس کے معنی ہیں اخلاص کے ساتھ۔ یہ خدمات کی صنعت میں اکثر استعمال ہوتا ہے۔ ایک اور نعرہ ryuko-fueki ہے، جس کے معنی ہیں ناقابل تغیر اور وقت کے ساتھ تبدیلی۔ ہائکو کے مشہور شاعر ماتسواو باشو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی شاعری میں اس اصول کا استعمال کیا۔ بظاہر ناقابل تغیر اور وقت کے ساتھ تبدیلی ایک دوسرے کے متضاد الفاظ ہیں لیکن ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اس کے معنی ہیں وقت اور دور کے لحاظ سے نیا پیراہن، لیکن بنیاد میں کوئی تبدیلی نہیں۔

اسی طرح کا ایک چار حرفی مقولہ یا نعرہ جو جاپانیوں میں بہت مقبول ہے وہ ہے ichie-ichigo۔ یہ مقولے کا آغاز چائے کی روایتی تقریب سے ہوا تھا اور اس کے معنی ہیں ''زندگی میں ایک بار ہونے والا تجربہ''۔ اس سے مراد یہ ہے کہ زندگی کے ہر خوبصورت لمحے کو اہمیت دی جائے اور ہر گاہک کے ساتھ اچھے انداز سے پیش آیا جائے کیونکہ گزرا ہوا لمحہ دوبارہ واپس نہیں آئے گا۔

معذرت اور معافی کا استعمال

غلطی کسی سے بھی ہوسکتی ہے۔ تاہم غلطی کی تاویل پیش کرنے سے مخاطب پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔ اچھا تاثر پیدا کرنے کے لیے اچھے انداز میں معذرت ضروری ہے۔

کاروباری دنیا میں معذرت کے لیے gozaimasen moshiwake, sumimasen استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹرین کے حادثے وغیرہ یا کسی اور وجہ سے ملاقات کے مقررہ وقت پر پہنچنے میں تاخیر کی صورت میں سب سے پہلا کام معذرت ہے۔

چاہے دیر ہونے میں آپ کا قصور نہ بھی ہو۔ دیر کی وجہ کچھ بھی ہو، آپ کے مقررہ وقت پر نہ پہنچنے کے باعث دوسرے شخص کو انتظار کرنا پڑا۔ اس کے لیے معذرت بہت ضروری ہے۔ دل سے معذرت کرنے کے بعد کام کی بہتری کے ذریعے اپنا کھویا ہوا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کہیں کار کا حادثہ ہو جائے تو آپ کو حیرت ہو گی کہ گاڑی سے اتر کر لڑنے یا گالیاں دینے اور پولیس میں اپنے جاننے والوں کو فون کرنے کی بجائے دونوں جھکتے ہیں۔ سوری کرتے ہیں، اپنا اپنا قصور مانتے ہیں کارڈز کا تبادلہ کرتے اور اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ بعد میں پولیس خود ہی غلطی کرنے والے کی انشورنس کمپنی سے رابطہ کر کے فیصلہ کرا دیتی ہے۔

جاپان کے سی پیراڈائز

یوکوہا، ہاگ میں واقع سی پیراڈائز ایسی جگہ ہے جہاں جا کر واپس آنے کو دل نہیں

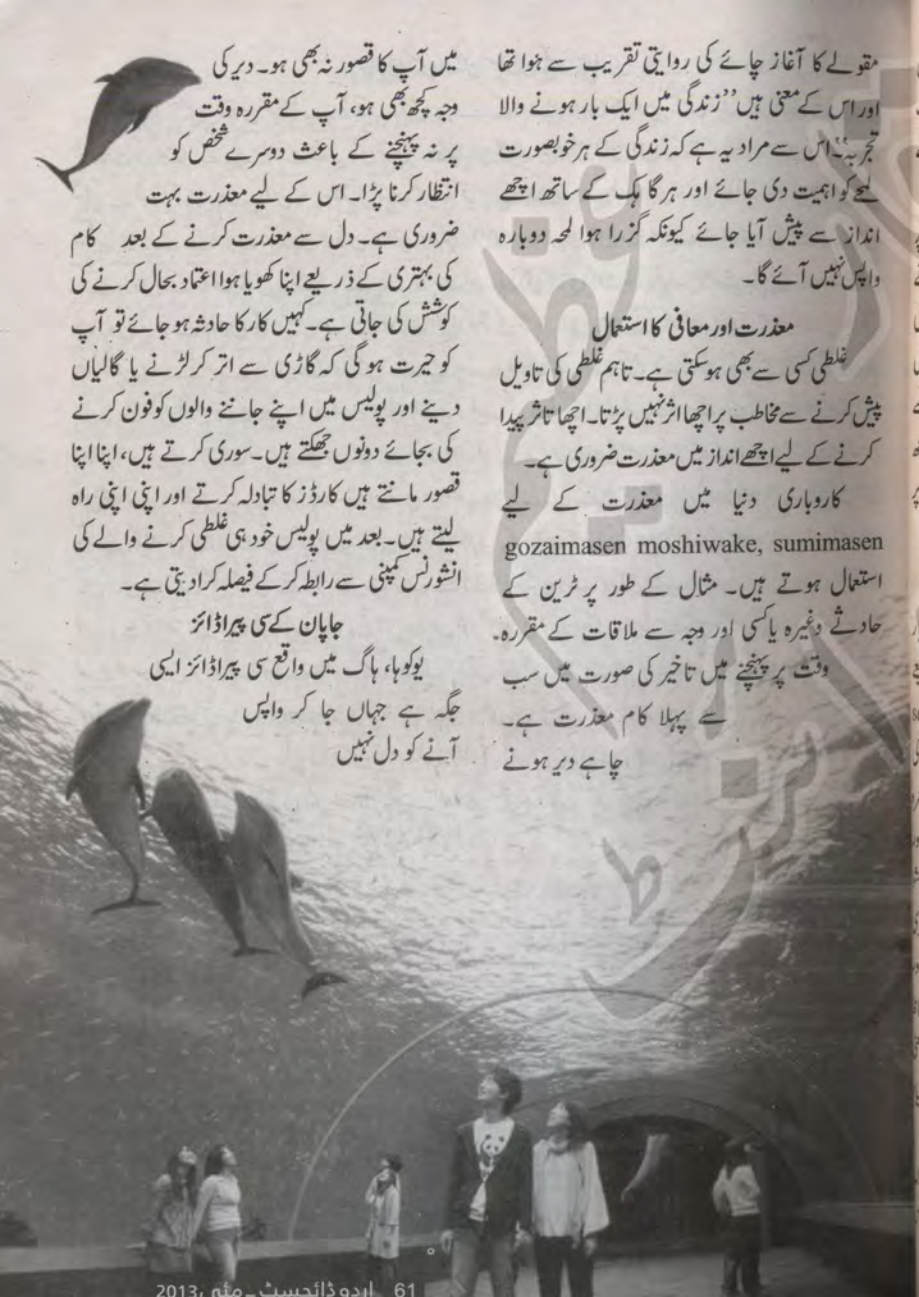

جاپان میں اولین مسلمان کیسے پہنچا

1889ء میں سلطان عبدالحمید نے ایک بحری بیڑے کے ذریعے 609 افراد پر مشتمل ایک خیر سگالی وفد سفارتی تعلقات کی ابتدا کے لیے سلطنت عثمانیہ یعنی ترکی سے جاپان بھیجا۔ ایڈمرل عثمان اس کے قائد تھے۔ جاپان کے شہنشاہ میجی نے خود یوکوہاما پورٹ پر اس کا استقبال کیا۔ تین ماہ قیام کے بعد جب یہ وفد واپس جا رہا تھا تو رات کی تاریکی میں اوشیما جزیرے کے قریب سمندری طوفان کا شکار ہو گیا۔ 609 مسافروں میں سے صرف 69 زندہ بچ سکے۔ زندہ بچ رہنے والوں کے ساتھ مقامی باشندوں نے جذبہ خدمت اور ہمدردی کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ حکومت جاپان سے دو خصوصی جہازوں پر مرنے والوں کی لاشیں اور بچے ہوئے افراد کو ترکی بھیجا۔ اس حادثے کے بعد ایک نوجوان رائٹر اور ٹیچر طوراجیرو یمادا نے مرنے والوں کے لواحقین کے لیے پورے جاپان میں امداد جمع کرنے کی ایک مہم چلائی۔ وزارت خارجہ نے اس قدم کو بے حد سراہا اور اسے ذاتی طور پر ریلیف کی یہ رقم ترکی لے جانے کے لیے بھجوانے کا فیصلہ کیا۔ 1892ء میں طوراجیرو یمادا سمندری راستے سے روانہ ہوا۔ ترکی کی حکومت اور عوام نے اس کے جذبے کو بہت سراہا اور اس کا خوب استقبال کیا۔ چند روز بعد سلطان ترکی عبدالحمید دوم نے اس کے اعزاز میں پارٹی دی اور اس سے ترکی میں دو سال قیام کی درخواست کی تا کہ اس دوران وہ ترکی بحریہ کے سات افسران کو جاپانی زبان سکھا دے۔ ان افسروں میں کمال اتاترک بھی شامل تھے۔ (کمال اتاترک نے 1931ء میں جب طوراجیرو ایک بار ترکی گیا تو دوران ملاقات اس بات کا اعتراف کیا) طوراجیرو یمادا نے اس دوران خود بھی ترکی زبان سیکھی۔ اسلام کا علم حاصل کیا۔ جب وہ جاپان اپنے گھر والوں کو خط لکھتا تو اپنے نام کے ساتھ ایک اضافی لفظ بھی لکھتا جسے گھر والے نہ سمجھ پاتے۔ یہ لفظ تھا شنجیتسو Shingestsu یعنی چاند (Crescent) یہ اس بات کی دلیل مانی گئی کہ اس نے اس دوران اسلام قبول کر لیا تھا۔

اس نے کل ملا کر بیس سال ترکی میں قیام کیا۔ 1893ء میں نیشنل ڈائٹ لائبریری جاپان کے ڈائریکٹر یوشی نویو کاواکو نے ''ایک جاپانی کا ترکی میں اسلام سیکھنا'' لکھا جو ''میجی کرونیکل'' میں چھپا۔ اسی نوجوان کو بعد میں عبدالخلیل کا نام دیا گیا یہ ایک شریف، عزت دار اور اعلیٰ خاندان کا فرد تھا۔

طوراجیرو یمادا کا بیٹا کاما کورا شہر میں ہیڈ ماسٹر ہے۔ وہ بھی ترکی اور جاپان کی دوستی کے لیے کام کرتا ہے۔ اسی نے بتایا کہ اس کے والد حج پر بھی گئے تھے۔ یوں جاپان میں پہلے مسلمان کی تاریخ ایک صدی پرانی ہے۔

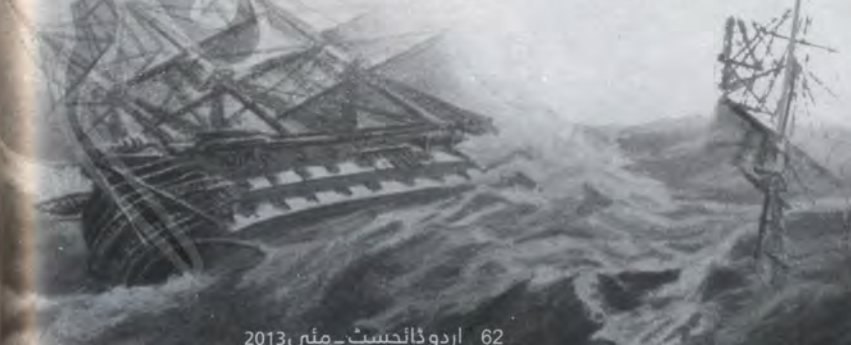

چاہتا۔ خوب صورت مناظر سے بھرے اس جزیرے پر جانے کی ٹکٹ نہیں ہے مگر وہاں موجود ایکوا میوزیم اور مختلف تفریحات کی الگ الگ ٹکٹ میں۔ مختلف جانور مثلاً پینگوئین، وال روسس (wal ruses)، سیل (Seals)، قطبی ریچھ (Polar bears) وغیرہ بڑے بڑے کمروں میں اپنے اصلی اور قدرتی ماحول میں رکھے گئے ہیں۔ پینگوئن سمندر کے کنارے چٹانوں اور برفیلے پانی میں چہل قدمی کرتے نظر آتے ہیں۔ سیکڑوں اقسام کی مچھلیاں اور ڈولفن بھی وہاں موجود آپ کا دل لبھاتی ہیں۔

پانی کے نیچے موجود aqua tubes میں ایک خودکار سیڑھی جاتی ہے جو تین منزلیں نیچے تک لے جاتی ہے۔ آس پاس موجود سمندری مخلوق کے ساتھ نظریں ملاتے ہوئے یہ سفر بہت یادگار ہوتا ہے۔

تین مقدس اشیا

جاپان میں قدیم دور سے تلوار، آئینہ اور جواہرات کو شاہی علامات کی اہمیت حاصل ہے۔ انھیں تین مقدس اشیا بھی کہا جاتا ہے۔ 1950 کی دہائی میں جب برقی اشیا زیادہ عام نہیں ہوئی تھیں۔ بلیک اینڈ وہائٹ ٹی وی، فریج اور واشنگ مشین کو بھی تین مقدس اشیا کہا جاتا تھا۔ کیونکہ ہر شخص ان کے حصول کی خواہش رکھتا تھا۔ تاہم بعد کے دور میں یہ اشیا بالکل عام ہو گئیں اور جاپانی عوام کی زندگی میں بڑی تبدیلیاں لائیں۔

آج کے دور میں برقی اشیا ہماری زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ اب تین قیمتی ترین اشیا کیا ہو سکتی ہیں؟ بعض کے خیال میں فلیٹ اسکرین کا ٹی وی، یا ڈیجیٹل کیمرہ۔ لیکن ہر روز نت نئی اشیا بازار میں آ رہی ہیں۔ 21 ویں صدی کی تین مقدس اشیا آپ کے خیال میں کیا ہو سکتی ہیں؟

موزوں شریک زندگی کے لیے ضروری شرائط

ہر ملک یا معاشرے میں موزوں شریک زندگی کی شرائط مختلف ہوتی ہیں۔ جاپان کی ایک بیمہ کمپنی کے 25 سے 44 سال کی خواتین سے کیے گئے ایک سروے کے نتائج سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں 3K مرد پسند ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انھیں ایسے مرد پسند ہیں جن میں K سے شروع ہونے والی تین خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہ تین خصوصیات ہیں: Kachikan یعنی 'اقدار کا احساس'، kankaku-kinsen یعنی 'پیسے کی سمجھ' اور anteinokoyo یعنی مستقل روزگار۔ 80 کی دہائی کے جاپانی معیشت کے عروج کے دنوں میں مناسب شریک زندگی کے لیے تین دیگر الفاظ مقبول تھے۔ shincho-ko یعنی 'بلند قد'، gakureki-ko یعنی اعلیٰ تعلیم اور shunyu-ko یعنی اچھی آمدنی۔ گویا وقت کے ساتھ شریک زندگی کے بارے میں لوگوں کی ترجیحات میں تبدیلی آئی ہے۔

جاپانی عورتیں۔ حکم ماننے اور خاندان چلانے والی

جاپانی عورتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وفاداری کی ایک جیتی جاگتی مثال ہیں۔ مردوں کا عمر بھر ساتھ نبھاتی ہیں۔ وہ سختی بھی کریں (جاپانی مرد کبھی کبھی گھر میں ہاتھ بھی اٹھاتے ہیں اور غصہ بھی کرتے ہیں) تو خاموشی سے سہتی ہیں۔ ان کا حکم مانتی ہیں، خاندان کو بنانے، سنوارنے اور سنبھالنے میں جاپانی عورت کا بہت کردار ہے۔ معاشی دوڑ میں وہ شریک ہونے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ جگہ جگہ اس کا استعمال بھی جاری ہے مگر اس کی کوششوں میں کمی نہیں آئی۔ اولمپکس

64 میں ایک پاکستانی سائیکلسٹ جو چاچا شفیع کے نام سے معروف تھے، جاپان گئے تو ایک مقامی لڑکی سے تعارف ہوا۔ گیمز ختم ہوگئیں، وہ واپس آ گئے۔ لڑکی بھی ان کے پیچھے کراچی آ گئی۔ اس نے آکر دیکھا کہ شفیع ریلوے میں مزدور ہے اور اس کی زندگی کی گاڑی بہت مشکل سے چل رہی ہے۔ وہ واپس چلی گئی۔ کچھ عرصے بعد پھر واپس آئی تو پتا چلا کہ اس عرصے میں اس نے سنگاپور جا کر ہیوٹیشن کی تربیت لی۔ اب اس نے کراچی میں kuko کے نام سے پہلا بیوٹی پارلر کھولا۔ وہ عمر بھر پوری وفاداری کے ساتھ شفیع کی زندگی کی ساتھی رہی۔ جب اسے چاچا کا مطلب پتا چلا تو پھر شفیع (مرحوم) نے ملنے جلنے والوں کو آہستہ آہستہ چاچا کہنے سے بھی روک دیا۔ دونوں نے بہت اچھی زندگی گزاری۔

جاپان میں لائبریریوں کی صورت حال

جاپان میں لائبریریوں کی صورت حال کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آپ اپنا شناختی کارڈ دکھا کر اپنے گھر کے قریب کی کسی لائبریری کا مفت میں رکن بن کر رکنیت کارڈ حاصل کر سکتے ہیں۔ شہر کی ساری لائبریریوں سے ایک وقت میں سات کتابیں پندرہ دن کے لیے لے جا سکتے ہیں اور جتنی چاہے ان کی مدت میں توسیع کراتے رہیے۔ ان لائبریریوں میں یہ اصول ہے کہ انھوں نے کتابیں شائع کرنے والی ہر کمپنی کو یہ آرڈر دے رکھا ہے کہ ہر نئی کتاب کے پانچ دس نسخے انھیں فروخت کیے جائیں، اس طرح ہر شہر کی بلدیہ کی لائبریریوں کے علاوہ ہر اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی لائبریریاں ہوتی ہیں جو ہر نئی کتاب کے چند نسخے منگوا کر ضرور رکھتی ہیں۔

یوں پورے جاپان میں ہزاروں لائبریریاں ہیں جو بھی نئی کتاب شائع ہوتی ہے وہ ہزاروں دکانوں پر فروخت ہونے کے علاوہ ہزاروں لائبریریوں کو بھی فروخت کی جاتی ہے۔ گویا ہر کتاب شائع کرنے والی کمپنی کی لاگت اور نفع پہلے ہفتہ ہی نکل آتا ہے۔ اس لیے جاپان کے علاوہ یورپ اور امریکا میں بھی اخبارات و رسائل میں اشتہارات چھپتے ہیں کہ ہمیں مختلف موضوعات پر چھاپنے کے لیے کتابیں لکھ کر دیں۔ ہزاروں کی تعداد میں کتابوں کے چھپنے چھپانے کا یہ سلسلہ جاپان جیسے ملک میں یا دیگر ترقی یافتہ ممالک میں اتنے بڑے پیمانے پر اسی لیے چل رہا ہے کہ ان ممالک میں تعلیم ان کی اپنی قومی زبان میں ہوتی ہے اور ہر شخص پڑھا لکھا ہے جو جدید اور تازہ ترین معلومات اور دریافتوں کو جاننے کے لیے فطری طور پر ایک علمی پیاس رکھتا ہے۔ اس طرح کی پیاس کا پیدا ہونا اور اس کا بجھانا، اسی وقت ممکن ہے جب کہ ساری تعلیم کسی ملک کی قومی زبان میں ہو۔

جاپان کے تعلیمی نظام کے قومی زبان میں ہونے کے ملک گیر جو اثرات ہوئے ہیں اس سے ہر شخص ملک کی تعمیر میں اپنا حصہ بٹانے کے قابل ہو گیا ہے اور اب ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے والے کروڑوں عوام ہیں نہ کہ ہماری طرح کا کوئی محدود طبقہ جس کے دل و دماغ کی تعمیر کسی غیر ملکی ثقافت کی غیر ملکی زبان میں ہوئی ہے۔ جس کا پاکستان کے عوام کے ذہن و سوچ و طرز و فکر سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔

سچا واقعہ

بیٹے نے Google سے ماں کو ڈھونڈ نکالا

گھاس کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے والے ایک نوجوان کا ناقابل یقین واقعہ۔ بھوک اور نقاہت برسوں پہلے اسے اپنے پیاروں سے 1500 کلومیٹر دور لے گئی تھی۔

شیر عالم محمود

جب چھ سالہ ساروو (سرور) جاگا تو وہ سخت چوبی نشست پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ وہ خاصی دیر سے اسی حالت میں سویا ہوا تھا، ہچکولے کھاتی اور شور مچاتی ریل تیزی سے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ یہ شور ساروو کے لیے نیا نہیں تھا، وہ اکثر اپنے بھائی گڈو کے ساتھ ریل میں سفر کرتا تھا۔ لیکن اب وہ کہاں ہے؟

ڈبے میں اکا دکا مسافر ہی سوار تھے۔ اس نے باہر نظر ڈالی، اسے اجنبی مناظر نظر آئے جو ساروو نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پھر ساروو نے یہ سوچ کر خود کو دلاسہ دیا کہ گڈو کسی ڈبے میں نشستوں کے نیچے جھانک رہا ہو گا تاکہ گرے سکّے اٹھا سکے۔ مگر طویل عرصہ گزر گیا وہ

واپس نہ آیا۔

ساروکے وہم وگمان میں نہ تھا کہ ریل کا یہ سفر نہ صرف اس کی زندگی کا رخ بدل ڈالے گا، بلکہ ایسے سلسلہ واقعات جنم دے گا جو برسوں لاینحل رہیں گے۔ اسی سفر نے اسے اپنے خاندان ہی نہیں ملک سے کاٹ ڈالا۔ مگر تب اُسے صرف یہی فکر ستا رہی تھی کہ بھائی مل جائے۔ وہ اُسے پکارتا ڈبوں میں بے تابی سے ڈھونڈنے لگا۔

فاطمہ منشی کے کام کے بعد گھر پہنچی، تو دونوں بیٹے غائب تھے۔ انھیں تو اس سے پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ پہلے اُسے غصہ آیا، پھر تشویش ہونے لگی۔

فاطمہ بچوں ہی کے لیے زندہ تھی، ورنہ اس کے پاس جینے کا کوئی مقصد نہ تھا۔ ہندو کسانوں کے گھر جنم لیا مگر دس سال کی تھی کہ یکے بعد دیگرے ماں باپ رخصت ہوئے۔ چچا نے یتیم کو گھر تو رکھ لیا، مگر بچپن ہی میں اس سے کام کرانے لگا۔ سولہ سال کی تھی کہ ایک تو تعمیر عمارت میں کام کرنے لگی۔ وہاں اُسے مسلمان مستری سے محبت ہوگئی اور دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔

وہ اسلام لے آئی اور شوہر کے ساتھ مدھیہ پردیش کے شہر، خنڈوہ میں مقیم ہوگئی۔ آنے والے برسوں میں ان کے ہاں تین بچے تولد ہوئے۔ فاطمہ کا سر فخر سے بلند ہوگیا۔ اس کی واحد تمنا یہ تھی کہ تینوں جب بڑے ہوں تو بڑے افسر بنیں اور شاندار گھروں میں رہیں۔ پھر وہ روزانہ اُسے دس دس روپے دیا کریں۔۔۔۔ تاکہ اُسے دوسروں کے گھر صفائی نہ کرنا پڑے۔ اور اسے پوتے پوتیوں کو کھلانے کا وقت مل جائے۔

لیکن شوہر بے وفا نکلا اور کسی دوسری عورت کی زلفوں کا اسیر ہوگیا۔ آخر ایک دن دونوں کی خوب لڑائی ہوئی۔ اور شوہر نے اسے طلاق دے ڈالی۔ چونکہ تب وہ حاملہ تھی لہٰذا طلاق زچگی کے بعد ہی موثر ہوئی۔ اس بار فاطمہ نے ایک لڑکی کو جنم دیا۔

چار بچوں کے منہ میں نوالے ڈالنے کی خاطر فاطمہ کو دوبارہ کام کاج کرنا پڑا۔ مہینے کے آخری دنوں میں جب رقم نہ بچتی، تو آٹھ سالہ گڈو، بھائی کو لیے بھیک مانگنے نکل جاتا۔ وہ بسوں اور ریلوں میں گداگری کرتے اور جو دو چار پیسے ملتے، گھر لے آتے۔ کبھی کبھی انہیں صرف پانی پی کر پیٹ بھرنا پڑتا۔ تب ماں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ پھر وہ خود کو دلاسہ دیتے ہوئے سوچتی ''کم از کم میرے پاس بچے تو ہیں''۔

ساروسوچوں میں گرفتار تھا۔ اُسے یاد تھا کہ وہ اور گڈو اپنے علاقے کے اسٹیشن سے لوکل ٹرین میں بیٹھے۔ جب وہ دوسرے اسٹیشن اترے، تو کمزوری کے مارے ساروپلیٹ فارم نشست پہ بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ گڈو نے اسے بتایا کہ وہ ابھی آتا ہے، اور ایک طرف چلا گیا۔

بیٹھے بیٹھے ساروعالم غنودگی میں چلا گیا۔ جب جاگا، تو ایک ریل کو آتے پایا۔ وہ یہی سمجھا کہ گڈو اس ریل میں ہوگا۔ چناں چہ وہ اس پر سوار ہوگیا۔ ریل میں اُسے نشست مل گئی۔ جیسے ہی بیٹھا، بیچارا غریب بچہ پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ریل رک گئی اور سبھی لوگ نیچے اترنے لگے۔ یہ اسٹیشن بھی ساروکے لیے اجنبی تھا۔ جی کڑا کر کے وہ باہر نکلا تو ہجوم میں پھنس کر رہ گیا۔

لوگ عجیب و غریب زبان بول رہے تھے۔ دراصل سارو کلکتہ پہنچ چکا تھا۔۔۔ خندوہ سے 1500 کلومیٹر دور واقع شہر! چھ سالہ بچے کے لیے یہ مقام ایسے ہی تھا جیسے کہ وہ مریخ پر آ پہنچا ہو۔

سارو نے لوگوں سے مدد مانگنا چاہی مگر وہ بنگالی یا انگریزی جانتے تھے۔ جبکہ سارو صرف ہندی (اردو) بول سکتا تھا۔ اُسے بس اپنا نام (سرور) آتا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کس شہر کا رہنے والا ہے۔ اُسے اپنے محلے (گنیش تلائی) کا نام معلوم تھا۔

پریشان ہو کر سارو دوسری ریل پر جا چڑھا۔ لیکن وہ لوکل ٹرین تھی، گھوم گھام کے اُسے پھر کلکتہ لے آئی۔ دوسری ریل کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، تو مجبوراً سارو شہر کی گلیوں میں آ نکلا۔ بھوکا پیاسا تھا، لوگوں سے کھانا مانگ تانگ کر پیٹ بھرا۔

رات ہوگئی اور بچے گھر نہ پہنچے، تو فاطمہ کو قدرتاً بہت تشویش ہوئی۔ اس نے پڑوسی کو ساتھ لیا اور اسٹیشن پہنچی۔ وہاں نہ ملے تو مارکیٹ میں دیکھا جہاں بچے عموماً بھیک مانگتے تھے۔ پھر فوارے گئی جہاں دونوں بھائی سستانے کے لیے لیٹتے یا کھیلتے تھے۔ کہیں ان کا نشان نہ ملا۔

فاطمہ کبھی ریل میں نہیں بیٹھی تھی، لیکن اگلے دن بیٹوں کی تلاش میں وہ پھر اسٹیشن جا پہنچی۔ وہ بذریعہ ریل اردگرد کے اسٹیشنوں پر گئی اور پولیس کو بھی اطلاع دی۔ لیکن دونوں بیٹے کہیں نظر نہ آئے۔ اس نے پھر اللہ تعالیٰ سے بھی دعائیں کیں اور ایک مقامی بزرگ سے مدد لی۔

بزرگ واقعی خدا رسیدہ اور صاحبِ کشف تھے، اس نے غمگین و پریشان ماں کو بتایا ”اب دو پھول نہیں رہے، ایک گر چکا۔ جبکہ دوسرا بہت دور جا چکا۔ اسے نہیں یاد کہ وہ کس ٹہنی سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ واپس آئے گا لیکن کئی سال بعد۔“

اُسے یقین نہیں آیا، فاطمہ کو امید تھی کہ اس کے بیٹے یہیں کہیں ہیں اور ابھی واپس آ جائیں گے۔ لیکن شام کو ایک تھانے دار اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ گڈو کی لاش لایا تھا۔ دراصل لڑکا چلتی ریل پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پاؤں پھسلنے پر گرا اور پہیوں تلے کچلا گیا۔ ماں بیٹے کی لاش دیکھتے ہی بے ہوش ہوگئی۔

سارو ایک دن آوارہ گھوم رہا تھا کہ سپاہی نے اُسے پکڑ لیا۔ وہ پھر اُسے بے گھر بچوں کے ادارے میں لے گیا۔ وہاں اُسے آرام دہ بستر، نئے کپڑے اور عمدہ کھانا ملا۔ ادارے کے اہل کاروں نے اس کا گھر ڈھونڈنے کی کوششیں کیں مگر انھیں ناکامی ہوئی۔ لہٰذا اُسے گمشدہ بچہ قرار دے دیا گیا۔

چند ماہ گزر گئے۔ ایک دن اُسے بتایا گیا کہ وہ نئے گھر جا رہا ہے۔ یہ نیا گھر آسٹریلیا نام کے ملک میں واقع تھا۔

اُدھر فاطمہ کو رہ رہ کر یہی فکر ستاتی رہتی کہ اس کا ہنستا مسکراتا سارو کہاں گیا؟ وہ اکثر ماں کے ساتھ جاتا اور اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ جب سارو صرف دو سال کا تھا تو ایک گدھے کی دولتی کا نشانہ بن گیا۔ وہ پھر آٹھ دن تک موت و حیات کی کشمکش میں رہا۔ اور ماں پاگلوں کی طرح بیٹے کی تیمارداری کرتی رہی۔ وہ اب بھی ہار ماننے کو تیار نہ تھی۔

فاطمہ نے پھر ریل پکڑ لی۔ وہ ریلوں پر سفر کر کے بھوپال اور سکندر آباد تک گئی۔ حیدر آباد دکن میں

پولیس اسٹیشنوں کا دورہ کیا۔ ممبئی کی جیلیں چھان ماریں۔ اُسے کہیں ساروکا سراغ نہ ملا۔ بس وہ کلکتہ نہ گئی، اُسے یقین تھا کہ بیٹا اتنی دور نہیں جا سکتا۔

ساروکی اگلی منزل آسٹریلوی ریاست تسمانیہ کا صدر مقام ہوبرٹ تھا۔ وہاں مقیم ایک انگریز خاندان نے اُسے لے پالک بیٹا بنا لیا تھا۔ ساروکا نیا گھر کسی محل کے مانند تھا۔ اس میں آٹھ کمرے تھے اور وسیع وعریض صحن۔ قدرتاً وہ نئے ماحول میں پہنچ کر بہت گھبرایا اور اپنے آپ میں سمٹا رہا۔ مگر اس کے نئے والدین رحم دل اور صابر ثابت ہوئے۔ ان کی محبت وشفقت نے آخر اس کی زندگی کو رواں دواں کر دیا۔ وہ اپنے نئے گھرانے میں سروبریلے کہلانے لگا۔

چند ہفتے بعد ساروا سکول جانے لگا۔ اس نے انگریزی سیکھی تو دوست بھی بنا لیے۔ یوں رفتہ رفتہ وہ نئے ماحول میں جذب ہوگیا۔ لیکن رات کو جب وہ اپنے کمرے میں تنہا سوتا، تو اُسے ماں اور گڈو یاد آتے۔ تب اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ ساروا اپنے رب سے یہی دعا مانگتا، کاش کوئی معجزہ جنم لے اور وہ اپنے پیارے خاندان سے جا ملے۔

تین ماہ مختلف ریلوں پر چکر لگا لگا کر فاطمہ تھک گئی۔ اس نے پھر ساروکی تلاش ترک کر دی۔ تاہم وہ ہر جمعرات کو مقامی بزرگ کے مزار پر جاتی، وہاں اگربتیاں جلاتی اور دعا مانگتی کہ اس کا بیٹا واپس آ جائے۔ فاطمہ کے دونوں بچے، کالو اور شکیلہ اکثر دیکھتے کہ ماں بچھڑے بیٹوں کو یاد کر کے رو رہی ہے۔

کئی سال بیت گئے اور ساروجوان ہوگیا۔ اب وہ یونیورسٹی میں ایم بی اے کر رہا تھا۔ پلوں کے نیچے سے بہت پانی بہہ چکا تھا لیکن اُسے ریل کا سفر نہیں بھولا تھا۔ اب بھی کئی سوالوں کے جواب تشنہ طلب تھے۔ اس کے ذہن میں قصبے کی دھندلی یادیں محفوظ تھیں۔ وہ فوارہ جہاں وہ بھائی کے ساتھ کھیلا تھا، وہ سڑکیں اور گلیاں جن میں وہ بھیک مانگتے تھے۔

ایک دن وہ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا، اُسے خیال آیا کیوں نہ گوگل ویو کے ذریعے اپنا گھر دیکھا جائے۔ گوگل ویو نے اُسے اپنے آسٹریلوی گھر کا خوبصورت اور صاف نظارہ دکھایا۔ تبھی اُسے خیال آیا

مقصدِ حیات

یا رب تو پورا کر دے میرا مقصدِ حیات
تاریک دن نہ ہو، روشن ہو میری رات
وہ مقصدِ حیات جو رسول ﷺ لے کے آئے
وہی مقصدِ حیات ہو میرا تادمِ وفات
میرا مقصدِ حیات ارفع ہو اس قدر
جھک جائیں جس کے سامنے تیرے یہ شش جہات
اس مقصدِ حیات کا ہر ایک ہو پہلو
روشن مثالِ خور، حاصل جسے ثبات
اسی مقصدِ حیات میں یا رب فنا میں کر دوں
جو ہیں خلافِ حق، سب اپنی خواہشات
میرا مقصدِ حیات جب ہو پورا میرے مولا
رحمت میں اپنی لے لے پھر شمعِ حیات
نئی نسلیں پھیلاتی رہیں اک جہدِ مسلسل سے
سچائی کے، انصاف کے، نیکی کے ثمرات
چلے نیک والدین کے نقشِ قدم پہ جو
اللہ کے پاس ہو گی، سب کی ملاقات
آئیں چہار جانب سے سلامیاں لیے
رحمان خوش، ملک کریں، بڑھ بڑھ کے مدارات

(انتخاب: سائرہ حمید تشنہ، فیصل آباد)

کہ اس آلے کے ذریعے وہ بھارت میں اپنا گھر بھی ڈھونڈ سکتا ہے۔

پہلے تو وہ بھارت کے نقشے پہ اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے کوئی مانوس جگہ تلاش کرنے کی سعی کرتا رہا۔ پھر اس کے ذہن میں ایک تجویز آئی۔ اس گوگل ویو کو کلکتہ ریلوے اسٹیشن پر مرتکز کیا۔ پھر دیکھا کہ وہاں سے کس کس طرف ریل پٹریاں جارہی ہیں۔ وہ پھر ہر ریل پٹری پر آنے والے ہر ریلوے اسٹیشن کا جائزہ لینے لگا۔ یہ بڑا صبر آزما اور تکلیف دہ کام تھا۔ لیکن اپنا خاندان پانے کی چاہ میں سارو نے پورے دو سال تک یہ کٹھن سرگرمی اپنائے رکھی۔ یہ دراصل گھاس کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنے کے مترادف تھا۔

اُدھر گنیش تلائی میں فاطمہ بھی مایوس نہ ہوئی۔ گو بیٹے کو بچھڑے چوبیس سال بیت چکے تھے لیکن وہ مسلسل مقامی مزار پر بیٹھے بزرگ کے پاس جاتی رہی۔ آخر ایک دن بزرگ نے اُسے خوش خبری سنائی ''تمھارا بیٹا سارو واپس آنے والا ہے۔ وہ 40 دن بعد تمھارے پاس ہوگا۔''

سارو حسب معمول ایک ریل پٹری کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اب نیا اسٹیشن آیا، تو وہ منجمد ہوگیا۔ جانی پہچانی جگہیں اس کے سامنے تھیں، اسٹیشن کا پل اور ٹینکی سارو کی یادداشت میں محفوظ تھیں۔ سارو نے اِدھر اُدھر دیکھا بھالا۔ اُسے فوارہ بھی نظر آ گیا اور آبشار بھی جس میں وہ نہایا کرتا تھا۔ خوشی اور بے چینی کے مارے اس کا دل دھڑکنے لگا۔

گوگل کے مطابق اس قصبے کا نام خندوہ (Khandwa) تھا۔ کچھ سوچ کر سارو نے یہ نام فیس بک میں لکھا اور ----- اور بوم! اس کے سامنے ''خندوہ- میرا آبائی قصبہ'' نامی ایک صفحہ آ گیا۔ یہ قصبے میں مقیم نوجوانوں نے تخلیق کیا تھا۔ 31 مارچ 2011ء کو سارو نے اس صفحے پر لکھا:

''کیا کوئی میری مدد کرسکتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ میں خندوہ کا رہنے والا ہوں۔ لیکن میں نے پچھلے 24 برس سے یہ قصبہ نہیں دیکھا۔''

دو نوجوانوں نے جواب دیئے مگر کوئی ٹھوس بات سامنے نہ آ سکی۔ تب 3 اپریل کو سارو نے یہ سوال پوسٹ کیا:

''کوئی بتا سکتا ہے کہ قصبے کے بالائی حصے میں سیدھے ہاتھ پہ آباد محلے کا کیا نام ہے؟ میرا خیال ہے، وہ جی سے شروع ہوتا ہے۔''

دوسرے دن کسی نوجوان نے جواب دیا ''گنیش تلائی''۔ اور یہ نام سارو کے ذہن میں فوراً تازہ ہوگیا۔ ماں جب لوگوں سے باتیں کرتی، تو اکثر یہ نام اس کے کان میں پڑتا تھا۔ سارو کو یقین ہوگیا کہ وہ گنیش تلائی کا رہنے والا ہے۔ لہٰذا اس نے آبائی وطن جانے کا فیصلہ کرلیا۔

12 فروری 2012ء کو خندوہ ریلوے اسٹیشن پر کلکتہ سے آنے والی ریل رکی، تو اس سے سارو برآمد ہوا۔ آخر وہ اس جگہ آ پہنچا تھا جو برسوں سے خوابوں میں آ کر اُسے تڑپاتی اور دق کرتی تھی۔

آسٹریلیا میں اس کے پیاروں نے سارو کو خبردار کیا تھا کہ وہ زیادہ امیدیں وابستہ نہ کرے۔ پھر اُسے بھی غربت اور رات کو اکثر بھوکے سونا یاد تھا۔ لیکن وہ اپنی ماں اور بہن بھائیوں سے ملنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ برا ہو یا بھلا، دیکھا جائے گا۔

اُسے چہرے اور مناظر دھندلے دھندلے یاد تھے، مگر ماحول کی خوشبوئیں اور آوازیں بالکل نہیں بدلی تھیں۔ اسی طرح پورا منظر نامہ بھی زیادہ نہیں بدلا تھا۔ وہ یادداشت کھرچ کھرچ کر ان راستوں پر چلنے لگا جہاں کبھی وہ لڑکپن میں دوڑتا بھاگتا تھا۔

آخر وہ گھومتا گھامتا اپنے گھر تک پہنچنے میں کامیاب رہا جہاں کبھی رہتا تھا۔ مگر یہ گھر تو بہت چھوٹا اور تنگ تھا۔ ساروا اس کا جائزہ لے رہا تھا کہ پڑوس والے ایک گھر سے عورت نکلی۔ اس نے ایک اجنبی نوجوان کو دیکھا، تو دیسی انگریزی میں دریافت کیا ''تم نے کہاں جانا ہے؟''

ساروا نے جیب سے اپنے لڑکپن کی وہ تصویر نکالی جو اس کے آسٹریلوی والدین نے کھینچی تھی۔ اس نے تصویر دکھائی اور چند جملوں میں اپنی داستان سنائی۔ اسی دوران وہاں آس پڑوس سے مزید مرد و زن آ گئے۔ ساروا نے انھیں اپنا، بہن بھائیوں اور ماں کا نام بتایا۔ پھر پوچھا کہ کوئی انھیں جانتا ہے؟

ایک ادھیڑ عمر آدمی نے ساروا سے تصویر لی اور اُسے بغور دیکھنے لگا۔ پھر بولا ''تم یہیں انتظار کرو، میں ابھی آتا ہوں۔'' دس منٹ بعد وہ دوبارہ آیا اور ساروا سے کہا ''میرے ساتھ آؤ۔ میں تمھیں تمھاری ماں کے پاس لے چلتا ہوں''۔

وہ آدمی اُسے دوسری گلی میں واقع ایک گھر لے گیا جس کے باہر تین عورتیں استادہ تھیں۔ ان میں سے ایک عورت اُسے شناسا لگی۔ آدمی اسی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا ''وہ رہی تمھاری ماں!'' ساروا نے اُسے غور سے دیکھا، جھریوں کے پیچھے اُسے ایک نہ بھولنے والا چہرہ نظر آنے لگا۔۔۔ ماں، پیاری ماں!

ساروا بھاگ کر ماں سے لپٹ گیا۔ دونوں زاروقطار رونے لگے۔ انھوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہ کہا، بس آپس میں لپٹے آنسو بہاتے رہے۔ ساروا کے ماتھے پہ گدھے کی دولتی کا نشان موجود تھا۔ پھر وہ تمام اولاد کی طرح گالوں کے گڑھے بھی رکھتا تھا۔ لیکن یہ نشانیاں نہ بھی ہوتیں، تو بھی مادرانہ محبت بیٹے کو پہچان لیتی۔

فاطمہ پھر بیٹے کا ہاتھ پکڑے اُسے گھر لے گئی۔ وہ بہت خوش تھی کہ آخر اللہ تعالیٰ نے اس کی دعائیں سن لیں اور اُسے واپس بھیج دیا۔ ساروا اپنی بہن، شکیلہ اور بھائی کالو سے ملا۔ کالو میٹرک کرنے کے بعد مقامی کمپنی میں کلرکی کر رہا تھا۔ اسی نے ماں اور بیٹے کے مابین ترجمان کے فرائض انجام دیئے۔ ساروا چند ہندی (اردو) الفاظ سے واقف تھا۔ جبکہ فاطمہ انگریزی نہیں جانتی تھی۔ ساروا کو گڈو کی موت کا پتا لگا، تو اُسے بہت صدمہ پہنچا۔ وہ دیر تک بھائی کو یاد کرتا رہا۔

ملاپ کے دس دن پلک جھپکنے میں گزر گئے۔ ساروا ماں سے جدا ہو کر پھر آسٹریلیا پہنچ گیا۔ آج وہ ہر ماہ ماں کو پندرہ ہزار روپے بھجواتا ہے۔ فاطمہ دوسروں کے گھر کام کرنا چھوڑ چکی۔ وہ گھر میں آرام کرتی ہے۔

ساروا کی تمنا ہے کہ ماں اسی کے پاس آ جائے۔ لیکن فاطمہ زندگی کے آخری سانس اجنبی دیس نہیں اپنے وطن ہی میں بتانا چاہتی ہے۔ اُسے یہ اطمینان ضرور ہے کہ اس کا بیٹا زندہ ہے۔ اور اُسے ''اماں'' کہہ کر پکارتا ہے۔ فاطمہ کے لیے یہی بہت ہے۔ ■■■

مستقبل کا پیامبر

کیا 2040ء تک ایسی نینو مشینیں ایجاد ہو چکی ہوں گی جن کی مدد سے انسان اپنی عمر 50 برس تک بڑھا سکے گا؟

ہادی علی

چالیس سال قبل جب کمپیوٹر ایجاد ہوا تو اتنا دیوہیکل تھا کہ پورے ایک ہال میں سماتا۔ آج اس ابتدائی کمپیوٹر سے بھی زیادہ طاقت رکھنے والا پروسیسر سمارٹ فون میں سما جاتا ہے۔ مشہور امریکی ماہر مستقبلیات، رے کرزویل اسی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے کہتا ہے:

"آج جو کمپیوٹر ہماری جیب میں آجاتا ہے، وہ اگلے 25 برس میں اتنا ننھا ہو جائے گا کہ ہمارے خون کے خلیوں میں سما سکے۔"

اگر کوئی عام آدمی یہ بات کہتا تو یقیناً آپ کو ہنسی آجاتی۔ لیکن رے کرزویل چوٹی کے ماہر مستقبلیات میں شامل ہے۔ یہی نہیں وہ ایک نامور امریکی موجد بھی ہے۔ 64 سالہ کرزویل محض چودہ سال کا تھا کہ اس نے فائلیں ترتیب دینے والا ایک سافٹ ویئر ایجاد کیا۔ اسے بعدازاں آئی بی ایم نے خریدا اور اپنے کمپیوٹر کا حصہ بنالیا۔

مستقبل میں کرزویل انسانیت کے لیے کام کرنے والی کئی ایجادات سامنے لایا۔ مثلاً نابینا لوگوں کے لیے ایک ایسا سکینر ایجاد کیا جو مشن لکھن کرنے کے بعد اسے پڑھ کر انھیں سناتا ہے۔

لیکن اب ایجادات پس منظر میں جا چکیں اور کرزویل مستقبل کے منظر نامے پیش کرنے میں عالمی شہرت رکھتا ہے۔ پہلی بار انسان جب کرزویل کی پیشین گوئیاں سنے تو دنگ رہ جاتا ہے۔ اسے اس کا بیان حقیقت کم "سائنس فکشن" زیادہ لگتا ہے لیکن جب کرزویل کی باتیں سنی جائیں تو یقین آنے لگتا ہے کہ ایک مختلف مستقبل انسان کا منتظر ہے۔

کرزویل کا کہنا ہے کہ انسانی جنیوم (Human Genome) کی مثال عیاں کرتی ہے کہ انسانیت ترقی کے سلسلے میں کتنی غلط فہمیاں رکھتی ہے۔ انسانی جنیوم کی پیمائش یا سیکوئنسنگ (Sequencing) 1990 میں شروع ہوئی۔ عشرہ گزر گیا اور یہ کام ختم نہ ہوا تو کئی ماہرین دعویٰ کرنے لگے کہ یہ کبھی مکمل نہیں ہوگا۔

آخر 2000ء میں ایک فیصد کام مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد تو کام کو پر لگ گئے۔ ہر اگلے سال ماہرین نے

انسان جنیوم کی دگنی پیمائش کر ڈالی۔ چنانچہ اگلے سات برس میں یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ کرزویل کا کہنا ہے، ''صفر سے ایک فیصد تک پہنچنے میں خاصا وقت لگتا ہے اور راہ میں مشکلات بھی آتی ہیں۔ لیکن ایک سے سو فیصد تک پہنچنے میں کم وقت صرف ہوتا ہے اور کام توقع سے زیادہ جلد نمٹتا ہے۔''

کرزویل کا سب سے مشہور نظریہ یہ ہے کہ اگلے دو تین عشروں میں اتنی ننھی منی (نینو) مشینیں ایجاد ہوں گی جو فرداً فرداً ہر خلیے کی مرمت کر دیں گی۔ یوں انسان اپنی عمر کم از کم مزید ''50 برس'' بڑھا سکے گا۔ اس کے نزدیک یہ کرشمہ 2040ء تک جنم لے سکتا ہے۔

دوسرا اہم نظریہ یہ ہے کہ انسان آدھا مشینی بن جائے گا، خصوصاً اس کا دماغ! کرزویل کہتا ہے، ''ہمارا دماغ کچھ حدیں رکھتا ہے۔ مثلاً ہمارے دماغ میں جنم لینے والے برقی سگنلوں کی حرکت خاصی سست رفتار ہے۔ لہٰذا ہمارا دماغ مشینی ہیئت اختیار کر لے تو اس کے کام کی رفتار دگنی تگنی بڑھ جائے گی۔ ہم اپنی جسمانی صلاحیتیں تو بڑھا چکے، اب ذہنی قوت بڑھانے کا وقت آ پہنچا۔''

کرزویل کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اگلے 20 برس میں سوچنے، سمجھنے حتیٰ کہ اخلاقی فیصلے کرنے والے کمپیوٹر ایجاد ہو جائیں گے۔ تب یقیناً انسان اور کمپیوٹر کے مابین فرق کرنے والی لکیر دھندلا جائے گی۔

گزشتہ سال کرزویل نے کیلی فورنیا ریاست میں ایک انوکھی درس گاہ، سنگولیرٹی (Singularity) یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ اس یونیورسٹی کے قیام میں اسے گوگل کمپنی سے بھی مالی امداد ملی۔ یہ تعلیمی ادارہ کوئی مستقل بنیاد نہیں رکھتا۔ نہ ہی اس کے ہال ہیں اور نہ ہی اسپورٹس ٹیمیں۔ یہ دراصل ایک تھنک ٹینک کے مترادف ہے۔ یونیورسٹی کے کورسوں میں پوری دنیا سے کوئی بھی تعلیم یافتہ داخلہ لے سکتا ہے۔ پھر وہ بتاتے ہیں کہ بذریعہ ٹیکنالوجی بنی نوع انسان کو درپیش مختلف چیلنج مثلاً غربت، بھوک، بیروزگاری، بیماری، آب وہوائی تبدیلیوں وغیرہ کو دور کرنا کیونکر ممکن ہے۔

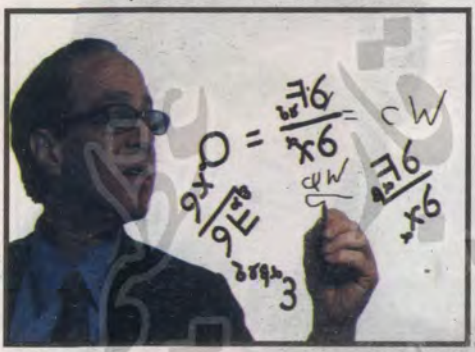

کرزویل کو بے تابی سے اس وقت کا انتظار ہے جب روزمرہ کام انجام دیتے ہوئے مشینیں قدم قدم پر انسانوں کی مدد کریں گی۔ وہ سائنس دانوں کا ہاتھ بٹائیں گی تا کہ کینسر اور ہیپاٹائٹس سی جیسے موذی امراض کا علاج دریافت ہو۔ نیز بجلی و پٹرول کا بحران حل کریں گی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ 64 سالہ کرزویل نے مشینوں کا ''زمانہ'' دیکھنے کی خاطر خود کو بہت فٹ رکھا ہوا ہے۔ وہ روزانہ تقریباً ''ڈیڑھ سو گولیاں'' کھاتا ہے تا کہ صحت مند رہے۔ اگر حقیقتاً مستقبل میں مشین نما انسان کرزویل کے منتظر ہیں تو ہماری یہی دعا ہے کہ انھیں دیکھنے کی خاطر زندہ رہے۔

■■■

ہنسی سے بھری زندگی

مزا ہی نہیں ناقابلِ یقین مزا!

انجینئر قیصر جاوید

زندگی کا توازن

ہمیں ان چیزوں کو سراہنے کی ضرورت ہے، جو ہمیں متوازن رہنے میں مدد دیتی ہیں، جو ہمیں سنجیدگی کے بوجھ تلے کچلے جانے سے بچاتی ہیں، اور جنہیں ہم اپنے ہوش وحواس برقرار رکھنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

میں ایک اور عظیم ترین سچ کی بات کر رہا ہوں، اور وہ سچ یہ ہے کہ انسانوں کو مزا لینے کی ضرورت بھی ہے۔ ہمیں کھیلنے کی ضرورت ہے، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمیں ہنسنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ زندگی مشکل ہو سکتی ہے اور یہ بعض اوقات غیر منصفانہ بھی ہو سکتی ہے، تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ یقیناً اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ مزا ایک ایسی چیز ہے جو ہماری سب سے زیادہ مدد کرتا ہے۔

ایک صبح کا ذکر ہے، مشہور مصنف ہال اربن اپنے ڈیسک پر بیٹھا اپنی کتاب پر محنت کر رہا تھا اور ویسی ہی کیفیت سے دو چار تھا جس میں مصنف خود کو مزید کچھ لکھنے سے قاصر پاتے ہیں۔ اس

کیفیت میں وہ سوچنے لگا کہ کیا مجھ میں مساکیت پسندانہ (Masochistic) رجحانات پائے جاتے ہیں۔ لکھنا میرے اب تک کے کیے ہوئے کاموں میں سب سے مشکل اور اضطراب انگیز کام ہے۔ اس کے باوجود میں اس کام کو جاری رکھے ہوئے ہوں۔ میں اپنے آپ کو یہ اذیت کیوں دے رہا ہوں؟

میں بہت سے دوسرے ایسے کام کرسکتا تھا، جو زیادہ لطف آمیز تھے مثلاً گیراج کی صفائی کا کام۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف کوئی نوجوان خاتون تھی۔ اس نے پوچھا: ''کیا جینیٹ ہے؟''

> ''فطرت نے نوعِ انسان کو جتنی بھی نعمتیں عطا کی ہیں، ہنسی ان میں سے عظیم ترین نعمت ہے'' (نورمن کزنس)

میں نے کہا: ''نہیں، اب جینیٹ یہاں نہیں رہتی۔''

اس نے پوچھا: ''کب سے؟''

میں نے کہا، کیا تمہیں نہیں پتا؟ جینیٹ بولیویا چلی گئی ہے۔ وہ وہاں انکا انڈینز (Inca Indians) کی شادی کی رسومات کے حوالے سے تحقیق کرنے گئی ہے۔''

یہ سن کر وہ بے یقینی کے سے لہجہ میں بولی، ''تم مذاق کر رہے ہو؟''

میں نے کہا، ''ہاں۔ شاید تم غلط نمبر ڈائل کر بیٹھی ہو۔''

ان کی گفتگو اُس کے اِس جملہ پر ختم ہوئی، ''صاحب! آپ عجیب آدمی ہیں!''

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔

ہال اربن کو یقین ہے کہ جب اس کی بات جینیٹ سے ہوئی ہوگی تو اس نے ''عجیب آدمی کا قصہ اسے ضرور سنایا ہوگیا اور وہ دونوں خوب ہنسی ہوں گی۔

میں خود ان کی گفتگو کا سوچ کر ہنسنے لگا تھا۔

درحقیقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ ہال کو دوبارہ فون کر کے بتائے گی کہ ''انکا'' لوگ بولیویا میں نہیں پیرو میں رہتے ہیں۔ تاہم میرا خیال ہے اس نے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ شاید اس کے پاس جینیٹ سے بات کرنے کو دوسرے اہم موضوعات ہوں گے۔

اس سارے بیان کا حاصل یہ ہے کہ جب ہم زندگی کی مشکلات کی وجہ سے اکتا چکے ہوتے ہیں، تب ہمیں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس حوالہ سے مزاح بہترین ہے۔ مجھے اس حقیقت کو سمجھنے میں بہت طویل عرصہ لگا کہ مزاح ایک صحت مند اور متوازن زندگی کا سب سے اہم جزو ہے۔ میں نے کئی برس سنجیدگی کے ساتھ شخصی ارتقاء اور اطمینان کے موضوع پر نفسیات کا مطالعہ کیا اور میں نے صرف یہ سیکھا کہ مجھے خود کو اتنی سنجیدگی سے نہیں لینا چاہیے۔

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی 1970ء کے دوران پورے امریکا میں ''شخصی ارتقا کی تحریک'' پھیل گئی۔ اس تحریک کے لیڈر مشہور ہیومینسٹک نفسیات داں (Humanistic Psychologists) تھے۔ لاکھوں لوگ اپنی پوری صلاحیتوں کو دریافت کرنے کی جستجو میں لگ گئے۔ اس پوری جستجو کا مقصد ''اپنے آپ کو جاننا'' تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا مفہوم حقیقتاً کیا ہے لیکن یہ سننے میں بھلا لگتا تھا۔ لوگ اپنے ''مرکز'' کو اور ''اپنے آپ'' کو جاننے کی جستجو میں انتہاؤں کو چلے گئے۔ انہوں نے اس جستجو میں بے پناہ رقم صرف کی۔ ٹاکرا گروپ (Encounter Group) بنائے گئے اور حساسیت کی تربیت دی جانے لگی (اس کے دوران لوگ دوسرے لوگوں سے ایسی باتیں کہہ دیتے تھے، جو وہ

عام حالات میں نہیں کہتے تھے)، لوگ مہارشی یوگی کے انداز میں ماورائی مراقبے سیکھنے لگے (جس کے لیے تھوڑے سے پھول اور بہت سارے پیسے لے کر جانا ہوتا تھا) ماری جوآنا پینا، گرم پانی کا غسل، ننگے جسموں کی مالش اور ایسی ہی دوسری خرافات عام ہوگئیں۔ ماضی کا جائزہ لیں تو یہ سب نہایت فضول دکھائی دیتا ہے۔ اب جو بھی ان لوگوں میں شامل تھا، وہ ان پر ہنسنے کا متحمل ہوسکتا ہے۔

جن لوگوں کی زندگی میں کسی چیز کی کمی تھی۔ آسودہ اور مطمئن زندگی کی جستجو میں تھے وہ ادھر گئے مگر آسودگی وہاں بھی نہیں تھی۔ وہ تحریک بہت مہنگی، تھکا دینے والی اور سنجیدہ ہوگئی تھی۔ بہت زیادہ سنجیدہ، اور اس نے فائدہ سے زیادہ نقصان پہنچایا۔

ایک پُرلطف اور غیر متوقع واقعہ میرے ساتھ بھی رونما ہوا۔ اگرچہ میں اس دور میں شخصی نروان کی جستجو میں کھویا ہوا تھا، تاہم میں نے دو فلمیں دیکھیں، جنہوں نے ان سب ''ترقیاتی تجربات'' سے زیادہ مثبت اور دیرپا اثر ڈالا۔ ذرا سوچیے تو سہی، صرف دو ٹکٹوں کی قیمت اور اپنے وقت میں سے چار گھنٹے صرف کر کے میں نے خود کو بے انتہا اذیت سے بچالیا۔

پہلی فلم تھی زوربا دی گریک (Zorba the Greek)۔ یہ دو آدمیوں زوربا اور اس کے باس کے درمیان تعلق کی کہانی پر مبنی تھی۔ باس خوب صورت ذہین، صحت مند، تعلیم یافتہ اور دولت مند تھا۔

وہ ایک اچھا انسان تھا لیکن وہ سب کچھ اندر رکھتا تھا اور زندگی سے لطف اندوز نہیں ہوتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کی زندگی میں کسی شے کی کمی ہے۔ میں نے باس کو اپنے جیسا پایا۔ پھر زوربا اسے کہتا، ''باس! آپ کے پاس ہر چیز ہے سوائے ایک چیز کے، اور وہ ہے پاگل پن۔ انسان کو اک ذرا پاگل پن کی ضرورت ہوتی ہے وگرنہ وہ رسی کاٹ کر آزاد نہیں ہوسکتا۔''

آخر میں زوربا باس کو رقص کرنا، ہنسنا اور مست و بے خود ہونا سکھاتا ہے۔

دوسری فلم تھی: A Thousand Clowns اس فلم کی کہانی بھی ایک تعلق کی کہانی تھی۔ یہ تعلق مرے اور اس کے گیارہ سالہ بھانجے نک میں تھا۔ وہ اکیلا تھا اور نک کو پال رہا تھا۔ مرے کو سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ نک نورمن نتھنگ جیسا نہ بن جائے۔ نورمن نتھنگ ان ''عمدہ مرحوم لوگوں'' میں سے ایک تھا، جو اتنے سنجیدہ ہوگئے تھے کہ زندگی سے لطف اندوز ہونا بھول گئے تھے۔ مرے چاہتا تھا کہ نک اس قابل ہوجائے کہ جو چیز دیکھے اس پر ہنس سکے۔

ہم سب کو ایک زوربا یا مرے کی ضرورت ہے، جو ہمیں احساس دلائے کہ ہم زندگی یا اپنے آپ کو زیادہ سنجیدہ نہ لیں۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ زوربا اور مرے شعور سے عاری مسخرے تھے۔ اس کے برعکس وہ نہایت گہرے انسان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ زندگی مشکل ہے اور یہ کہ یہ ہمیشہ منصفانہ نہیں ہوتی، لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بقاء کا واحد طریقہ زیادہ سے زیادہ ہنسنا ہے۔

اور ہم ہنسی کو تبھی پاسکتے ہیں جب ہم اس کو تلاش کرتے ہیں۔ زندگی مزاح اور مزے سے بھری ہوئی ہے۔ ہمارے ہر طرف کامیڈی موجود ہے۔ ہمیں صرف اس کو ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ مرے کہتا ہے، دیکھنے کی ضرورت ہے ''ہمارے اردگرد کارٹون چل پھر رہے ہیں۔''

روزمرہ پاگل پن کی چند مثالیں

میں نے یہ باب لکھنے کی تیاری کرنے کے دوران بہت مزا اٹھایا۔ میں نے مزاح اور کھیل کی نفسیات اور فوائد کے حوالہ سے ہر وہ چیز پڑھی، جو مجھے دستیاب ہوسکی۔ پھر میں نے ان کاموں کے بارے میں یاد کرنا شروع کیا، جو

میرے خوش مزاج دوست کرتے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ خود کو بے حد پیارا بنا چکے ہیں۔ میں ان کے بارے میں سوچ سوچ کر خوش ہوتا اور ہنستا رہا۔ ذیل میں ایسے ذہین لوگوں کی چند مثالیں درج کر رہا ہوں، جو کبھی کبھار اک ذرا پاگل پن کو استعمال کرنے کی بقاء کا سب سے اہم ہنر سیکھ چکے ہیں۔

میرا ایک دوست اسٹینفرڈ یونیورسٹی کا گریجوایٹ اور کچھ کتابوں کا مصنف ہے۔ وہ فلسفیانہ، روحانی اور مہم جویانہ مزاج کا گہرا انسان ہے۔ وہ تھوڑا سا کھسکا ہوا بھی ہے۔ جب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس پر پژمردگی طاری ہو رہی ہے تو وہ الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتا ہے۔ یہ باتیں وہ بہت اونچی آواز میں، چیخ چیخ کر کرتا ہے۔ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ ہر لفظ الٹا بولتا ہے۔ اس طرح اس کی ساری باتیں نہایت مزے دار اور پر مزاح بن جاتی ہیں۔ ذرا تم بھی اسی طرح بولنے کی کوشش کرو۔۔۔۔ اور ہاں اس دوران ہنسنا منع ہے۔ وہ لفظ الٹے بولنے کے عمل کو "سپرمین کال" (Superman Call) کہتا ہے۔ میں نے حال ہی میں اسے کاروباری افراد (bussinessmen) کے ایک گروپ کے سامنے تقریر کرتے سنا ہے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ ان کی زندگیوں میں مزاح کس قدر ہے؟ اس نے یہ بھی پوچھا کہ وہ دوسرے لوگوں کو کس قدر مزاح مہیا کرتے ہیں؟ پھر اس نے ان سے پوچھا کہ کیا وہ "سپرمین کال" سے آگاہ ہیں۔ وہ الجھے ہوئے سے دکھائی دیے۔ تب اس نے انہیں "سپرمین کال" سنائی یعنی چند جملے اس طرح بولے کہ ہر لفظ الٹا ادا کیا۔ الٹے الفاظ والے جملے سن کر وہ بوجھل ذہنوں والے بزنس مین اس طرح ہنسے کہ میرے دوست کو تقریر دوبارہ شروع کرنے میں پورے پانچ منٹ لگ گئے۔

میرا ایک اور دوست سان فرانسیسکو کی ایک بڑی انشورنس فرم میں ایگزیکٹو ہے۔ اس کی عمر پچاس سال ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ اس کے پاس ایک بڑی بی ایم ڈبلیو سیڈان کار ہے۔ وہ مہنگے ترین لباس پہنتا ہے۔ اپنی کمپنی کی نمائندگی کے لیے دنیا کے مختلف ملکوں کے سفر کرتا رہتا ہے، وہ اپنے گھر کو بھی بھرپور وقت دیتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ خیراتی اداروں کو فیاضی کے ساتھ مالی مدد دینے کے علاوہ اپنا وقت بھی دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ نہایت شائستہ انسان ہے۔ مجھے آج تک جتنے لوگ ملے ہیں، وہ ان سب سے زیادہ مزاحیہ شخص ہے۔ وہ ہر چیز میں مزاح ڈھونڈ لیتا ہے اور دوسروں کو ہنسانے میں کامل مہارت رکھتا ہے۔۔ وہ بعض اوقات نہایت بھڑکیلے رنگوں والے لباس پہنتا ہے۔ وہ کھلونوں سے بھی کھیلتا ہے۔ اس کا پسندیدہ کھلونا ایک واکس ویگن ہے، جو کہ فوجی طرز کی جیپ اور لینڈ کروزر کی ملی جلی صورت ہے۔ وہ مختلف قسم کی شکلیں بنا کر اپنا اور اپنے دوستوں کا جی بہلاتا ہے۔

وہ ایک ایسا شخص ہے جو بہت محنت کرتا ہے اور اس پر بہت سے معاملات کا زبردست دباؤ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ ہر وقت ہنستا ہنساتا رہتا ہے۔ اس کے اکثر جملے بے معنی ہوتے ہیں لیکن اس سے مزاح پیدا ہوتا ہے۔ مزاح غیر متوقع، اور بے معنی ہوتا ہے۔ مزاحیہ بات کرنے والے کے چہرے کے تاثرات اور لہجہ اس پر مستزاد ہوتے ہیں۔

ایڈیسن اور آئن سٹائن

تھامس ایڈیسن اور البرٹ آئن سٹائن پہلے دو نام نہیں ہیں جو اس وقت ذہن میں ابھرتے ہیں جب ہم مزاح کے حوالے سے سوچتے ہیں۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں نے زندگی کے سنجیدہ حصہ میں اپنی کامیابی کی وجہ یہ بتائی تھی کہ وہ زندگی کے کم سنجیدہ حصہ کی اہمیت جانتے تھے۔ دونوں نے اپنی زندگی کی ابتدا ہی میں جان لیا تھا کہ بہت زیادہ

وقت سخت ترین محنت کرنے یا غور و فکر کرنے سے اچھے اثرات کم اور برے اثرات زیادہ پڑتے ہیں۔ اس لیے تو لوگوں کو کام کے دوران وقفے کی ضرورت ہوتی ہے، اور اسی لیے طلبہ کو مطالعہ کے دوران وقفہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ جب ذہن بہت عرصہ تک بہت زیادہ سنجیدہ رہے تو اس پر بہت زیادہ بوجھ پڑ جاتا ہے۔ مزاح تناؤ کو ختم کر دیتا ہے۔

ایڈیسن کی بہت دیر تک کام کرنے اور ہزاروں ناکامیوں کا صدمہ برداشت کرنے کی کہانیاں دیو مالائی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ جو بات زیادہ مشہور نہیں، وہ اس کا خود اپنی مشہور سائنسی کامیابیوں کے لیے کام کرنے کے دوران اس کا خود کو مستعد اور چاق و چوبند رکھنے کا طریقہ ہے۔ ایڈیسن نے اپنی لیبارٹری میں ایک چارپائی رکھی ہوئی تھی۔ وہ وقفہ وقفہ سے اس پر لیٹ جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے علم تھا جب ذہن سکون کی حالت میں ہوتا ہے، تب اس کی تخلیقی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ ایڈیسن نے یہ بھی جان لیا تھا کہ مزاح اس کے ذہن کو تناؤ سے آزاد رکھتا ہے۔ جہاں اس نے سیکڑوں نوٹ بکس (Note Books) میں سائنسی مساوات لکھی ہوئی تھیں، وہیں بے شمار نوٹ بکس میں لطیفے بھی لکھے ہوئے تھے۔ وہ یہ لطیفے اپنے عملے کے افراد کو سنا کر خود بھی خوش ہوتا تھا اور انہیں بھی خوش رکھتا تھا۔ وہ لطیفوں کو تناؤ ختم کرنے اور مورال بڑھانے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ جو لوگ مل کر ہنستے ہیں، وہ مل کر زیادہ دیر تک اور زیادہ محنت کے ساتھ کام کر سکتے ہیں، اور زیادہ موثر انداز میں۔

جب ہم البرٹ آئن سٹائن کا نام سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں کیا سوچ ابھرتی ہے؟ جینیئس؟ ذہانت؟ فزکس؟ نظریہ اضافت؟ شاید یہ ساری باتیں ہمارے ذہن میں ابھریں۔ تاہم خود آئن سٹائن کے مطابق، زندگی کی چند نہایت اہم اور بنیادی چیزیں ہیں: سادگی، تخیل اور کھیل۔ اس نے کہا تھا، "ہر شے کو جتنا ممکن ہو، سادہ بنا دو۔"

اس نے پرنسٹن یونیورسٹی کے طلبا سے کہا تھا کہ اگر فزکس کے قوانین کو سادہ نہ بنایا جا سکتا تو وہ ان میں کوئی دلچسپی نہ لیتا۔ آئن سٹائن چیزوں کو جس طرح سادہ بناتا تھا، اس کا ایک طریقہ کھیل تھا۔ جن لوگوں نے اس کی زندگی کے متعلق تحقیق کی ہے، وہ یہ جان کر حیران رہ گئے کہ آئن سٹائن نہایت کھلنڈرا انسان تھا۔

آئن سٹائن کی زندگی سے ہمیں ایک عظیم سبق ملتا، اور وہ یہ کہ کھیل زندگی کو سادہ بنانے کا ایک موثر طریقہ ہے۔ جب ہم بچے ہوتے ہیں تب اکثر ایسا کرتے ہیں لیکن بڑے ہو کر ہم اکثر اسے بھلا دیتے ہیں۔

ہنسی ایک دوا

ہزاروں سال پہلے حضرت سلیمان علیہ السّلام نے بڑی دانائی کی باتیں کہی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا، "ایک خوشی سے بھرا دل عمدہ دوا ہے، لیکن ایک بجھی ہوئی روح ہڈیوں کو خشک کر دیتی ہے۔" جدید زمانے میں تاریخ کے سب سے مقبول عوام و خواص رسالہ "ریڈرز ڈائجسٹ" کے ہر شمارہ میں ایک گوشہ (Section) ہوتا ہے، جس کا عنوان ہے: ہنسی بہترین دوا ہے۔ ہاں۔

پیشہ طب میں حال ہی میں دریافت کیا گیا ہے کہ ہنسی صحت عطا کرنے کی تقریباً معجزانہ خاصیت کی حامل ہوتی ہے۔ یہ دریافت کسی فزیشن یا طبی محقق نے نہیں بلکہ ایک مریض نے کی تھی۔ اس مریض نے ڈاکٹروں کی یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس کی زندگی کے صرف چند مہینے باقی رہ گئے ہیں۔ اس مریض کا نام نورمن کزنس تھا، جو کہ سیٹرڈے ری ویو (Saturday Review) کا مشہور لکھاری ہے۔ کزنس کو 1964ء میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ

اسے ٹشوز کی ایک مہلک بیماری ہے۔ ایک سپیشلسٹ نے اسے بتایا کہ اس کے زندہ بچنے کا پانچ سو میں سے ایک امکان ہے اور یہ کہ اس کی زندگی بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ تاہم کزنس کا جینے کا ارادہ بہت مضبوط تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی بیماری کا علاج خود کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک پروگرام تیار کیا جس کے تحت اسے روزانہ تمام مثبت جذبات کو استعمال کرنا تھا۔ ان میں عقیدہ، محبت اور امید بھی شامل تھے۔ کزنس نے کہا کہ یہ اس کے علاج کے ایک اور عنصر کے مقابلہ میں آسان تھے۔ وہ عنصر کیا تھا؟ ہنسی۔ اگر تم ناقابلِ علاج بیماری میں مبتلا ہو، اور موت سر پر کھڑی ہو تو تم کس طرح ہنس سکتے ہو؟

تاہم وہ ضرور ہنسا۔ کزنس نے روزانہ دل کھول کر ہنسنے کا ایک باقاعدہ پروگرام بنایا۔ اس نے مزاحیہ ٹی وی پروگرام اور فلمیں یکے بعد دیگرے دیکھنی شروع کیں۔ اسے ہنسانے والی جو چیز ملی اسے اس نے دیکھا۔

بعد میں اس نے اپنی بیماری اور صحت پانے کا احوال اپنی کتاب Anatomy of An Illness میں لکھا: ''اس طریقہ نے کام دکھایا۔ مجھے یہ مسرت بخش حقیقت معلوم ہوئی کہ دس منٹ دل کھول کر ہنسنے کے بعد کم از کم دو گھنٹے کی درد سے پاک نیند میسر آتی ہے۔''

اس کے بعد کیے جانے والے طبی تجربات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ہنسی کے جسم پر اثرات پڑتے ہیں، اور اس میں بیماری کو دور کرنے کی خاصیت ہے۔ انیسویں صدی کے مزاح نگار جوش ملیگو نے لکھا تھا، ''دوا میں کوئی مزاح نہیں ہوتا لیکن مزاح میں بہت سی دوا ہوتی ہے۔''

اپنی غیر معمولی صحت یابی کے بعد کزنس نے مثبت جذبات و احساسات کے انسانی نظام پر اثرات کا مطالعہ جاری رکھا۔ آخر اسے یو سی ایل اے میڈیکل سکول میں پڑھانے پر مامور کر دیا گیا۔ ایم ڈی کی ڈگری نہ رکھنے والے کسی شخص کا تقرر ایک شاذ (Rare) واقعہ تھا۔ کزنس نے ایک اور کتاب لکھی، جو کہ اس کی پہلی کتاب Anatomy of an Illness کی ہم پلہ تھی۔ اس کتاب کا عنوان Head Frist: The biology of Hope تھا، اور یہ 1989ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں کزنس نے زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ہنسی کے طبی فوائد بیان کیے تھے۔ اس نے اس حوالہ سے حالیہ برسوں میں ہونے والی تحقیق کے نتائج بھی پیش کیے۔ اس نے اس کے لیے پورا ایک باب مختص کیا جس کا عنوان The Laughter Connection ہے۔ اس نے ہنسی کے عظیم صحت دہندہ ہونے کی تھیوری کے حق میں پہاڑوں کے مساوی سائنسی شواہد پیش کیے، جنہیں ہم نقل نہیں کریں گے لیکن ہم کزنس اور اس کے ساتھ کام کرنے والے ڈاکٹروں کی تحقیق کے نتائج کا خلاصہ ضرور درج کریں گے۔ اب اس امر کے واضح شواہد موجود ہیں کہ ہنسی ایک زبردست درد کش (Painkiller) بھی ہے۔ اس کے علاوہ ہنسی سانس لینے کی صلاحیت کو مضبوط بناتی ہے، اینڈورفنز (Endorphins) کہلانے والے مارفین (Morphine) نما مالیکیول پیدا کرتی ہے، بیماریوں سے لڑنے والے مدافعتی خلیات کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے، تناؤ کو کم کرتی ہے، داخلی اعضا کو تحریک دیتی ہے اور خون کی گردش کو بہتر بناتی ہے۔ کزنس تمام شواہد پیش کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالتا ہے: ''کئی انسانوں پر تجربات کرنے کے بعد یہ عیاں ہوا ہے کہ ہنسی اچھی صحت کی ضامن ہے۔'' سائنسی شواہد بائبل کے اس مقولہ کی تائید کر رہے ہیں کہ ''ایک مسرور دل دوا کی طرح کارگر ہوتا ہے۔''

کہانیوں سے بڑے حقائق

آزادی ہند کے بھارتی راہنما سبھاس چندر بوس کی پوتی بنگلہ دیش کی وزیر ڈاکٹر شرمیلا چندر بوس کی تہلکہ خیز کتاب جس نے تجزیہ نگاروں کو ہلا کر رکھ دیا

غزالہ عزیز

بھارتی بنگال کے سب سے بڑے شہر کلکتہ سے تعلق رکھنے والی ڈاکٹر شرمیلا بوس ہندوستان کی تحریک آزادی کے راہنما سبھاش چندر بوس کی پوتی ہیں۔ شرمیلا بوس بھارتی صحافی اور یونیورسٹی آف آکسفورڈ کے شعبہ سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کی سینیئر ریسرچ ایسوسی ایٹ بھی ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی کتاب ''Dead-recking the moories of the 1971 Bangladesh war'' بنگلہ دیش سے شائع ہوئی جس نے بھارت اور بنگلہ دیش کے متعصب پاکستان دشمن اسکالرز کو ہلا کر رکھ دیا۔ حسب روایت انھوں نے شرمیلا بوس کو پاکستانی ایجنٹ اور بنگال دشمن کے القابات سے نوازنا شروع کر دیا اس سب کی وجہ کتاب میں شرمیلا کا غیر جانبدارانہ رویہ اور ناقابل تردید ثبوت ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ شرمیلا کی تحقیق کے مطابق بنگلہ دیش کے حوالے سے آج تک بھارتی انٹیلی جنس 'را' اور دیگر بھارتی میڈیا نے جو پروپیگنڈا کیا تھا وہ بالکل یک طرفہ ہے۔ جب کہ زمینی حقائق یہ ہیں کہ اس قتل و غارت گری کے پس پردہ صرف اور صرف بھارتی حکومت کی چالبازی تھی۔ جس نے مکتی باہنی کے نام سے جرائم پیشہ اور ورغلائے گئے بنگالی مسلمانوں کی ایسی فوج تیار کی جس نے 'را' کے پلان کے مطابق پاکستانی فوج کے خلاف جان بوجھ کر اشتعال انگیز کارروائیاں کیں۔ غیر بنگالی پاکستانیوں کا قتل عام کر کے پاکستانی فوج کو جوابی کارروائی پر مجبور کیا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر شرمیلا بوس نے ثابت کیا کہ پاکستانی فوجیوں کی طرف سے بنگالی عورتوں کے ریپ کے واقعات بڑھا چڑھا کر افسانوی انداز میں پیش کیے گئے۔

انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا کہ بنگالی قوم پرست شدید نوعیت کے انسانیت سوز جرائم میں ملوث تھے۔

انھوں نے ذرائع ابلاغ کی ان اطلاعات کا جائزہ بھی لیا کہ جس میں کہا گیا کہ پاکستانی فوج نے تیس لاکھ بنگالیوں کو قتل کیا۔ انھوں نے اس تعداد کو محض افواہ قرار دیا اور کہا کہ اتنی بڑی ہلاکتیں کسی سطح پر بھی ثابت نہیں کی جا سکیں۔ کسی بنگلہ سرکاری رپورٹ میں اس تعداد کا حوالہ یا ثبوت تک موجود نہیں۔

شرمیلا نے لکھا کہ سابق مشرقی پاکستان میں 1971ء کی خانہ جنگی کی داستان فاتح فریق یعنی بنگالی قوم پرستوں کی طرف سے بیان کی گئی ہے۔ جس نے نام نہاد مظالم کا جھوٹا پروپیگنڈا کر کے ساری دنیا کو طویل عرصے تک اُلو بنا کر رکھا اُن کی کتاب ''ڈیڈر یکنگ'' کے مطابق بنگالی قوم پرستوں کی بغاوت مشرقی پاکستان میں غیر بنگالیوں کے خلاف ناقابل برداشت تشدد میں تبدیل ہوگئی۔ مغربی پاکستان کے شہریوں اور ان میں بھی زیادہ تر اردو بولنے والوں کو نشانہ بنایا گیا۔ جو تقسیم ہند کے وقت بھارت سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آئے تھے اور جنھیں بہاری کہا جاتا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ بنگالی قوم پرستی کے نام پر ہونے والے نسلی تشدد میں غیر بنگالی مرد عورتوں اور بچوں کی ہلاکتیں جنگ کے دوران اور اس کے دس ماہ بعد تک ہوتی رہیں۔ نسل پرست قتل عام کا شکار ہونے والے غیر بنگالیوں کو سیکڑوں اور بعض واقعات میں ہزاروں کی تعداد میں قتل کیا گیا۔ قتل عام میں کوئی تخصیص نہ رکھی گئی، نہتے لوگوں کو انتہائی المناک حیوانیت کے ساتھ قتل کیا گیا۔

ڈاکٹر شرمیلا کہتی ہیں کہ بدترین مظالم تو بنگالی علیحدگی پسندوں نے اپنے ہی لوگوں پر ڈھائے تھے۔ آخری دنوں میں حکومت کے حامیوں کے ہاتھوں آزادی کے حامیوں کی ہلاکتیں اس لڑائی کے دوران کیا جانے والا بدترین جرم تھا۔ اور اب حسینہ واجد بھارتی اشارے پر عوامی لیگی قیادت کے جرم پر جماعت اسلامی کی بزرگ قیادت کو پھانسی کی سزا دے کر خود فراغت حاصل کرنا چاہ رہی ہیں۔

> **جب پاکستانی فوج بنگالی باغیوں کو نشانہ بنانے آئی تو بہت سے علاقوں میں زمین غیر بنگالیوں کی لاشوں سے اٹی پڑی تھی۔ ایک مقام پر تو لاشوں کے باعث دریا کا پانی رک گیا تھا۔**

ڈاکٹر شرمیلا چندر بوس کی یہ شہادت بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اول وہ بھارت کے آزادی کے راہنما سبھاس چندر کی پوتی ہیں دوم وہ بنگالی ہیں اور سوم ہندو بھی ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کی یہ کتاب بنگلہ دیش میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے سلسلے میں ان کو قوم پرستوں کے مشکل سوالات اور جذبات کا سامنا کرنا پڑا۔ واشنگٹن کے وڑڈولسن انٹرنیشنل سینٹر فار اسکالرز کی تقریب جو مارچ 2011ء میں ان کی کتاب کا تنقیدی تعارف پیش کرنے کے لیے منعقد کی گئی، اس میں پہلا سوال ان سے یہ کیا گیا کہ ''یہ کتاب لکھنے کے لیے آپ نے کس سے پیسے لیے تھے؟'' جس کا جواب انھوں نے خندہ پیشانی اور اطمینان کے ساتھ دیا کہ ''نہیں میں نے یہ کتاب لکھنے کے کسی سے کوئی پیسے نہیں لیے۔'' ذیل میں ہم ڈاکٹر شرمیلا بوس کا وہ انٹرویو پیش کر رہے ہیں جو انھوں نے وائس آف امریکا کو دیا تھا۔ ''اس تنازع میں کسی فریق کا کردار قابل تعریف نہیں''

وائس آف امریکا سے تیکھی گفتگو

س: اس کتاب پر ریسرچ کے لیے آپ نے کتنے لوگوں سے بات کی اور وہ کون لوگ تھے؟

ج: بنگلہ دیش میں، میں نے ایسے بہت سے لوگوں سے بات کی جو 1971ء کے واقعات میں کسی نہ کسی طرح شامل تھے یا اس کے عینی شاہد تھے۔ جس کے بارے میں

تحقیق کر رہی تھی۔ میرے انٹرویوز جن کا ذکر میری کتاب میں ہے، بنگلہ دیش کے دیہاتوں، شہروں اور کئی اضلاع میں جا کر کیے گئے۔ میں نے ان واقعات کا جائزہ لیا جو دسمبر 1970ء سے جنوری 1971ء تک کے ہیں۔ وہ سب لوگ جو وہاں خود موجود تھے یہ عینی گواہ تھے آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی تعداد ہوگی۔ پاکستان میں، میں نے کوشش کی کہ ایسے افراد سے بات کروں جو 1971ء میں مشرقی پاکستان میں تعینات مغربی پاکستان کے حاضر سروس جونیئر آرمی آفیسرز تھے جنھوں نے مشرقی پاکستان میں مارشل لاء کی ڈیوٹی کی۔ شر پسند عناصر کے خلاف کارروائیاں کیں۔ میں کچھ سینیئر فوجی افسران سے بھی ملی، خوش قسمتی سے میں نے جنرل نیازی کی موت سے پہلے ان سے بھی ملاقات کی۔ میں نے صاحبزادہ یعقوب خان سے بھی ملاقات کی تھی۔ لیکن زیادہ تر میں نے ان لوگوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جو اس وقت پاکستانی فوج میں کیپٹن لیفٹیننٹ یا میجر کے طور پر تعینات تھے یا کچھ رجمنٹ کمانڈر آفیسر تھے اور اب تک حیات تھے۔ مجموعی طور پر میں نے تین درجن سے زیادہ پاکستانی آرمی آفیسرز سے بات کی۔

بنگلہ دیش میں جن لوگوں سے میری بات ہوئی ان کی گنتی کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ جب دیہی علاقوں میں آپ لوگوں کے انٹرویوز کر رہے ہوتے ہیں تو اکثر سیکڑوں لوگ یوں ہی جمع ہو جاتے ہیں اور ایک سے بات کرو تو کئی اور لوگ بھی گفتگو میں حصہ لینے لگتے ہیں اور اپنے تجربات بیان کرنے لگتے ہیں۔

س: پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصے کی علیحدگی میں آپ پاکستانی فوج کا کیا کردار دیکھتی ہیں اور بھارت کے کردار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: یہ کتاب بھارت کے کردار کے بارے میں نہیں ہے۔ اگرچہ بھارت کا اس واقعہ میں بہت کردار رہا لیکن میری کتاب ان لوگوں کے بارے میں ہے۔ جو اس تنازع سے براہ راست متاثر ہوئے۔ پاکستانی فوج کا جہاں تک تعلق ہے وہ اس سال کے دوران ریاست کی پالیسی کے اطلاق کا ذریعہ تھی۔ گو کہ وہ ریاستی پالیسی کے اطلاق کا ذریعہ مارچ 1971ء کے بعد بنی جب کہ میری کتاب اس سے کچھ مہینے پہلے سے شروع ہوتی ہے۔ مگر پاک فوج نے کیا کیا، کہ یہ ایک پیچیدہ معاملہ رہے گا۔ فوج میں ایسے لوگ تھے جو شر پسندوں کے خلاف نہایت ہی مشکل حالات میں ہر ممکن طریقہ سے کارروائیاں کرنے کی کوششیں کر رہے تھے اور جنگ کے ضابطہ اخلاق پر عمل کر رہے تھے۔ ان میں کئی اچھے اور معتبر لوگ تھے جو شاید اپنے ملک کی پالیسی سے مکمل طور پر اتفاق نہ کرتے ہوں مگر وہ کام کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو انھیں کرنے وہاں بھیجا گیا تھا۔ لیکن ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے جنگی جرائم کیے۔ 1971ء کے تنازع میں کئی Nuances اور پیچیدگیاں ہیں۔ اس میں ملوث تمام اداروں، فریقوں اور کرداروں کی طرف سے میری کتاب کا سب سے بڑا کنٹری بیوشن یہ ہو گا کہ ان تمام پیچیدگیوں کے بارے میں بات چیت اور مکالمہ شروع کیا جائے (تمام لکھنے والوں اور ریسرچ کرنے والوں کو اس بات پر غور کرنا چاہیے) کیونکہ ''قوم پرست دیو مالائی قصوں'' (Nationalistic mythology) میں واقعات اور چیزوں کو ضرورت سے زیادہ سادہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور اس تنازع کے دونوں سروں پر کھڑے فریقوں نے ایسا ہی کیا۔ مگر اس سے کسی کی مدد نہیں ہوئی۔

س: بنگلہ دیش کی پیدائش کی کہانی میں آپ ولن کے طور پر کس کو دیکھتی ہیں؟

''اس تنازع میں کسی فریق کا کردار قابل تعریف ہیں''

ج: مجھے ڈر ہے کہ اس کہانی میں کوئی اچھا کردار نہیں ہے اس تنازع کے ہر سرے پر برے لوگ موجود تھے اور اچھے لوگ بھی تھے۔ مگر مجموعی طور پر اس تنازع میں کسی فریق کا کردار قابل تعریف نہ تھا۔

س: وہ کیا چیز تھی جس نے آپ کو تاریخ کے ایسے واقعات کی تحقیق پر اکسایا جو چالیس سال پہلے ہوا تھا؟ جب آج کی نسل کے بیش تر لوگ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ کیوں آپ کو یہ خیال آیا کہ بنگلہ دیش کی کہانی کے مضمرات کو گہرائی میں جا کر دیکھنا ضروری ہے؟

ج: 1971ء کی جنگ میرے ساتھ جب سے ہے جب میں ایک بچی تھی اور کلکتہ میں بڑی ہو رہی تھی (شرمیلا بوس 1971ء میں بارہ سال کی تھیں) میری اپنی یادداشت میں اب تک وہ تکلیف دہ اور پیچیدہ واقعات موجود ہیں جو ہمارے بالکل نزدیکی شہر میں پیش آئے۔ میرے خاندان کے کئی افراد مشرقی پاکستان سے آنے والے مہاجرین کے لیے امدادی سرگرمیوں میں شامل رہے۔ تو یہ واقعات میرے ساتھ ساتھ اس وقت سے تھے جب سے میں نے بین الاقوامی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی۔ مجھے ہمیشہ لگتا تھا کہ مجھے اس بارے میں کچھ لکھنا چاہیے۔ یہ اور بات کہ مجھے اس کا موقع واقعہ کے تیس، پینتیس سال بعد جا کر ملا۔

س: آپ کے خیال میں آج کے بنگلہ دیش اور پاکستان میں آپ کی کتاب کے مندرجات کا وزن کیسے تولا جائے گا؟

ج: کتاب کے مندرجات بہت مناسب ہیں مگر بنگلہ دیش اور پاکستان دونوں میں ایسے لوگ ہوں گے جنھوں نے اس کتاب پر یقین کرنے اور انھیں سمجھنے میں دشواری ہو گی۔ ایسا اس لیے کہ چالیس برس کے دوران دونوں ملکوں اور بھارت میں بھی اپنے طور پر ایک قوم پرستی پر مبنی دیو مالا تشکیل پا چکی ہے۔ اس جنگ کے بارے میں کوئی غیر جذباتی، غیر جانب دار اور منظم ریسرچ نہیں ہوئی کیونکہ ہم میں سے بیش تر لوگ ایسی کہانیاں سنتے ہوئے بڑے ہوئے ہیں۔ میں خود بھی اس کہانی کا وہ ہی بیانیہ سن کر بڑی ہوئی ہوں جس پر بھارت اور بنگلہ دیش کی چھاپ تھی۔ تو جب میں نے یہ ریسرچ شروع کی اس وقت میں خود بھی نہیں جانتی تھی کہ کیا نتائج سامنے آئیں گے۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ 1971ء کے واقعات مکمل طریقے سے تحریری شکل میں نہیں لائے گئے اس لیے میں ایسی تفصیلات معلوم کروں گی جو کہیں درج نہیں ہوئیں، یعنی دستاویزی حقائق کا خود بھی جائزہ لوں گی۔ لیکن جب میں نے تحقیق کے لیے لوگوں سے بات کرنی شروع کی تو جو حقائق میرے سامنے آئے وہ ان کہانیوں سے مختلف تھے جنھیں سن کر میں بڑی ہوئی تھی۔ مجھے خود بھی ان پر یقین کرنے میں دشواری پیش آئی۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ بنگلہ دیش اور پاکستان میں بھی لوگوں کو اس کتاب کو سمجھنے میں دشواری پیش آئے گی۔ جو اپنے وطن کی قوم پرستی پر مبنی کہانیاں سن کر بڑے ہوئے ہیں۔ ایسا ہر جنگی تنازع کے بعد ہوتا ہے لیکن ہاں یہ ریسرچ پہلے سامنے آنی چاہیے تھی۔ مجھے بھی مجھے خوشی ہے کہ یہ کام مکمل ہوا۔

تکبر علم کا اور غصہ عقل کا دشمن ہے۔ (افلاطون)

سائنس فکشن

مریخ سیارے پر مفادات کی جنگ

ایک اور سیارے پہ پائی جانے والی زندگی کا ماجرا، وہاں انسانوں نے اپنی ذہانت کا لوہا منوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی

ایرک وِنی کوف / فیضان اللہ خان

''تمہارے خیال میں اس سیارے پر کس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے؟'' ٹھوتھی لو نے ڈی بورڈنگ ٹیوب کے راستے خلائی شٹل سے نکل کر مریخی خلائی اڈے کے ٹرمینل کی طرف جاتے ہوئے اپنی سیکرٹری کینڈس سے سوال کیا۔

''کس چیز کی سر؟'' کینڈس نے تجسّس سے پوچھا۔

''ایک ریڈیو لائن کی . . . !''

خلائی شٹل کے کیپٹن نے ٹھوتھی لو کی وی آئی پی اہمیت کے پیش نظر اسے اور اس کی سیکرٹری کو باقی مسافروں سے آگے آگے اپنی معیت میں شٹل سے ایئر لاک تک پہنچا دیا تھا۔ ایئر لاک سے نکل کر انہیں خلائی اڈے کی انتظار گاہ تک پہنچنا تھا جہاں پر ایک استقبالیہ کمیٹی ان کے خیر مقدم کے لیے موجود تھی۔

''آپ نے اپنے منصوبے کے لیے بڑی مناسب جگہ منتخب کی ہے سر۔ میرا خیال ہے یہاں پر آپ کو

ضرورت نہیں پڑے گی۔'' کینڈس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

ڈی بورڈنگ ٹیوب کے باہر مریخ کی سہ پہر ایک نرم و گداز چمکیلے گلابی آسمان کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ننھے منے چمکدار سورج کی شعاعیں لہر دار برفیلے میدانوں پر سے پھسل پھسل کر خلائی اڈے کی دھاتی عمارات پر پڑ کر نظروں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ دونوں اپنے آپ کو مریخ کی کشش ثقل کے مطابق ڈھالنے اور توازن قائم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے، جو زمین کی کشش ثقل کا صرف 2/5 یعنی 40 فی صد تھی۔ اتنی کم کشش کی وجہ سے ابتدا میں ان دونوں کو یہاں پر چلنے کا عمل نامانوس سا لگ رہا تھا۔

انتظار گاہ تقریباً خالی تھی۔ ٹموتھی کا استقبال کرنے والوں میں مریخ کے قطب شمالی پر واقع صنعتی علاقے کو کنٹرول کرنے والے ادارے نارتھ پولر کنسورشیم کا چیف ایگزیکٹو آفیسر ماسا کوبیاشی ادارے کے نائب صدور کی قطار کے آگے کھڑا تھا۔

''چھ نائب صدور.....!'' ٹموتھی لو نے سرگوشی میں کہا ''یہ لوگ میرے ساتھ تعاون کرنے کے سلسلے میں پُر اعتماد نہیں..... البتہ میرے بارے میں سنجیدہ ضرور ہیں۔''

کنسورشیم کے عہدے داروں نے ایک ساتھ جھک کر سلام کیا۔ ٹموتھی نے جوابی سلام کیا۔ کینڈس اس مرحلے پر اپنے غیر اہم کردار کو محسوس کرتے ہوئے ایک طرف کو کھسک گئی تھی، گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

''مریخ پر خوش آمدید، مسٹر لو!'' ماسا کوبیاشی نے گرم جوشی سے کہا۔ ''مجھے یقین ہے آپ اس سفر سے خوب لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔''

''بالکل، بالکل، بہت شکریہ۔''

''میں نے آپ کے لیے اقامت گاہ پر مناسب کمروں کا بندوبست کر دیا ہے۔ اقوام متحدہ کے کسٹم کے عملے نے آپ کو کلیئرنس دے ہی دی ہے... اور آپ کا سامان الگ سے پہنچ جائے گا۔ کیا خیال ہے اب ہم چلیں؟''

''جی ہاں، ضرور۔''

ٹرمینل کے سامنے تین عدد لیموزین گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ٹرمینل سے نکل کر گاڑیوں میں داخل ہونے کے لیے انٹری ٹیوبیں تھیں، جو ان گاڑیوں کے کھلے ہوئے دروازوں پر ختم ہو رہی تھیں اور ان پر پوری پوری فٹ آ رہی تھیں۔ سرخ و سفید پٹیوں والے مریخی لباس میں ملبوس ایک کارندہ ان ٹیوبوں کی نگرانی پر مامور تھا۔ مریخی لباس پہنے بغیر کھلی فضا میں باہر آنا اس کے لیے ممکن نہ تھا کیونکہ یہاں پر کرۂ ہوائی کا دباؤ زمین کے ہوائی دباؤ کے مقابلے میں ایک فی صد سے بھی کم تھا، جس میں آکسیجن کی مقدار نہ ہونے کے برابر تھی اور درجہ حرارت..... منفی 115 درجے سینٹی گریڈ!

لیکن ان وی آئی پی شخصیات کو مریخی لباس پہننے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ انہیں خلائی اڈے سے آرام دِہ ماحول سے براہ راست گاڑیوں کے اندر پہنچانے کے لیے انٹری ٹیوبوں کا انتظام موجود تھا۔ ہر ہی ماحول ٹویوٹا کمپنی کی ساختہ الٹیما نامی گاڑیوں کے اندر تھا جن کی باڈیاں اور ٹائر مریخ کے ماحول کے مطابق خصوصی طور پر ڈیزائن کیے گئے تھے۔

ٹموتھی لو پہلی گاڑی میں ایک مناسب سیٹ پر براجمان ہوگیا۔ اس کے سامنے والی سیٹ پر ماسا کوبیاشی بیٹھ گیا۔

''اگر آپ کنسورشیم کے علاقے کا تفصیلی مشاہدہ کرنا چاہیں تو ہم لمبا راستہ اختیار کر سکتے ہیں'' کوبیاشی نے استفہامیہ لہجے میں کہا۔

ٹموتھی مسکرایا، ''یقیناً میں چاہوں گا۔''

ماسا کوبیاشی نے ایک بٹن کو چھوا۔ ''ہمیں ریڈیل 2 لے چلو'' اس نے آٹو کون نامی خودکار آلے کو حکم دیا ''پھر بائیں جانب سرکم 7 پر کنسورشیم ایڈمنسٹریشن سینٹر میں لیول 6 پر واقع اقامت گاہ پر پہنچو۔''

قافلے نے جب خلائی اڈے سے نکل کر کچھ فاصلہ طے کر لیا تو ٹموتھی لو نے مڑ کر اس پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ پہلی نگاہ میں یوں محسوس ہوا جیسے برف کی سفید چادر پر کسی بچے کے کھلونے بکھرے ہوئے ہوں۔ تھوڑا سا آگے جا کر اس سارے منظر میں ایک ترتیب اور تناسب ابھر کر سامنے آیا۔ عمارتوں، شپ یارڈوں اور ذخیرہ گر تالابوں کا ایک وسیع حلقہ درجنوں کریڈلوں کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھا جہاں خلائی جہاز مرمت اور دیکھ بھال کی غرض سے کھڑے کیے جاتے تھے۔ خلائی اڈے سے شاہراہیں اور پائپ لائنیں نکل کر مریخی برف زار (ٹنڈرا) کے علاقے کی طرف جا رہی تھیں اور وہاں پر واقع صنعتی اداروں کے کارخانوں کا خلائی اڈے سے رابطہ جوڑ رہی تھیں۔ اڈے پر اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے خلائی جہاز نقرئی گولوں کی مانند نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ جہاز، جن کا سائز چھوٹا تھا، مسافروں کے لیے تھے جبکہ بعض جہاز بہت بڑے بڑے تھے، جو مال برداری کے کام آتے تھے۔ لو اس سارے منظر کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ وہ دولت کا پجاری تھا اور مال و زر کے سومناتوں کو سجدہ کرنا اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔

ماسا کوبیاشی نے اس کی دلچسپی نوٹ کرتے ہوئے کہا ''مریخ کے قطب شمالی کی خلائی بندرگاہ زمین یا مریخ پر واقع کسی بھی خلائی اڈے سے زیادہ مال کی آمد و رفت کا مرکز ہے۔ نظام شمسی میں مریخ اور مشتری کے درمیان واقع چھوٹے چھوٹے سیارچوں اور مشتری کے چاندوں پر سے خام مادے یہاں پر لائے جاتے ہیں اور پھر اس خام مال سے یہاں تیار کی جانے والی اشیا زمین پر بھیجی جاتی ہیں۔ اسی طرح زمین سے پیٹرو کیمیکلز اور نامیاتی مادے یہاں منگوائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نظام شمسی کے کان کنوں کو ضروری اشیا پہنچائی جاتی ہیں۔''

''گویا کنسورشیم دونوں جانب سے زبردست منافع کماتا ہے۔'' ٹموتھی لو نے نتیجہ اخذ کیا ''اسی طرح قطب جنوبی کے علاقے میں یورپین انڈسٹریل پارک والوں کی چاندی ہو رہی ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مریخ اتنی کم مدت میں آخر کس طرح خلائی صنعت کا مرکزی مقام بن گیا؟''

''اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مریخ زمین کی نسبت نظام شمسی میں ہونے والی کان کنی کے مراکز مثلاً سیارچوں کی پٹی اور مشتری کے چاندوں سے قریب تر ہے۔ قریب ان معنوں میں بھی کہ ان سیارچوں سے مریخ کا فاصلہ زمین کے مقابلے میں کم ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ مریخ کی سطح سے اڑنے کے لیے درکار فراری رفتار (اسکیپ ولاسٹی) زمین کی فراری رفتار سے بہت کم ہے۔ لیکن..... اس کا بنیادی سبب تو یہیں ہمارے اردگرد موجود ہے..... ذرا اِدھر نظر دوڑائیے۔''

لیزر شعاع کی طرح سیدھی سڑک مریخ کی اونچی

نیچی سطح کو کاٹتی ہوئی حد نگاہ تک نظر آرہی تھی۔ ان کے ہمراہ اس سڑک پر اور بھی بہت سی گاڑیاں رواں دواں تھیں، جن میں زیادہ تر ٹرک تھے۔ دائیں جانب سڑک سے نیچے 15 میٹر قطر کا ایک عظیم الجثہ دھاتی گولا برف میں لڑھکتا نظر آرہا تھا۔ یہ جہاں جہاں سے گزرتا، وہاں کی برف کو اپنے اندر جذب کرلیتا اور پیچھے ننگی چٹانیں چھوڑ جاتا۔ اس کے اوپر ایک میکینکل کمپنی کا لوگو چمک رہا تھا۔

''یہ دراصل پانی اکٹھا کرنے کی مشین ہے۔'' ماسا کوبیاشی نے وضاحت کی۔ ''یہ ایک طرح کا ریموٹ کنٹرول روبوٹ ہے۔ مریخ کے شمالی برفستان میں اس طرح کے سیکڑوں روبوٹ مصروفِ عمل ہیں۔ اس سے ہمیں پینے اور صنعتی استعمال کے لیے پانی ہی نہیں ملتا بلکہ سانس لینے کے لیے آکسیجن اور راکٹوں میں بطور ایندھن استعمال کرنے کے لیے ہائیڈروجن اور آکسیجن حاصل کرنے کا بھی یہی ذریعہ ہے۔ یہاں پر برف اتنی مقدار میں موجود ہے کہ اسے جتنا بھی استعمال کرلیا جائے، اس کے ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ ہے اصل وجہ ہماری یہاں پر موجودگی کی۔''

اس کے بعد مشروبات کا ایک مختصر سا دور چلا۔ اسی دوران میں کوبیاشی نے مطلب کی بات چھیڑی۔ ''آپ ایک دلچسپ مشن لے کر مریخ پر آئے ہیں، مسٹر لو۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس پر عمل درآمد شاید ممکن نہ ہو۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ منصوبہ بالکل ممکن العمل ہے جناب، اور آپ بھی اسے اسی طرح سے لیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کے نائب صدور کی پلٹن میں سے کوئی بلا وجہ اوٹ پٹانگ باتیں شروع کردے۔''

اس غیر متوقع درشت انداز گفتگو سے ماسا کوبیاشی کے ماتھے پر لمحہ بھر کے لیے تیوریاں نمودار ہوئیں۔ لیکن پھر اپنے آپ پہ قابو پاتے ہوئے بولا ''آپ کی نیک نامی ہم تک آپ سے پہلے ہی پہنچ چکی ہے۔ آپ سرمایہ کاری کے میدان میں اچھی قوت فیصلہ اور نئے نئے طریقے اختراع کرنے کے لیے مشہور ہیں اور یہی آپ کی کامیابی کا راز ہے۔ آپ کے پاس بیس کروڑ ڈالر سے زیادہ سرمایہ موجود ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ آپ نے پہلے کبھی ریلوے لائن بچھانے کا کام کیا نہیں ہے.....''

''میں آپ کے جاسوسی نظام کا قائل ہوں مسٹر کوبیاشی.....'' کوبیاشی کے منہ سے اپنے کاروباری راز سن کر ٹموتھی لو نے کہا ''لیکن میری آپ سے درخواست ہے کہ میرے کاروباری رازوں سے متعلق باتیں آپ مجھ سے اپنے دفتر ہی میں کریں تو یہ خود آپ کے حق میں بھی بہتر ہوگا۔''

ماسا کوبیاشی نے اس بات پر توہین محسوس کرنے کے بجائے محظوظ ہونے کو ترجیح دی۔ لہجے کو خوش گوار بناتے ہوئے بولا ''ممکن ہے آپ ٹھیک ہی کہتے ہوں۔ یقین سے تو کوئی بھی نہیں کہہ سکتا۔ چلیں دوبارہ ریلوے لائن کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟''

''ہاں، ضرور۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگرچہ میں نے خود کبھی ریلوے لائن بچھانے کے منصوبے پر کام نہیں کیا تاہم میں نے کچھ ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کی ہیں، جو یہ کام کرچکے ہیں۔''

لیموزین نے بائیں جانب موڑ کاٹا اور ایک دوسری شاہراہ پر مڑ گئی۔ شاہراہ کے آغاز ہی میں ایک بڑے محرابی دروازے پر ''فیوجی کیمیکلز کارپوریشن'' کا بورڈ ہوا تھا۔ محراب سے اندر جانے والے راستے کے اختتام پر چمکدار بلند و بالا عمارتوں، ٹینکوں، پائپوں اور دوسری طرح طرح کی چیزوں کا ایک جنگل سا برف میں اگا نظر آرہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اپنی ریلوے لائن کی تعمیر کے سلسلے میں درپیش انجینئرنگ کے چیلنجوں کے متعلق آپ نے صحیح اندازہ نہیں لگایا۔'' ماسا کوبیاشی نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ کیسے؟''

''دیکھیے نا، مریخ کے دونوں قطبوں کے درمیان بالکل سیدھا راستہ دس ہزار سات سو کلومیٹر بنتا ہے۔ آپ کو اس سے لمبا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ راستے میں بڑے بڑے آتش فشاں ہیں، گہری کھائیاں اور گڑھے ہیں، گرد کے صحرا ہیں..... ان سب رکاوٹوں سے بچتے بچاتے ہوئے آپ کو اپنی ریلوے لائن بچھانا ہوگی۔ پھر مریخ پر دو سو کلومیٹر فی گھنٹہ تک کی رفتار سے گرد کے طوفان آتے ہیں۔ مریخ کی گرد بھی انتہائی باریک ہے۔ یہ ہر چیز کے اندر گھس جاتی ہے اور کل پرزوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی ہے۔''

''انجینئرنگ کے مسائل ہمیشہ حل کیے جاسکتے ہیں۔ آخر انجینئر ہوتے کس لیے ہیں؟'' ٹموتھی لو نے کہا۔

اسی اثنا میں ان کی گاڑی ایک اور ادارے ''نسان کارپوریشن'' کے صدر دروازے کے سامنے سے گزری۔ اس کے اندر بنی ہوئی عمارتیں نیچی مگر لمبی لمبی تھیں۔ انہوں نے ایک چپٹے اہرام کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ کوبیاشی نے اس کے متعلق بتایا ''گاڑیوں کے پرزے بنانے والی یہ فیکٹری مکمل طور پر خودکار ہے۔ اس میں صرف دیکھ بھال اور انتظامی امور نمٹانے والا مختصر سا عملہ کام کرتا ہے اور یہ سارے کا سارا وسطی اہرام نما عمارت میں متعین ہے۔ اچھا آپ یہ بتائیں کہ آپ کے خیال میں ہمیں قطبین کے درمیان ریلوے لائن بچھانے کی ضرورت کیوں ہے؟''

''نارتھ پولر کنسورشیم میں 46 جاپانی ادارے وسیع پیمانے پر صنعتی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ قطب جنوبی کے علاقے میں یورپین انڈسٹریل پارک بھی چھوٹا نہیں ہے۔ اگر ان دونوں کے درمیان سامان کی نقل وحمل کا کوئی سستا ذریعہ میسر آجائے تو آپ لوگ باہمی تجارت کو منافع بخش بنیادوں پر استوار کرسکتے ہیں۔'' لو نے اپنے موقف کے حق میں دلیل دیتے ہوئے کہا۔

''ہم نے ایسی تجارت کے امکانات کا اپنے طور پر مطالعہ کیا ہے۔ اگرچہ اس تجارت کے کامیاب ہونے کا قوی امکان بھی نظر آتا ہے لیکن ریلوے لائن بچھانے کے لیے جو بے پناہ سرمایہ کاری کرنا پڑے گی، اس کی بدولت اس تجارت کی افادیت ماند پڑجاتی ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اس سرمایہ کاری سے منافع حاصل کرنے میں کیونکر کامیاب ہوں گے؟''

ٹموتھی لو مسکرایا ''میں نے آپ کی مطالعاتی رپورٹ دیکھی ہے۔ میں اس کے بارے میں بس یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ مطالعہ نہایت محدود ہے۔''

''میں بھی آپ کے نظام جاسوسی کی داد دیتا ہوں، مسٹر لو۔ تو آپ کو امید ہے کہ آپ اس منصوبے کا ایک شیئر کنسورشیم کو فروخت کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے؟''

''قطعاً نہیں۔''

''نہیں؟ کیا مطلب؟''

''دراصل یہ لائن پوری کی پوری میری ہوگی۔''
ٹموتھی لو نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ ''میں نے بنکوں کے ایک گروپ کو مالی تعاون پر رضامند کرلیا ہے۔ لیکن وہ قرضوں کی فراہمی کے لیے اتنی بڑی ضمانتیں طلب کر رہے ہیں، جو میرے اثاثہ جات سے کہیں زیادہ ہیں۔ میری خواہش ہے کہ کنسورشیم والے اس معاہدے میں میرے شریک بن جائیں جس کے بدلے میں ہم سامان کی نقل و حمل کے معاہدوں میں انہیں پرکشش مراعات دیں گے۔''

''آپ ہمیں جس فائدے کا لالچ دے رہے ہیں، وہ اس نقصان سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتا جس کا خطرہ ہمیں آپ کے معاہدے کا شریک بن کر مول لینا ہوگا۔''

ٹموتھی لو کئی سیکنڈ تک خاموش رہا۔ پھر سپاٹ لہجے میں بولا ''اگر میں دیوالیہ ہو جاؤں تو یہ پوری کی پوری ریلوے لائن آپ کی ہوگی۔''

قافلہ نپان اٹامکس کے استقبالی دروازے پر پہنچ چکا تھا جو ایک بڑے گیٹ اور ایک بلند حفاظتی جنگلے پر مشتمل تھا۔ کافی فاصلے پر نو عدد سفید گنبد، جن میں سے زرد رنگ کا دھواں برآمد ہو رہا تھا، کمپلیکس کے اوپر سے جھانکتے ہوئے ایک فالِ بد کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔

نارتھ پولر کنسورشیم کا چیف ایگزیکٹو اس کی طرف پُرتجسس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لو ایک احمق ہے اور ناکامی اس کا مقدر ہے۔ لیکن کیا اس احمق میں اتنی صلاحیت ہے کہ اپنی ناکامی سے پہلے ریلوے لائن بچھانے کا کام سرانجام دے ہی ڈالے؟ اگر ایسا ہے تو کنسورشیم سودے بازی کر کے اس شخص کی قیمت لگا سکتا ہے۔

''میرا خیال ہے کہ ہم آپ کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتے ہیں''، ماسا کو بیاشی نے سکوت توڑا۔ فی الحال آپ اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر آرام کریں۔ اس کے بعد کسی وقت ہم اپنے شعبہ جاتی سربراہوں کا ایک اجلاس طلب کریں گے تاکہ آپ اپنے منصوبے کی تمام تفصیلات ان کے سامنے رکھ سکیں۔''

''مجھے ایسا کر کے بہت خوشی ہوگی۔''

''ایک بات آپ کو اور بتا دوں۔ آپ قطبین کے درمیان ریلوے لائن بچھانے کا منصوبہ لے کر ہمارے پاس آنے والے واحد شخص نہیں ہیں۔ آپ کا پراسپیکٹس ملنے کے کچھ ہی دیر بعد ایک آئرش تاجر مائیکل کلین نے بھی مجھ سے اسی سلسلے میں رابطہ کیا تھا۔''

ٹموتھی لو کا رنگ پھیکا پڑ گیا ''مائیکل کلین؟ میں اسے بالکل نہیں جانتا۔''

''اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا منصوبہ آپ کے منصوبے سے حیرت انگیز حد تک ملتا جلتا ہے۔''

''یہ بات بتانے پر میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ لگتا ہے مجھے اپنے اردگرد کچھ صفائی کرنا پڑے گی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے اس کے بجائے میرے ساتھ مذاکرات کرنے کو ترجیح کیوں دی؟''

''دراصل اس کے ای آئی پی (یورپین انڈسٹریل پارک) والوں کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔ وہ اس وقت وہیں پر ہے اور غالباً انہیں مالی تعاون کے لیے آمادہ کر رہا ہوگا۔''

''تو یہ بات ہے۔ ریلوے لائن تعمیر ہونے کی صورت میں آپ اس سے فائدہ اٹھانے میں پیچھے نہیں رہنا چاہتے لیکن میں آپ کو بتا دوں، ریلوے لائن ضرور بنے گی تو میری ہوگی..... صرف میری۔''

خود غرضی اور سازشوں سے بھری منصوبے کی تفصیلات آئندہ شمارے میں

طب و صحت

ورزش کے سات سچ

جو دراصل غلط ہیں

ان 7 طبی مغالطوں کا تذکرہ جنھیں جدید طبی سائنس نے واضح کیا اور جو طویل عرصے سے زندگی کو مشکل بنا رہے تھے!

ڈاکٹر نصیر علی

اچھی غذا کے بعد صحیح ورزش سے انسان عمدہ صحت پا سکتا ہے۔ لیکن بہت سے مردوزن نہیں جانتے کہ صحیح ورزش کیسے کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ورزش سے متعلق کئی مغالطے اور دیومالائی باتیں مشہور ہو چکی۔ ان مغالطوں میں 7 بڑے مغالطے درج ذیل ہیں۔

1۔ صبح خالی پیٹ ورزش کرنے سے زیادہ چربی گھلتی ہے۔

سائنسی تحقیق اور تجربات سے ثابت ہو چکا کہ درج بالا نظریے میں کوئی صداقت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ اپنے وقت کے مطابق خصوصاً ایروبک ورزش کریں تو زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ ورزشیں کرنے میں وقت کی قید نہیں، آپ صبح، دوپہر یا شام، کسی بھی وقت کر سکتے ہیں۔

جیراڈ ریکو ورزش کی سائنس کا مشہور امریکی ماہر ہے۔ وہ کہتا ہے ''اگر آپ نے درج بالا بات پر عمل کیا تو فائدے سے زیادہ نقصان ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ انسان خالی پیٹ ورزش کرے تو اس کی توانائی جلد خرچ ہو جاتی ہے۔ نیز ورزش بھی کسی کام کی نہیں رہتی۔''

جیراڈ ریکو مشورہ دیتے ہیں کہ جب بھی ورزش کریں خصوصاً صبح تو پہلے کوئی پھل یا ایسی شے کھا لیں جو بآسانی ہضم ہو سکے۔ یوں دوران ورزش اعصاب اور جسم کو مناسب توانائی مل جاتی ہے۔

2۔عضلات کا وزن چربی سے زیادہ ہوتا ہے

ایروبک ورزش اور تن سازی کے کلبوں میں جانے کے بعد بعض اوقات وزن کم نہیں ہوتا۔ وہاں موجود ماہرین وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ان کا وزن اس لیے کم نہیں ہوا کیونکہ عضلات (Muscles) کا وزن چربی سے کم ہوتا ہے۔ مگر یہ بات غلط ہے۔ ایک کلو چربی اور ایک کلو عضلات کا وزن برابر ہوتا ہے۔ یہ مساوات دیگر اشیاء پر بھی صادق آتی ہے۔

الجھاؤ دراصل وزن نہیں دبازت (Density) کے باعث پیدا ہوا۔ عضلات، چربی سے زیادہ ٹھوس پن یا کثافت رکھتے ہیں..... یعنی ایک کلو عضلات ایک کلو چربی کی نسبت کم جگہ گھیرتے ہیں۔ تن سازی اور ایروبک ورزشوں کا فائدہ یہ ہے کہ وہ عضلات کو بھینچ دیتی ہیں۔ یوں وزن بے شک کم نہ ہو، انسان سمارٹ اور دبلا نظر آتا ہے۔ لہٰذا ان کا معتدل استعمال جاری رکھیے۔

3۔کم شدت کی ورزش زیادہ چربی گھلاتی ہیں

یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ کم شدت کی ورزش کرنے سے چربی کے حرارے (Calories) کم جلتے ہیں۔ جب کہ سخت ورزش کرنے کے نتیجہ میں نشاستہ (کاربوہائیڈریٹ) جلتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ ورزش سے کتنے حرارے جلے؟ چاہے آپ کسی قسم کی ورزش کریں، تبھی جسمانی وزن کم ہونے سے فائدہ ہو گا۔ اصول یہ ہے کہ جتنی سخت ورزش کی جائے، اتنے ہی زیادہ حرارے جلتے ہیں۔ ایسی ورزش کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ جسم میں شرح استحالہ (Metabolic rate) بھی بڑھا دیتی ہے۔ چنانچہ ورزش ختم ہونے کے بعد بھی جسم (عموماً چربی سے) حرارے گھلاتا رہتا ہے جب کہ کم شدت والی ورزشوں سے یہ فائدہ نہیں پہنچتا۔ لہٰذا خصوصاً دبلا ہونے کی خاطر سخت ورزشیں ہی مفید ہیں۔

4۔ انسان ورزش جاری رکھے، تو کچھ بھی کھا سکتا ہے۔

یہ بالکل غلط ہے۔ اس ضمن میں جیراڈ ریکو کا کہنا ہے کہ ورزش کرنے والا مرد وزن کبھی کبھی تو بازاری غذا (Junk food) کھا سکتا ہے، لیکن یہ سوچ کر اسے عادت بنا لینا نقصان دہ ہے کہ میں تو ورزش کرتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ بازاری غذا کی بہت ساری چکنائی بحیثیت "امعائی یا بطونی (Visceral) چربی" اندرونی اعضاء کے گرد جمع ہو جاتی ہے۔ یہ چربی انسانی صحت کو بہت نقصان پہنچاتی ہے۔

مزید برآں انسان ایک طرف ورزشیں کرے اور دوسری طرف بازاری غذائیں کھائے، تو اس کی جسمانی و روحانی صحت کو مطلوبہ فائدہ نہیں پہنچتا۔ ورزشوں سے تندرستی اسی وقت ملے گی جب انسان اچھی غذائیں کھائے۔

5۔ جو خواتین زیادہ وزن اٹھائیں، وہ جلدی طاقتور ہو جاتی ہیں۔

کئی خواتین سمجھتی ہیں کہ تن سازی کی بدولت وہ بھی مضبوط اور ابھراوں پٹھے حاصل کر سکتی ہیں لیکن وہ بھول جاتی ہیں کہ تن ساز کئی گھنٹے وزن اٹھانے اور خصوصی غذائیں کھانے کے بعد ہی مضبوط پٹھے حاصل کرتے ہیں۔ یہ چند ہفتے یا ماہ کا کھیل نہیں۔

تاہم ماہرین ہلکا وزن اٹھانے کی ورزشوں کو خواتین کے لیے مفید قرار دیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یوں ان کے جسمانی پٹھے بڑھتے اور ہڈیوں کی کمیت (Mass) میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ یہ دونوں عمل پھر خاتون کو ہڈیوں کے بھربھرے پن والی بیماری (Osteoporosis) سے بچاتے ہیں۔ مزید برآں پٹھے بڑھنے سے چربی بھی جلتی ہے۔ لہٰذا معتدل لحاظ سے وزن اٹھانا خواتین کے لیے مفید ہے۔

6۔مخصوص حصہ کم کرنا ممکن ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مخصوص ورزشوں کے ذریعے جسم کے کسی خاص عضو یا حصے کی چربی بالکل ختم کرنا ممکن ہے۔ اصطلاح میں یہ طریق کار Spot Reducing کہلاتا ہے۔ لیکن یہ بھی غلط نظریہ ہے، وجہ یہ ہے کہ جب ورزش یا کسی بھی جسمانی سرگرمی کے ذریعے ہمارا بدن چربی گھلانے کا کام شروع کرے، تو وہ ہر عضو یا حصے سے تھوڑی تھوڑی چربی گھلاتا ہے۔ اسی لیے کسی ورزش یا دوا سے صرف کسی ایک مخصوص حصہ جسم کی چربی گلانا ممکن نہیں، یہ اثر باقی اعضا پر بھی پڑتا ہے۔

7۔ورزش جتنی زیادہ کی جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔

تن سازی کے شوقین اور جسم کو چاق چوبند رکھنے کی آرزو رکھنے والے یقین رکھتے ہیں کہ ورزش جتنی زیادہ کی جائے، وہ اتنا ہی فائدہ پہنچاتی ہے۔ لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ صرف ورزش سے عضلات کی نشوونما نہیں ہوتی اور نہ بدن چست ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ موزوں غذا کھائی جائے اور مناسب آرام بھی کیا جائے۔ تبھی ورزشوں سے فائدہ ہوتا ہے۔

■■■

کیل مہاسے نکلنے کی 10 وجوہات

ان بنیادی وجوہات کا ذکر جو لڑکے اور لڑکیوں کی زندگی مشکل بنا دیتی ہیں

حنا انور

خوبصورت اور پرکشش نظر آنا انسانی فطرت میں شامل ہے ہر کوئی خواہ مرد ہو یا عورت جسمانی و ذہنی طور پر تندرست رہنا چاہتا ہے بلکہ فطری طور پر بھی ہر دم خوبصورت اور دلکش نظر آنے کی خواہش رکھتا ہے۔

نبیلہ کی عمر 22 برس تھی، پرائیویٹ گریجوایشن کرنے کے بعد گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھی اس کے والد محنت مزدوری کرتے تھے۔ جب سے بیٹی نے ٹیوشن سنٹر کھولا تھا گھر کے حالات قدرے بہتر ہونے لگے تھے۔

نبیلہ کی منگنی ہو چکی تھی اور اسی سال شادی بھی متوقع تھی۔ نبیلہ کے چہرے پر دانے نکلنا شروع ہو گئے شائد وہ ان کو اس قدر سنجیدگی سے نہ لیتی لیکن اکیڈمی پڑھنے والے بچوں کی مائیں جب بھی آتیں اسے طرح طرح کے مشورے دیتیں کوئی ہلدی چندن کا لیپ بتاتی، تو کوئی بیسن سے منہ دھونے کا مشورہ دیتی، کسی کی نظر میں ایلوویرا سے بہتر کوئی حل نہ ہوتا تو کوئی مختلف قسم کی کریمیں مکس کر کے لگانے کو نجات دہندہ بتاتی۔ نبیلہ اس قدر پریشان رہتی چنداں ٹوٹکے اور ادویہ استعمال کرتی رہتی۔ ایک دن کسی خاتون نے بتایا کہ ایک حکیم صاحب انڈیا سے تشریف لائے ہیں اور ان کے گھر کے پاس ہی حکمت خانہ کھولے بیٹھے ہیں اگر وہ ساتھ چلے تو وہ اسے بھی دوا دلوا دے گی، جس سے امید ہے چند دن میں یہ دانے غائب ہو جائیں گے۔ اور ثبوت کے طور پر اپنے خاندان کی چار چھ لڑکیوں کے شفا یاب ہونے کے قصے بھی سنا ڈالے۔ نبیلہ پہلے ہی ستی ہوئی تھی اگلے ہی دن حکیم صاحب کے پاس پہنچ گئی۔ حکیم صاحب نے دیکھتے ہی وجہ خون کی گرمی بتائی اور کھانے کو چند جڑی بوٹیوں سے بنی دوا دے دی۔ دوا کھاتے ہی نبیلہ کی ٹانگ میں درد شروع ہو گیا جسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی، دوا کے مسلسل استعمال سے درد پورے جسم میں پھیل گیا۔ رات سوئی اور صبح ماں کے اٹھانے پر بھی اٹھ نہ سکی۔ نبیلہ کی موت کے بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ ٹھنڈی ادویہ کے استعمال سے اس کے جسم میں خون کا بہاؤ رک گیا تھا اور اس کے اعصاب پر اتنا تناؤ بڑھ گیا تھا جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ یہ تو کہانی تھی نبیلہ کی جو ایک نااہل حکیم کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گئی ایسا ہر دفعہ تو نہیں ہوتا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم سب ہی کیل مہاسوں سے گھبراتے ہیں اور اس سعی میں رہتے ہیں کہ ان سے پیچھا چھڑا سکیں۔

کیل مہاسے بظاہر ایک معمولی سا مرض ہے لیکن مریض کیلئے نفسیاتی الجھاؤ کا باعث بنتا ہے۔ مریض بے بسی سے کبھی تو ان کو مختلف صابنوں سے دھونے کی کوشش کرتا ہے یا ان پر مختلف کریمیں لگا کر، گھریلو ٹوٹکے آزما کر ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن مرض بڑھتا ہی جاتا ہے۔ کیل مہاسے 80% کیسز میں خود ہی ختم ہو جاتے ہیں بشرطیکہ مریض ان کو چھیڑنے سے اجتناب کرے اور ان کو نفسیاتی مسئلہ نہ بنا لے۔ چند مریض اس معاملے میں یہ شدت اختیار کر جاتے ہیں، اس کی پہلی اور سب سے بڑی وجہ نفسیاتی و جذباتی دباؤ ہے۔ عموماً مریض کے دوست اور سہیلیاں اس کو بھدے پن کا احساس دلاتے رہتے ہیں اور اسے مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ ان کے متعلق ہی سوچتا رہے۔ بعض نوجوان ان کو اپنی شخصیت کا عیب سمجھنے لگے ہیں۔

ماہرین امراض جلد کا کہنا ہے کیل مہاسے و پھوڑے پھنسیاں نکلنا ایک پیچیدہ طبی مسئلہ ہے اور 75% لوگ 11 سے 33 سال کی عمر میں کسی بھی وقت اس کا شکار ہو سکتے ہیں۔ یہ چار عناصر کے باعث جنم لیتا ہے: ''ہارمون، سوزش، جراثیم اور جلد کے مردہ خلیے جو جلدی سوراخ بند کر ڈالتے ہیں۔''

یہ چار عناصر مختلف وجوہ کی بنا پہ پھوڑے پھنسیاں پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً پوری نیند نہ لینا، ذہنی دباؤ اور خراب غذا۔ بعض لڑکیاں چاکلیٹ کھائیں تو پھنسیاں ان پر حملہ کرتی ہیں اور کچھ لڑکے چربیلی یا تیل والی غذائیں کھا کر کیل مہاسوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ ذیل میں ایسی 10 خفیہ اشیا یا وجوہ درج ہیں جن سے لڑکے، لڑکیاں عموماً بے خبر رہتے ہیں۔ لیکن یہ پھنسیاں وغیرہ پیدا کر سکتی ہیں۔

1۔ موبائل فون

آپ کا موبائل جیسا بھی ہو، وہ روزمرہ استعمال کے دوران دھول مٹی اور جراثیم کا گڑھ بن جاتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ گال یا منہ کے ساتھ بار بار مس ہو تو جراثیم آخر کار جلد میں ڈیرا لگا کر پھنسیوں کا پیش خیمہ بنتے ہیں۔ لہٰذا اگر آپ کی جلد حساس ہے تو روزانہ رات کو اپنا موبائل کسی جراثیم کش محلول سے صاف کیجیے۔

2۔ چٹائی

گھر ہو دفتر یا جم خانہ، کمروں میں کہیں نہ کہیں چٹائیاں نظر آتی ہیں۔ بہت سے لوگ آرام کرنے یا ستانے کی خاطر ان پر بیٹھ یا لیٹ جاتے ہیں۔ تب لازماً ہاتھ پیر اور سر و منہ ان سے مس ہوتے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ ان چٹائیوں کو دن بھر سیکڑوں لوگ استعمال کرتے ہیں۔ ان میں کوئی صاف ستھرا ہوتا ہے اور کوئی گندا۔ پھر چٹائی پر لیٹے ہوئے کون جانتا ہے کہ جہاں اس کا منہ ہے، وہاں کسی نے پیر رکھے تھے؟ بہرحال یوں چٹائی پر موجود مختلف اقسام کے جراثیم بھی چہرے یا ہاتھوں پر منتقل ہو جاتے ہیں۔ وہ پھر پھوڑے جنم دیتے ہیں۔ لہٰذا کسی جگہ چٹائی پر بیٹھنا ناگزیر ہے تو صاف تولیہ ساتھ رکھیے اور جہاں چہرہ و سر چٹائی سے ٹکرائے وہاں تولیہ رکھ لیں۔

3۔ میک اپ

کریمیں، لوشن اور دیگر سامان آرائش سے عموماً چہرے، گردن اور سر پر کیل یا پھنسیاں نکلتی ہیں۔ دراصل میک اپ کی جس شے میں معدنی تیل (Mineral Oil) شامل ہو، وہ جلدی سوراخ بند کر دیتی ہے۔ لہٰذا لڑکیوں کو چاہیے کہ وہ معدنی تیل سے پاک سامان آرائش استعمال کریں۔ یہ اصلاحاً نان کومیڈوجینک (Non-Comedogenic) اشیا کہلاتی ہیں۔

نان کومیڈوجینک سامان آرائش جلدی سوراخ بند نہیں کرتا۔ بلکہ جلد ضروری غذائیت (Nutrients) سے بھی محروم نہیں ہوتی۔ یہ واضح رہے کہ میک اپ برش بھی دوران استعمال جراثیم جمع کرتے اور پھپھوندی کا نشانہ بنتے ہیں۔ لہٰذا ہفتے میں ایک بار انھیں صابن اور پانی سے ضرور صاف کیجیے۔

اس کے علاوہ ہر رات چہرے پر لگی فاؤنڈیشن اور پاؤڈر صاف کرنا بھی ضروری ہے۔ ورنہ ان کے باعث بہت جلد پھنسیاں نکل آتی ہیں۔ ماہرین امراض جلد کا کہنا ہے کہ میک اپ صاف کرنے کی خاطر ایکسفولیٹنگ (Exfoliating) پیڈ اور واپس استعمال کیجیے۔ دراصل یہ نرم انداز میں صابن سے زیادہ جلدی مردہ خلیے صاف کرتے ہیں۔

کیل مہاسوں کے متعلق چند حقائق

☆ کیل مہاسے کے شکار لوگوں میں سے 80% خواتین ہوتی ہیں۔

☆ کیل مہاسوں کی وجہ سے 92% مریض شدید ذہنی تناؤ محسوس کرتے ہیں جن میں سے 14% لوگ ایسے ہیں جو خودکشی کرنے کا بھی سوچتے ہیں۔

☆ ایک اندازے کے مطابق گلوبل ایکنی مارکیٹ کی سالانہ آمدنی سال 2016ء تک 3.02 بلین ڈالر تک پہنچ جائے گی۔

☆ کیل مہاسوں کے علاج کے لئے کچھ ڈاکٹر حضرات مریض کو اینٹی بائیوٹکس ادویہ کا استعمال کرواتے ہیں اس سے کیل مہاسے تو قدرے کم ہو جاتے ہیں لیکن ان کا زیادہ استعمال جسم میں بیکٹریا کے خلاف مزاحمت میں کمی کا باعث بھی بنتا ہے۔

4۔ جلد جوان رکھنے والی کریمیں

کئی مرد و زن اور لڑکے لڑکیاں بھی جلد جوان رکھنے والی Anti-Aging کریمیں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان کریموں کا زیادہ استعمال خطرناک ہے۔ دراصل ان میں ریٹنول (Retinol) نامی مادہ شامل ہوتا ہے۔ یہ مادہ جلدی خلیوں کی افزائش بڑھاتا اور یوں ان میں پھنسی پھوڑے جنم لینے کا امکان بڑھا دیتا ہے۔ پھر ایسی کریمیں چکنی (Oily) بھی ہوتی ہیں۔ لہٰذا ماہرین خصوصاً لڑکے، لڑکیوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ انھیں استعمال نہ کریں۔

5۔ ادویہ

جی ہاں، کئی ادویہ بھی پھوڑے پھنسیاں پیدا کرنے کا سبب بن سکتی ہیں۔ ان میں سٹیرویڈ والی یہ تین ادویہ نمایاں ہیں: پریڈنیسون (Prednisone)، کورٹیسون اور ہائیڈروکورٹیسون۔ ان کے علاوہ وہ ادویہ بھی خطرناک ہیں جن میں لیتھیم، لیتھیم کلورائیڈ اور آئیوڈین کی مخصوص اقسام شامل ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ یہ تمام ادویہ خطرناک امراض دور کرنے میں مستعمل ہیں۔ نیز ان کی متبادل ادویہ بھی بہت کم ہیں۔ چنانچہ لوگ بعض اوقات مجبور ہوتے ہیں کہ انہی کو استعمال کریں۔ یوں پھر انھیں پھوڑے پھنسیاں بطور ضمنی اثر برداشت کرنا پڑتی ہیں۔

6۔ خشکی

سر کی مردہ جلد خشکی (Dandruff) بن کر جھڑتی ہے۔ ہوشیار رہیے، جن لڑکے لڑکیوں کی جلد حساس ہے، ان کے سر پر خشکی پڑ پڑ کر ننھی پھنسیاں پیدا کر سکتی ہے۔ لہٰذا خشکی کا علاج جڑی بوٹیوں یا شیمپو سے کیجیے۔

7۔ بالوں کی کریمیں وجیل

لڑکے لڑکیوں میں بال ''سیٹ'' کرنے کی خاطر ہیئر جیل استعمال کرنا عام ہے۔ لیکن ان جیلوں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ان کا تیل کبھی کبھی ماتھے یا آس پاس کے علاقے کی جلد میں جذب ہو جاتا ہے۔ وہ پھر جلدی سوراخوں میں پھنسیاں پیدا کرنے والے جراثیم دبوچ لیتا ہے۔ لہٰذا ہیئر جیل ماتھے سے دور رکھیے اور کوشش کریں کہ کھوپڑی میں بھی زیادہ جذب نہ ہو۔

8۔ سفر و سیر

انسان جب اپنے وطن سے دوسرے ملک جائے تو موسم و ماحول کی تبدیلی حتیٰ کہ پانی میں موجود معدنیات اور فلورائیڈ بھی پھنسیاں وغیرہ جنم لینے کا سبب بن جاتی ہیں۔ ظاہر ہے ان قدرتی عناصر و اشیا سے لڑنا محال ہے۔ تاہم آپ یہ ضرور کیجیے کہ ہوٹل کا صابن استعمال نہ کریں اور جہاں تک ممکن ہو، بوتل کے صاف و مصفّی پانی سے منہ دھوئیے۔

9۔ ذہنی دباؤ

انسان جب ذہنی دباؤ (Stress) کا نشانہ بنے تو اس میں اینڈروجن ہارمون خارج ہوتا ہے۔ لڑکے لڑکیوں میں یہی ہارمون عنفوان شباب کا آغاز کرتا۔ مزید برآں ذہنی دباؤ کورٹیسول اور برگردہ (Adrenal) عضو کے دیگر کیمیائی مرکبات بھی خارج کراتا ہے۔ یہ مرکب جلد کے چربیلے غدود (Sebaceous Glaenl) متحرک کرتے اور یوں پھنسیاں پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

ماہرین طب کا کہنا ہے کہ گو ذہنی دباؤ براہ راست

کیل مہاسے وغیرہ کو جنم نہیں دیتا، تاہم وہ صورت حال گھمبیر بنا دیتا ہے۔ لہٰذا خصوصاً نوجوان نسل کو چاہیے کہ وہ ذہنی دباؤ کا شکار نہ ہو، ہنسی خوشی وقت گزارے اور روزانہ 15 منٹ اپنی پسند کی سرگرمی میں مصروف رہ کر گزاریں۔ مزید برآں ورزش بھی کریں کیونکہ یہ ذہنی دباؤ ختم کرتی ہے۔

10۔ ہیلمٹ کی پٹی

کئی نوجوان لڑکے بائیک چلاتے ہوئے ہیلمٹ پہنتے اور اس کی پٹی ٹھوڑی تلے باندھتے ہیں۔ اس پٹی پر جراثیم کی یلغار رہتی ہے۔ لہٰذا وہ بھی چہرے پر پھنسیاں پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا ماہرین طب مشورہ دیتے ہیں کہ ہیلمٹ کی پٹی روزانہ جراثیم کش محلول سے صاف کیجیے۔

اگر آپ کے چہرے پر کیل مہاسے ہیں تو آپ کس طرح اپنی جلد کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں؟

1۔ چہرے کو دن میں صابن سے دوبار سے زیادہ نہ دھوئیے، چہرے پر سکرب کے استعمال سے ہمیشہ گریز کریں کیونکہ سکرب سے کیل مہاسے چھل جاتے ہیں اور جراثیم پورے چہرے پر پھیل جاتے ہیں۔ منہ نیم گرم پانی سے دھوئیں۔

2۔ کیل مہاسے کو ہاتھ سے پھوڑنے کی ہرگز کوشش نہ کریں اس سے نہ صرف بیکٹیریا پورے چہرے پر پھیلے گا بلکہ داغ پڑ جانے کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔

3۔ دانوں یا کیل مہاسوں کو بار بار چھونے سے گریز کریں کچھ لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ وہ بے خیالی میں اپنے چہرے کو چھوتے رہتے ہیں جب کہ ایسا کرنے سے آپ نہ صرف ہاتھوں پر لگے جراثیم اپنی جلد میں منتقل کر رہے ہوتے ہیں بلکہ پہلے سے موجود کیل مہاسوں کو بڑھانے میں بھی مدد کر رہے ہوتے ہیں۔

4۔ اپنے ہاتھ ہمیشہ صاف اور دھو کر رکھیے۔ ہر چیز دھونے سے پہلے یا کسی بھی قسم کا لوشن یا کریم چہرے پر لگانے سے پہلے خاص طور پر ہاتھ دھوئیے اور بعد میں بھی۔

5۔ اپنی عینک کو بھی صاف رکھیے کیونکہ یہ بھی Sebum پھیلانے کا باعث بنتی ہے۔

6۔ آپ کی جلد کو سانس لینے کی ضرورتی ہوتی ہے۔ خاص طور پر اگر دانے یا کیل مہاسے آپ کے کندھوں، کمر یا جسم کے کسی اور حصے پر ہوں تو تنگ کپڑے پہننے سے گریز کریں اور اگر آپ سر یا چہرے کو اسکارف وغیرہ سے ڈھانپ کر رکھتی ہیں تو اس بات کو ضرور ممکن بنائیں کہ اسکارف وغیرہ صاف ہوں اور ایک دفعہ لیا ہوا اسکارف دوبارہ دھو کر ہی استعمال کیا جائے۔

7۔ میک اپ اتارے بغیر کبھی نہ سوئیں اور ایسا میک اپ قطعاً استعمال نہ کیجیے جو چہرے کے مسام بند کر دیتا ہو یا جس میں تیل کی مقدار زیادہ ہو۔

8۔ اپنے بال صاف ستھرے اور چہرے سے دور رکھیں۔

9۔ سورج سے جلد کو جہاں تک ممکن ہو بچا کر رکھیں خصوصاً اگر آپ دانوں یا کیل مہاسوں کا علاج کرا رہے ہو کیونکہ علاج کے دوران جلد بہت حساس ہوتی ہے اور سورج میں جھلسنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

10۔ اپنے تکیے کے غلاف کو ہمیشہ صاف رکھیں، چہرے کو تولیے کی بجائے ٹشو پیپر سے صاف کریں، چہرہ صاف کرتے ہوئے خاص طور پر رگڑنے سے گریز کریں۔ ■■■

گلاب

ہاتھ میں ہو، آنکھ میں ستارہ ہو

دس ہزار قسموں کے حامل ایک ایسے پھول کا تذکرہ جس کی پنکھڑیاں سوکھ کر بھی خوشبو دیتی ہیں

سخی رشید اعوان

ہمہ صفات بھی ہے اس کا نام گلاب ہے ایک ایسا پھول کہ جسے دیکھ کر رخِ محبوب کا مغالطہ و مبالغہ ہونے لگے اسے گلاب کہتے ہیں۔ گلاب قدیم زمانے سے شعراء اور ادیبوں کا من پسند پھول رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گل رخ محبوب کا ذکر گلاب کے بغیر ممکن ہی نہیں، کسی بھی زبان یا خطے کی شاعری گلاب کی خوشبوؤں کا ہاتھ ہواؤں کے ہاتھ میں دینے والی اور رنگ برنگے پھولوں کی پنکھڑیاں چننے والی صبا رخ شاعرہ پروین شاکر کا ایک خوبصورت شعر ہے کہ

گلاب ہاتھ میں ہو آنکھ میں ستارہ ہو
کوئی وجود محبّت کا استعارہ ہو

بلبل فارس حافظ شیرازیؒ اپنی ایک غزل میں گلاب کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

از خیالِ لطف مے مشاطۂ چالاک طبع
در ضمیر برگ گل خوش میکند پنہاں گلاب

یعنی چالاک طبع مشاطہ شراب کے لطف کے خیال سے پھول کی پتی کے دل میں اچھی طرح گلاب بھر رہی ہے۔

گلاب کا ذکر ہمیں فارسی کی صوفیانہ شاعری میں بھی جا بہ جا نظر آتا ہے۔ برصغیر کے معروف صوفی بزرگ حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی کا دل کو چھو لینے والا شعر ہے کہ

اے زاہد ظاہر بین از قرب چہ می پرسی
اورمن و من در او چوں بو بہ گلاب اندر

یعنی اے ظاہر پرست صوفی مجھ سے قرب کے بارے میں کیا پوچھتا ہے، وہ مجھ میں اور میں اس میں اس طرح ہوں جیسے گلاب میں خوشبو بسی ہوتی ہے۔

گلاب میں خوشبو اس کی معراج تصور کی جاتی ہے۔ مشرقی ذوق اور طبع کے مطابق یہ صرف گلاب کے پھولوں پر ہی موقوف نہیں بلکہ یہاں ہر پھول میں مہک کا ہونا لازمی امر خیال کیا جاتا ہے۔

ایک ایسا پھول جو صناعِ ازل کی رنگا رنگی سے مرصع ہونے کے ساتھ ساتھ

تشبیہات اور استعارات سے بھری پڑی ہے شاعری میں جس قدر گلاب کا ذکر ہے اتنا کسی دوسرے پھول کا نہیں۔تہذیب وتمدن کے آغاز سے لے کر آج دن تک گلاب محبت کے استعارے کے طور پر مستعمل چلا آرہا ہے۔

600 سال قبل مسیح میں یونان کی معروف شاعرہ سیفو نے اپنی شاعری میں گلاب کو پھولوں کی ملکہ کا خطاب دیا تھا۔ 400 سال قبل مسیح میں ایک یونانی فلاسفر نے ''ہسٹری آف پلانٹس'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں گلاب کی کاشت کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔اسی کتاب میں گلاب کو بیج کے بجائے قلم سے کاشت کرنے پر زور دیا گیا ہے، آج پوری دنیا میں زیادہ تر گلاب اسی طریقہ سے کاشت کیا جارہا ہے۔

قدیم قصے کہانیوں میں لکھا ہے کہ کورنتھین کوئین رہوڈنتھی نے اپنے پرستاروں سے گھبرا کر گلاب کا روپ اختیار کر لیا تھا۔رومن بادشاہ نیرو جب اپنے دربار میں محفل موسیقی منعقد کرتا تو فواروں میں پانی کی جگہ عرق گلاب استعمال کیا جاتا تھا۔

انگریزی زبان وادب کے ستون ولیم شیکسپیئر نے کہا تھا کہ گلاب کا کوئی بھی نام رکھ دیجیے گلاب، گلاب ہی رہے گا۔گلاب کا شمار دنیا کے خوبصورت ترین اور قدیم پھولوں میں ہوتا ہے۔

گلاب کو اردو اور پنجابی میں گلاب، فارسی میں گلِ سرخ، عربی میں ورد ،سندھی میں جَرپھل اور انگریزی میں روز کہتے ہیں، لفظ گلاب فارسی زبان کے دو االفاظ گل اور آب کا مجموعہ ہے جس کے معنی چمک دار روشن پھول کے ہیں۔ انگریزی زبان کا لفظ روز لاطینی زبان کے لفظ روزا سے جبکہ لاطینی زبان کا لفظ روزا یونانی زبان کے لفظ رہوڈون سے مشتق ہے۔ رہوڈون کی بنیاد یا مادہ فارسی اور عربی زبان کا لفظ ''ورد'' ہے۔

علم نباتات کے مطابق گلاب کے پودے خاندان Roseceae کہلاتا ہے۔ سیب، ناشپاتی، آڑو، آلو بخارا، خوبانی، بادام، چیری اور رس بھری بھی اسی خاندان کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ اٹلی کے ایک قدیم شہر سائی پیرس میں گلاب کی خشک پنکھڑیوں سے بستروں کے گدے اور تکیے بھرے جاتے ہیں جو سونے والے کو راحت خوشبو اور فرحت مہیا کرتے ہیں۔ ترک اور رومی اپنے اکثر کھانوں پر گلاب کی پتیاں اور عرق گلاب چھڑکتے ہیں۔ ترکی میں کسی خاص مہمان کا استقبال بیرونی دروازے پر عرق گلاب چھڑک کر کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس رسم کو تیل ڈھالنا کہتے ہیں۔

گلاب کینیڈا کی کچھ ریاستوں اور امریکہ کے علاوہ برطانیہ کا بھی قومی پھول ہے۔ انگریزوں کی روایات اور تاریخ سے گلاب کا بہت گہرا تعلق ہے۔ ماضی میں انگلستان کے برطانوی بادشاہوں کے تمغوں پر نقش کیا جاتا رہا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے برطانوی گرجاگھروں کے چوبی حصوں پر خوبصورتی کے لیے گلاب کے پھول کندہ کیے جاتے تھے۔ ایک زمانے میں رومن چرچ میں ذکرواذکار کے لئے تسبیح کے دانے بھی گلاب کی پنکھڑیوں کو آپس میں دبا چپکا کر بنائے جاتے تھے تاکہ ان میں بسی خوشبو عبادت گزاروں کی طبیعت کے لیے شادمانی کا باعث ہو، اس تسبیح کے 99 دانے ہوتے تھے اور اسے روزری کہا جاتا تھا۔

دنیا میں گلاب کی تقریباً دس ہزار اقسام پائی جاتی ہیں گلاب کی وہ بنیادی اقسام جنہیں گلاب آباؤاجداد میں شمار کیا جاتا ہے ان کی تعداد 160 ہے۔ اس تعداد میں سے 12 اقسام قدرتی طور پر پاکستان میں پائی جاتی ہیں۔ جنگلی گلاب کا پھول عام طور پر پانچ پنکھڑیوں پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ ایک ٹہنی پر پتوں کی تعداد پانچ یا سات ہوتی ہے۔ چین میں پائی جانے والی ایک جنگلی قسم کی پنکھڑیوں کی تعداد چار ہوتی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میکسیکو میں پائے جانے والے ایک جنگلی گلاب کے پھول کی صرف تین پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔ آسٹریا میں پایا جانے والا جنگلی گلاب جس کا نام کاپر روز ہے، اس کی پنکھڑیوں کا سیدھے رخ سے رنگ نارنجی سرخ اور پشت کی طرف سے پیلا ہوتا ہے۔ گلاب کے جنگلی پودے کا قد 1 ٹ سے لے کر 40 فٹ تک ہوتا ہے۔ گلاب کی چند اقسام بغیر کانٹوں کے بھی ہوتی ہیں۔ ماہرین نباتات کے مطابق گلاب کی ٹہنی پر نکلنے والے کانٹے دراصل کانٹے نہیں بلکہ گلاب کی ٹہنی کی اندرونی سخت لکڑی ہی کا ایک حصہ ہوتے ہیں گلاب کی ایک قسم روزا گالیکا کی پنکھڑیوں کو اگر خشک کر لیا جائے تو پھر بھی وہ تازہ پھولوں ہی کی طرح خوشبو دیتی ہیں۔ سب سے زیادہ خوشبو دینے والا گلاب ملک شام کے علاقہ دمشق میں پایا جاتا ہے جسے گلاب دمشق کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ گلاب دمشق کو یورپ میں پائی جانے والی بہت سی جدید اقسام کے وجد میں شمار کیا جاتا ہے۔ صلیبی جنگوں کے دوران یورپی جنگجو وسط ایشیاء سے جو علم، ہنر اور دیگر اشیاء یورپ لے کر گئے ان میں سے ایک گلاب دمشق بھی ہے۔ اس زمانہ میں اس گلاب کو مذہبی تقدس حاصل تھا۔ دمشق سے لے جایا جانے والا زیادہ تر گلاب گرجاگھروں میں لگایا گیا اور اس کے پھول عبادت کے وقت گرجاگھروں میں نذر کئے جانے لگے۔ یورپ میں پائی جانے والی خوشبو دار گلاب کی زیادہ تر اقسام کی بنیاد یہی گلاب دمشق ہے۔ فرانس میں کشید کیا جانے والا عرقِ گلاب اور عطر گلاب زیادہ تر اسی قسم سے کشید کیا جاتا ہے۔ پانچ ٹن گلاب کی پتیوں سے صرف ایک لٹر عطر کشید کیا جاتا ہے۔ جبکہ پانچ ایکڑ رقبے پر گلاب کاشت کیا جائے تو اس سے لگ بھگ چھ ٹن گلاب کی پتیاں حاصل ہوتی ہیں۔

تاریخی حوالے سے جو ریکارڈ دستیاب ہے اس کے مطابق تقریباً 5 ہزار سال قبل بابل کے بادشاہ سارگن اول نے اسے دجلہ وفرات کے درمیانی علاقے میں کاشت کروایا تھا۔ ماہرین علم نباتات کی تحقیق کے مطابق گلاب کا پودا ہماری زمین پر گذشتہ اڑھائی کروڑ سال سے موجود ہے۔ گلاب کی زیادہ تر اقسام شمالی نصف کرۂ ارض میں پائی جاتی ہیں۔ گلاب کا حقیقی اور آبائی وطن ایران اور چین ہیں۔ انہی دو ممالک سے چل کر گلاب پوری دنیا میں پھیلا ہے۔ 500 قبل مسیح میں چین میں عطر گلاب تیار کیا جاتا تھا مگر اس کے استعمال کی اجازت صرف مخصوص لوگوں کو تھی۔ مسلمانوں کی روایات کے مطابق شروع میں گلاب بغیر خوشبو کے ہوتا تھا پھر ایک دن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینۂ مبارک کے قطرے گلاب کے پھولوں پر گرے تو وہ خوشبو دینے لگے۔ عیسائی روایات کے مطابق سفید گلاب حضرت مریمؑ کی پاکیزگی اور پاک دامنی کے مظہر ہیں اور جب حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو مصلوب کیا گیا تو ان کے زخموں سے گرنے والے خون کے قطروں نے سرخ گلاب کی شکل اختیار کر لی۔ پارسیوں کی مقدس ترین کتاب اَوستا کے مطابق گلاب کا پھول مذہبی نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرزمین بابل اور

ہندوستان میں گلاب کی پرستش کے آثار بھی ملے ہیں۔

اساطیری روایات کے مطابق ہومر اپنی مشہور زمانہ نظم میں لکھتا ہے کہ ایکلیز کی ڈھال کو گلاب کے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ ایفروڈائٹ نے ہیکٹر کی لاش پر گلاب کے روغنی مرکب سے لیپ کیا، خوبصورتی کی دیوی وینس کو گلاب بطور تقدیس نذر کیا گیا۔ دیوی افیر و ڈائیٹ نے جب سمندر کی سطح پر جنم لیا تو سطح سمندر پر پیدا ہونے والی جھاگ نے گلاب کے پھول کی شکل اختیار کی۔

گلاب کو حسن و لطافت، محبّت و الفت، بہادری، شجاعت، راز و نیاز، سادگی و معصومیت اور اتحاد و یگانگت جیسی خوبیوں کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ معانی کے اعتبار سے مصری اسے خاموشی کا مظہر خیال کرتے ہیں ایرانیوں کے نزدیک یہ حسن کی علامت ہے۔ جبکہ ویلنٹائن ڈے کے حوالے سے پوری دنیا میں گلاب محبّت کے اظہار کے ذریعہ کے طور پر مقبول عام ہے۔ یورپی ممالک کے جن کمروں کی چھتوں پر گلاب کے پھول کندہ یا آویزاں ہوتے ہیں ان کے نیچے بیٹھ کر ہونے والی گفتگو کو صیغۂ راز میں رکھا جاتا ہے۔

دنیا کا قدیم ترین زندہ گلاب کا پودا جرمنی کے ایک گرجا گھر میں نصب ہے، ماہرین کے مطابق گلاب کے اس پودے کی عمر تقریباً پانچ سو سال ہے۔ گلاب کے پھول گلدانوں اور گلدستوں میں سجانے کے لیے دنیا بھر میں مقبول ہیں جنگ سے لوٹنے والے فتح مند سپاہیوں اور منظورِ نظر محبوبہ کو سرخ گلابوں کا نذرانہ پیش کیا جاتا ہے۔ معصوم بچوں کے کفن اور تابوت، جبکہ دوشیزاؤں کی شادی کے موقع پر سفید گلاب پیش کیے جاتے ہیں۔

جزیرہ روڈز Rhodes کا نام انگریزی لفظ روز کی ابتدائی شکل ہے۔ اس جزیرہ سے ملنے والے قبل از مسیح کے سکوں پر گلاب کے پھول کندہ ہیں۔ بابل کی سرزمین تقریباً 2850 قبل مسیح سے لے کر 2600 قبل مسیح تک گلاب کے پھولوں کا تجارتی مرکز رہی ہے۔

پاک بھارت متنازعہ علاقہ سیاچن گلیشیئر جس پر دونوں ممالک کی چپقلش ہنوز جاری ہے۔ سیاچن کے معنی سیاہ گلاب کے ہیں۔ اس علاقے کے کچھ حصوں میں جون جولائی کے دوران جب قدرے برف پگھلتی ہے تو وہاں خود رو گلاب کے پھول سیاہی مائل گہرے سرخ رنگ کے ہوتے ہیں شائد اسی سبب سے اس علاقے کا نام سیاچن پڑ گیا ہے۔ سفید آنچل تلے چھپی برف پوش وادیوں میں اگنے والے گلاب کے بارے میں جناب عنصر علی عنصر کا ایک خوبصورت شعر ہے۔

برف رُت میں گلاب دیکھتا ہوں
جاگتے میں بھی خواب دیکھتا ہوں

پانچویں صدی قبل مسیح کے عظیم فلسفی اور ماہر اخلاقیات کنفیوشس کی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ اس کے زمانہ میں چین کے شاہی کتب خانہ میں گلاب پر سو کتابیں موجود تھیں۔ گلاب اپنے گوناگوں فوائد اور خوبصورتی کے باعث صدیوں سے انسان کے زیر کاشت اور زیر استعمال ہے۔ گلاب دمشق عثمانی ترکوں کے ذریعے بلغاریہ پہنچا، گلاب دمشق میں تقریباً ایک سو سے زائد ادویاتی اور کیمیائی اجزاء پائے جاتے ہیں۔ دنیا کے بیش تر علاقوں میں عطر گلاب، عرق گلاب، گل قند اور گلاب کی خشک و تازہ پنکھڑیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ گلاب کا عطر دنیا کی بیش قیمت خوشبوؤں میں شمار ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں صرف بلغاریہ کا ملک پوری دنیا کی تین چوتھائی ضرورت پوری کرتا ہے بلغاریہ کے شہر صوفیہ کے مشرق میں خودرو گلابوں کی وادی 32 کلومیٹر چوڑائی اور 260 کلومیٹر لمبائی پر محیط ہے۔ اس وادی میں تین لاکھ سے زائد افراد گلاب کی پیداوار اور اس سے متعلقہ دیگر مصنوعات کے کاروبار سے وابستہ ہیں۔ اس وادی میں ہر سال تقریباً تین ٹن عطر گلاب تیار ہوتا ہے جس کا بیش تر حصہ فرانس کو برآمد کیا جاتا ہے۔ سپین کا ایک گلاب فارم جسے جدید سائنسی بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے کی انتظامیہ کا دعویٰ ہے کہ ان کے فارم سے پورے یورپ کو گلاب کے پھولوں کی سپلائی دی جاسکتی ہے۔

ممتاز تاریخی شخصیتوں میں نپولین کی بیگم میڈم جوزفین، حکیم عمر خیام، قلوپطرہ اور ملکہ نور جہاں گلاب کی خوشبو پر جان چھڑکتی تھیں۔ جہاں تک رنگ کا تعلق ہے تو اس میں خالص یک رنگ پھولوں کے علاوہ، دو رنگ، سہ رنگ اور چہار رنگ کے پھول کثرت سے پائے جاتے ہیں البتہ خالص گہرا نیلا رنگ ان میں تاحال مفقود ہے۔ نیلے رنگ سے متعلق شائقین کی بے چینی اور اضطراب کی یہ کیفیت ہے کہ لوگ دل کو خوش کرنے کے لیے بازار سے نیلے رنگ کے مصنوعی گلاب خرید کر گھروں اور محفلوں کو سجاتے ہیں۔

گلاب کو یورپ میں وسیع پیمانے پر متعارف کروانے اور ہر دلعزیز بنانے میں درج ذیل عوامل کا کردار بہت اہم ہے: انیسویں صدی کے شروع میں نپولین کی ملکہ جوزفین نے پیرس کے قریب گلاب کا ایک باغ لگوایا جس میں دنیا بھر سے گلاب کی تمام اقسام منگوا کر کاشت کی گئیں۔ ملکہ جوزفین ہی کی سرپرستی میں اس وقت کے مشہور مصور جوزف ایڈاوٹ نے اپنی زیادہ تر پینٹنگز کا موضوع گلاب ہی کو بنایا اور اسے ہر ہر زاویے سے مصور کیا۔

انگلستان میں گلاب کو وسیع پیمانے پر پھیلانے میں گلابوں کی جنگ نے اہم کردار ادا کیا۔ 1455ء سے لے کر 1475ء تک جاری رہنے والی انگلستان کی خانہ جنگی میں لنکاسٹر والوں نے سرخ گلاب کو اپنا نشان ٹھہرایا، جبکہ مدمقابل یارک شائیر والوں نے سفید گلاب کو اپنا جنگی نشان مقرر کیا۔ اس جنگ کے نتیجہ میں جہاں انگلستان میں گلاب وسیع پیمانے پر متعارف ہوا وہاں دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ انگلستان میں نظامِ جاگیرداری ختم ہو گیا۔ آج سے 350 سال قبل کے ایک معروف مغنی تھامس کیمپلر کے ایک مشہور گیت کا ایک خوبصورت شعر ہے کہ

Roses the Garden`s Pride
Are Flowers for Love a
Flowers for Kings
In Courts desired
and
weddings
تاریخی

حوالے سے برصغیر ہندوستان میں گلاب کی کچھ اقسام مغل سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر ایران سے لے کر آیا تھا۔ ہندو پاک کے مشرقی اور مغربی پنجاب میں پایا جانے والا گلاب جسے ہم دیسی گلاب بھی کہتے ہیں اس کا حقیقی نام کنگ ایڈورڈ روز ہے جسے انگریزوں نے آج سے تقریباً 150 برس پہلے اپنے دورِ حکومت میں پنجاب کے مختلف علاقوں میں انگلستان سے منگوا کر کاشت کروایا۔

برصغیر میں گلاب کے حوالے سے سکھوں میں ایک فرقہ پایا جاتا ہے جسے گلاب داسیئے کہتے ہیں۔ ٹی بی جیسے موذی مرض کے علاج کے لیے لاہور میں گلاب دیوی ہسپتال ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں ایک مہاراجہ گلاب سنگھ بھی ہوا ہے جس نے انگریزوں سے ایک کروڑ روپے کے عوض کشمیر خریدا تھا، جہاں آج تک مسلم اکثریتی آبادی پر ہندوؤں کے مظالم جاری ہیں۔ لاہور شہر سے شالا مار باغ کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک گلابی باغ ہے۔ جسے مغل بادشاہ شاہجہان کے ایک ایرانی وزیر مرزا سلطان بیگ نے 1658ء میں تعمیر کروایا تھا۔

گلاب کا پودا ہمہ صفت موصوف ہونے کے باعث طبی خواص کا بھی حامل ہے۔ کتاب المفردات کے مطابق گلاب مفرح قلب، مقوی اعضائے رئیسہ، اور قابض ہے جبکہ زیادہ مقدار میں دست آور ہے۔ اس کے تازہ پھولوں سے گل قند تیار کیا جاتا ہے جو قبض رفع کرتا ہے۔ عرق گلاب آنکھوں میں ڈالی جانے والی دواؤں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایرانیوں نے عرق گلاب کی کشید کے فن کو درجہ کمال پر پہنچایا۔

پھولوں کا ضماد ورم جگر کو تحلیل کرتا ہے۔ گلے
امراض میں اس کے جوشاندہ سے غرغرے کروا
ہیں عرق گلاب میں کھرل کیا ہوا سرمہ سوزش چشم
مفید ہے۔ گلاب کے پھولوں کا زیرہ منہ اور مسوڑ
سے آنے والے خون کو روکتا ہے۔ ہومیو پیتھی
معروف ڈاکٹر بورک کے مطابق گلاب سے بنی دوا
''ہے فیور'' میں ابتدائی مرحلہ پر انتہائی فائدہ مند
جبکہ یہی دوا قوت سماعت میں کمی کے لیے بھی مستع
ہے۔ چینی طریقہ علاج میں گلاب زمانۂ قدیم سے
استعمال ہے۔ اس سے بنی ادویات پیٹ اور معدہ
امراض میں دی جاتی ہیں۔ سرطان جیسے موذی مر
کنٹرول کرنے میں بھی گلاب سے بنی ادویات پر
ہو رہی ہے۔

پیوندی گلاب کی بعض اقسام کے پھول
پنکھڑیاں جھڑ جانے کے بعد پیدا ہونے والے ڈو
وٹامن سی سے بھرپور ہوتے ہیں یورپ میں
جام جیلی اور مارملیڈ بنانے میں استعمال کیا جاتا
ان ڈوڈوں سے کشید کیے گئے ست سے چائے
جاتی ہے جو صحت بخش اور فرحت و تازگی کا با
ہے۔ بعض اقسام کے ڈوڈے انتہائی چمک دار تی
یا سبز رنگ کے ہوتے ہیں جنہیں پھولوں کی
گلدانوں میں سجایا جاتا ہے۔

رنگ اور خوشبو کا حسین ترین امتزاج آپ کو
تر گلاب کے پھولوں میں ہی نظر آئے گا۔ ص
بصارت لوگوں کے لیے جس طرح رنگ ایک ہے
صدا تصور کی جاتی ہے۔ اسی طرح بینائی سے محر
کے لیے خوشبو ایک ایسا غیر مرئی پیغام بر ہے جو
کشاں کشاں کھینچے چلا جاتا ہے۔

گلاب کی اقسام کے حوالے سے جس قسم کا ذکر
ب سے پہلے آتا ہے وہ گلاب کی بیلیں ہیں یہ حسین
وجمیل نازنینوں کا سا روپ دھار کر خشک برہنہ
درختوں کے تنوں اور ڈالیوں پر گل پاشی کرتی ہیں۔
اس کے بعد لڑھکتے اور ڈگمگاتے ہوئے بیل نما
پودے Ramblers آتے ہیں جو ان پیارے
بچوں کی مانند ہوتے ہیں جو گرتے سنبھلتے ہوئے صحن
چمن کو خوشیوں سے مالا مال کرتے ہیں۔ جدید دور
کے کوتاہ قد منی ایچر گلاب ننھے منے پھولوں سے
آراستہ بے مثل نباتی شاہپارے، گویا کسی ان دیکھی
پریوں کی سرزمین سے اٹھا کر لائے گئے ہوں۔ اس
موقعہ پر پھر پروین شاکر کا ایک خوبصورت شعر عرض
کرتا چلوں۔

تتلی کے لبوں اور گلابوں کے بدن میں
رہتا ہے سدا چھوٹے سے اک راز کا رشتہ

آخر میں قد آور گلاب کی جھاڑیوں کا مقام
ہے جن کا اپنا ہی ایک وقار اور حسن ہوتا ہے۔ ایک
پھیلاؤ ہوتا ہے جنہیں مصور کی نظر سے
دیکھا پرکھا اور اسی کے موقلم کے لمس سے زندۂ
جاوید کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ذکر و بیان ان کے حسن
کا احاطہ کرنے سے قاصر و عاجز ہیں۔ البتہ ایک
شاعر کے انداز میں ان حسینانِ چمن کو جو جھکی ہوئی
شاخوں کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں شرم و حیا
کے شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ ایک فوٹو گرافر کے
مطابق یوں لگتا ہے جیسے کسی ساحرانہ عمل سے محبوبی
قد و قامت میں ڈھال کر پودوں کو نصب کر دیا گیا
ہے۔ ایک یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ گلاب کا
پھول ہمیشہ نئی شاخ پر کھلتا ہے۔ اس لیے گلاب کے
پودے کی شاخ تراشی محبوب دلربا کی زلف تراشی
کی طرح محبت اور سلیقے سے کرنی چاہیے۔ اقلیم سخن
کے بے تاج بادشاہ میر تقی میر نے کیا خوب کہا ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

بین الاقوامی سطح پر گلاب کی افزائش اور قدردانی
کے سلسلہ میں دو مشہور ادارے ہیں پہلا رائل نیشنل روز
سوسائٹی لندن اور دوسرا امریکن روز سوسائٹی ہے۔ یہ
دونوں ادارے ہر سال گلاب کی نمائشیں منعقد کرواتے
ہیں اور اول آنے والوں کو انعامات سے نوازتے
ہیں۔ یہ سلسلہ 1928ء سے جاری ہے۔ ماڈرن روز
نامی ایک کتاب ہر پانچ سال بعد امریکا میں چھپتی ہے
جس میں گذشتہ پانچ سال میں پیدا ہونے والے گلاب
کی تمام اقسام کا ذکر بالتفصیل درج ہوتا ہے۔ رائل نیشنل
سوسائٹی لندن ''دی روز'' کے نام سے ایک سہ ماہی
جریدہ بھی جاری کرتی ہے۔

وطن عزیز میں جو ادارے گلاب کی ترویج و ترقی میں
مصروفِ کار اور کوشاں ہیں ان میں پیکجز لمیٹڈ، پی آئی
اے اور سی ڈی اے اسلام آباد قابلِ ذکر ہیں۔

ہماری زندگی کا کوئی لمحہ خوشی، مسرت اور شادمانی
سے آراستہ ہو یا غم و اندوہ سے وابستہ، گلاب ہمارے
احساسات و جذبات کے اظہار کے لیے زمانۂ قدیم
سے ہمارے ساتھ ساتھ چلا آ رہا ہے اور شائد تا ابد
موجود رہے گا۔ آخر میں ایک شعر پیش خدمت ہے جو
گلاب کے بارے میں نفیس جذبات کا لطیف احساس
اجاگر کئے ہوئے ہے۔

رخِ محبوب کے مغالطے میں
چومتے ہیں گلاب سو سو بار ■■■

سیٹی کی زبان

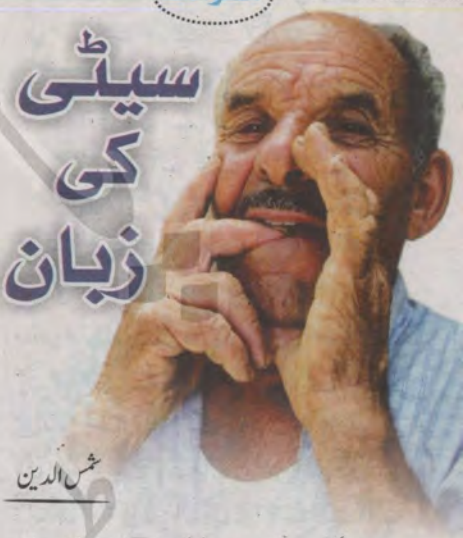

شمس الدین

مراکش سے 100 میل دور بحراوقیانوس میں جزائر کناری واقع ہیں۔ یہ اسپین کی ملکیت ہیں۔ چنانچہ ان 7 جزیروں میں ہسپانوی آباد ہیں۔ لاگومیرا (La Gomera) ان میں سب سے چھوٹا جزیرہ ہے۔ اس پر تقریباً 23 ہزار افراد آباد ہیں۔ اس ننھے جزیرے کی خوبی یہ ہے کہ یہاں سیٹی کی زبان (Gomeran Whistle) بولی جاتی ہے۔

2 ہزار سال پہلے شمالی افریقہ کے بدو قبائل لاگومیرا میں آباد ہوئے۔ انھوں نے مختلف مقامات پر بستیاں بنا لیں۔ رفتہ رفتہ انھیں احساس ہوا کہ کوئی پیغام پہنچانے کے لیے ایک فرد کو دوسرے تک چل کر جانا یا چیخنا پڑتا ہے۔ اسی پریشانی سے بچنے کے لیے کسی ذہین باسی نے سیٹی کی زبان ایجاد کر لی۔ یہ زبان وادیوں میں باہمی رابطے میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ سیٹی دراصل چیخنے سے زیادہ دور تک جاتی ہے۔ ایک محقق نے لاگومیرا میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ سیٹی میل (3.2 کلومیٹر) تک سننا ممکن ہے۔ نیز اسے بجانے میں چیخنے سے کم توانائی خرچ ہوتی ہے۔ جزیرے کے باسیوں نے رفتہ رفتہ مختلف اقسام سیٹیوں کے ذریعے انوکھی زبان ایجاد کر لی۔ یہ زبان 2 حروفِ علت (Vowels) جب کہ 4 حروف (Consonants) رکھتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ پندرہویں صدی میں جب ہسپانوی جزیرے پر قابض ہوئے تو انھوں نے بھی سیٹی کی زبان کو مفید سمجھتے ہوئے اپنا لیا۔ جزیرے ایک باسی، لائنو روڈریگوز بتاتا ہے "پچھلے زمانے میں ہمارے لیے سیٹی بجانا محض تفریح یا مشغلہ نہیں رہا بلکہ ضرورت بن گیا۔ وجہ یہ ہے کہ جسے سیٹی کی زبان آتی، پھر اسے پیغام دینے یا بات سنانے کی خاطر دوسرے کے پاس چل کر جانا پڑتا۔ تب سڑکیں تھیں، ٹیلی فون، لہٰذا سیٹی بجانا چلنے سے زیادہ آسان تھا۔

لیکن 50 برس قبل جب سڑکیں تعمیر ہوئیں، فون آ گئے اور موبائل فونوں کا انقلاب آیا تو سیٹی زبان اپنی اہمیت کھو بیٹھی۔ یہی وجہ ہے کہ 20 سال جزیرے میں یہ زبان بولنے والے 10,15 باشندے رہ گئے۔ تب دانشوروں اور ماہرین لسانیات نے شور کہ حکومت سیٹی کی زبان کو تحفظ دینے کے لیے اقدا کرے ورنہ یہ تہذیبی وثقافتی ورثہ مٹ جائے گا۔

چنانچہ جزیرے کے تمام پرائمری اسکولوں سیٹی کی زبان سیکھنا مضمون قرار پایا۔ یوں نوع کی ایک انوکھی زبان معدوم ہونے سے بچ 2009ء میں پھر یونیسکو نے اسے انسانیت (Oral) ورثے کا شاہکار (ماسٹر پیس) قرار دیا۔

آدم خور

بھالو

صبا شفیق

8 شکاریوں کی ٹیم کو ایک ایسے مکار درندے سے واسطہ پڑا تھا جو چھلاوے کی طرح غائب ہونا جانتا تھا

یہ نومبر کی ایک صبح تھی۔ جنگل کے کنارے کچھ عرصہ قبل آباد ہوئے اس نئے قصبے میں لوگ ناشتے کی تیاری کر رہے تھے۔ "میرے لیے چائے بنا دو مایا۔" ساشو نے اپنی بیوی سے کہا۔

"امی میں تو انڈہ کھاؤں گا۔" ساشو کا چودہ سالہ بیٹا بولا۔

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک جنگل سے ایک بڑا بھالو بھاگتا ہوا آیا۔ وہ باہر صحن میں میز پر خشک ہونے کے لیے رکھی مکئی جلدی جلدی کھانے لگا۔ ساشو یہ دیکھ کر باہر دوڑا اور بھالو کو ڈرا کر بھگانے لگا۔ اس دوران بھالو کافی مکئی کھا چکا تھا۔ کچھ اس نے گرا دی اور باقی اٹھا کر بھاگ گیا۔ اب یہ بھالو کا معمول بن گیا۔ وہ اکثر جنگل سے قصبے میں آتا اور کھانے پینے کی اشیا اٹھا کر رفو چکر ہوتا۔ جب بھالو کی بدتمیزیاں حد سے بڑھ گئیں تو ساشو نے اسے سبق سکھانے کا ارادہ کیا۔ اس نے بیٹوں کو ہتھیار تیار رکھنے کا کہا تاکہ اگلی بار جب بھالو آئے تو وہ اسے زندہ واپس نہ جانے دیں۔ ساشو کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی بڑا بیٹا، سیرن بیس سال کا تھا۔ اس سے چھوٹا شون اٹھارہ سال جب کہ جونی چودہ سال کا تھا۔ ساشو کی بیٹی ابھی صرف دو سال کی تھی۔ ماں کو گھر کے اکثر کام اسے گود میں اٹھائے اٹھائے کرنے پڑتے۔ کیونکہ وہ اکثر گھٹنوں کے بل رینگتی گھر سے باہر چلی جاتی تھی۔ کبھی کبھار مایا اسے اپنی کمر پر ٹوکری باندھ کر بٹھاتی اور کام نمٹاتی رہتی۔

اس دن بھی وہ صبح صبح ناشتہ کر رہے تھے کہ انھیں بھالو جنگل سے نکل کر گھر کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ ساشو اور اس کے دونوں بڑے بیٹے اپنے ہتھیاروں کی طرف بڑھے۔ انھوں نے بھالو کا نشانہ لیا اور گولیاں چلائیں۔ بدقسمتی سے بیٹوں کی گولیاں درختوں میں جا لگیں جب کہ ساشو کی گولی بھالو کو معمولی زخمی کرتے نکل گئی۔ ساشو جانتا تھا کہ زخمی بھالو

بڑا خونخوار ثابت ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اس نے پیچھا کر کے اسے شکار کرنے کا ارادہ کیا۔ بھالو چیختا ہوا جنگل کی طرف بھاگا تھا۔ ساشو جنگل کی طرف بڑھ رہا تھا کہ شدید برفانی طوفان نے اس کے قدم روک لیے۔

گولی نے بھالو کو معمولی سا زخمی کیا تھا۔ چند دن میں اس کے زخم بھر گئے۔ اب وہ ساشو سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ صحت یاب ہوتے ہی وہ جنگل سے نکل کھڑا ہوا۔ گو وہ قصبے کے باقی گھروں سے بھی وقتاً فوقتاً کھانے پینے کی اشیا چراتا تھا مگر ساشو کی گولی نے اسے اس کا دشمن بنا دیا۔ وہ انتہائی کمینہ اور مکار ثابت ہوا اور ایک دن چپ چاپ کھلی کھڑکی سے اندر کودا۔ ساشو اور اس کے بیٹے گھر میں نہیں تھے۔ مایا گھر کے ایک کونے میں بنے باورچی خانے میں کھانا بنا رہی تھی۔ اس کی ننھی معصوم بیٹی چارپائی پر سو رہی تھی۔ بھالو اپنی درندگی کی انتہا پر تھا۔ اس نے بچی کو اٹھایا اور اس کے سر میں اپنے دانت گاڑ دیے۔ بچی رونے لگی تو مایا باورچی خانے سے باہر نکلی۔ بچی کو بھالو کے ہاتھوں میں دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ مگر مامتا کے جوش میں اس نے جلتے چولھے سے لکڑی اٹھائی اور بھالو کو مارنے دوڑی۔ اس دوران بھالو نے بچی کی کھوپڑی میں دانت گاڑ دیے۔ مایا نے جب بھالو کو لکڑی سے مارا تو اس نے غضب ناک ہو کر بچی کو دور پھینکا اور مایا پر حملہ آور ہوا۔ بچی اسی وقت دم توڑ گئی۔ بھالو کی بے پناہ طاقت کے آگے مایا کا نحیف و نزار وجود کیا حیثیت رکھتا تھا؟..... اس نے اپنے دانت مایا کی گردن میں گاڑے اور اسے گھسیٹتا ہوا جنگل کی طرف لے گیا۔ وہاں ایک درخت کے پاس بیٹھ کر اس نے مایا کے گوشت کی دعوت اڑائی۔ خوب پیٹ بھر کر کھانے کے بعد اس نے باقی لاش وہیں درخت کے قریب مٹی کھود کر دبا دی۔

ساشو اور اس کے بیٹے جب گھر پہنچے تو پڑوسیوں نے انھیں ساری کہانی سنائی۔ ساشو اپنی ننھی بیٹی کو بے پناہ چاہتا تھا۔ وہ اس کی لاش کو سینے سے لگائے رونے لگا۔ ساشو کا گھر قصبے کے آخری سرے پر واقع تھا۔ وہاں گھروں کے درمیان کئی گز کا فاصلہ تھا۔ مایا کی چیخیں سن کر دو تین قریبی گھروں کی عورتیں باہر دوڑیں۔ انھوں نے یہ ہولناک منظر دیکھا کہ بھالو مایا کو گردن سے گھسیٹتے جنگل کی طرف لے جا رہا ہے۔ اس وقت گھروں میں کوئی مرد نہ تھا اور سب کام پر گئے ہوئے تھے۔ نازک عورتیں مایا کی حالت دیکھ کر ڈر گئیں۔ انھوں نے اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے گھروں کے دروازے بند کر لیے کہ مبادا بھالو مایا کو چھوڑ کر ان پر حملہ آور نہ ہو جائے۔

ساشو اور اس کے بیٹوں نے قسم کھائی کہ وہ قاتل بھالو کو ہر صورت ختم کر کے رہیں گے۔ قصبے کے باقی لوگ بھی یہ جان گئے کہ بھالو کے منہ کو انسانی خون لگ چکا ہے۔ وہ آدم خور درندہ اب بار بار شکار کے لیے قصبے کا رخ کرے گا۔ لہٰذا انھوں نے بھی فیصلہ کیا کہ ساشو کا ساتھ دیا جائے۔ ان کے پاس بندوقیں تو تھیں، مگر کوئی ماہر شکاری نہ تھا۔ کسی کا نشانہ بھی خاص اچھا نہ تھا۔ پھر بھی نئے لوگوں کا ایک گروہ بندوقیں تھامے بھالو کے پیچھے جنگل میں روانہ ہوا۔ ابھی وہ جنگل میں پانچ سو فٹ دُور ہی گئے تھے کہ انھیں بھالو درخت کے پاس بیٹھا نظر آیا۔ پانچ لوگوں نے نشانہ باندھا۔ مگر شاید بھالو کی قسمت اچھی تھی یا وہ بہت اناڑی نشانہ باز تھے کہ ایک کی گولی بھی نشانے پر نہ لگی اور بھالو وہاں سے فرار ہو گیا۔ وہ لوگ بھاگ کر درخت کے قریب پہنچے تو انھیں وہاں خون نظر آیا۔ ذرا سی مٹی کھودنے پر انھیں مایا کا سر اور اس کی بچی کھچی لاش ملی۔ وہ اسے اٹھا کر لے آئے۔ ساشو نے بیوی اور بچی کو قصبے کے قبرستان میں دفن کر دیا۔

رات ہوئی تو مردوں نے تمام عورتوں اور بچوں کو قصبے کے ناظم کے گھر اکٹھا کر لیا۔ تیس کے قریب لوگ باہر پہرہ دینے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ آدم خور بھالو دوبارہ گاؤں کا رخ ضرور کرے گا۔ اس پر کوئی اپنے گھر میں تنہا رہنے سے ڈر رہا تھا۔

عورتیں اور بچے بری طرح سہمے ہوئے تھے۔ سردیوں کی رات تھی۔ پہریداروں کے ہاتھ یخ بستہ ہواؤں سے بے حس ہو گئے۔ حتیٰ کہ ان کے لیے بندوقیں تھامنا مشکل ہو گیا۔ وہ سب بندوقیں قریب رکھ کر اونگھنے لگے۔ رات کے تقریباً نو دس بجے تھے جب ایک پہریدار کو جنگل کی طرف سے ایک سایہ بڑھتا نظر آیا۔ وہ حواس باختہ ہو کر چلایا ”بھالو..... بھالو آ گیا..... خونی بھالو آ گیا۔“

اونگھتے ہوئے پہریدار یک دم چونک کر اٹھے اور نشانہ باندھے بغیر اندھا دھند گولیاں چلانے لگے۔ بھالو جنگل کی طرف واپس مڑ گیا۔ پہریداروں نے اس کا پیچھا کرنے کی ٹھانی۔ انھوں نے ایک پہریدار کو وہیں چھوڑا اور بقیہ جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔

اُدھر ناظم کے گھر بڑے ہال نما کمرے میں تمام عورتیں اور بچے سردی اور کچھ خوف سے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ جڑے بیٹھے تھے۔ ہال میں جلی لالٹین سے مدھم روشنی پھوٹ رہی تھی۔ قصبے کی ایک عورت لالٹین قریب رکھے سب کے لیے قہوہ تیار کر رہی تھی۔ اچانک انھیں کچھ عجیب آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی نوکیلے ناخنوں سے لکڑی کھرچ رہا ہو۔ سب کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ وہ دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے جب ایک زوردار دھماکے سے کسی ایکشن ہیرو کی طرح کھڑکی کا تختہ توڑ کر بھالو ہال میں کودا۔ اسے دیکھتے ہی تمام عورتیں اور بچے چیخنے لگے۔ چولھے پر قہوہ تیار کرتی عورت بے اختیار قریب بیٹھے اپنے بچے کو بچانے بڑھی تو گھبراہٹ میں اس کا پاؤں لگنے سے لالٹین الٹی اور بجھ گئی۔ اب کمرے میں صرف چولھے میں جلتی چند لکڑیوں کی روشنی موجود تھی۔ عورت نے بچے کو اپنی کمر پر بندھی ٹوکری میں ڈالا اور چولھے سے ایک جلتی لکڑی اٹھا کر بھالو کو مارنے دوڑی۔ لیکن بھالو نے ایک ہاتھ مار کر لکڑی پرے پھینکی، اس پر حملہ آور ہوا اور اسے نوچ ڈالا۔ بھالو نے پھر ٹوکری میں موجود بچے کو بھی بری طرح کاٹ ڈالا۔ معصوم بچے کی چیخیں آسمان ہلانے لگیں۔ شور سن کر نگرانی پر مامور اکلوتا پہریدار اندر داخل ہوا مگر اندر کی صورتِ حال دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ خوف کے مارے منجمد ہاتھوں سے بندوق چھوٹ گئی۔ بھالو کی نظر اس پر پڑ چکی تھی۔ بندوق دیکھ کر تو وہ جنونی ہو گیا۔ تیزی سے بڑھا اور پہریدار کو ادھیڑ ڈالا۔

اس کے بعد بھالو نے دو اور معصوم بچوں کو مار ڈالا۔ اس اثنا میں جلتی لکڑیاں بجھ گئیں۔ یوں ہال میں اندھیرا چھا گیا۔ اب جو اٹھ کر باہر بھاگنے کی کوشش کرتا، بھالو کی نظر میں آ جاتا۔ پھر وہ اسے پنجوں اور دانتوں سے نوچ ڈالتا۔ اسی لیے بقیہ عورتیں اور بچے سانسیں روکے کونوں میں دبکے اپنی موت کا انتظار کرنے لگے۔ ایک حاملہ خاتون نے جب باہر بھاگنے کی کوشش کی تو بھالو اس پر حملہ آور ہو گیا۔ اس نے عورت کا پیٹ پھاڑ ڈالا اور اسے زندہ ہی کھانے لگا۔ اندھیرے میں بھالو کے ہڈیاں چبانے کی آواز جان لیوا تھی۔ بھالو جب کھانے میں مصروف تھا تو ایک عورت ہمت کر کے کھڑکی سے باہر کود گئی تا کہ پہریدار کو بلا سکے۔ وہ بیوقوف جنگل کی خاک چھان کر واپس ہی آ رہے تھے کہ راستے میں انھیں عورت مل گئی۔ وہ بھاگم بھاگ ناظم کے گھر پہنچے۔ اندر سے آتی ہڈیاں چبانے کی آواز سن کر اکثر کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ بزدل اندر جانے کی بجائے یہ سوچنے لگے کہ

مکان کو آگ لگا دیں۔ پھر کچھ لوگوں نے عقل سے کام لیتے ہوئے دوسروں کو سمجھایا کہ ہوسکتا ہے، ابھی بعض عورتیں اور بچے زندہ ہوں۔ لہٰذا بھالو کو باہر نکال کر گولی مارنی چاہیے جو کسی فلم کے ولن کی طرح اندر بیٹھی عورتوں اور بچوں کو یرغمال بنائے ہوئے تھا۔

اب ایک پہریدار دروازے کے آگے کھڑا ہو کر شور مچانے لگا تاکہ بھالو باہر آجائے۔ باقی نشانہ باندھنے لگے۔ شور کی آوازسن کر بھالو باہر آیا۔ ویسے بھی اس کا پیٹ بھر چکا تھا۔ مگر وہ تیر کی طرح باہر آیا۔ دروازے کے آگے کھڑے پہریدار کو کسی گڈے کی طرح ہوا میں دور اچھالا اور چشم زدن میں جنگل کی تاریکی میں غائب ہوگیا۔ تمام پہریدار اندھا دھند گولیاں چلاتے رہے۔ مگر بھالو کسی چھلاوے کی طرح انھیں بدھو بنا کر خون کی ہولی کھیل کر چلتا بنا۔

دو دن میں درندہ صفت بھالو نے چھ لوگوں کو مار ڈالا۔ جن میں تین عورتیں اور تین معصوم بچے شامل تھے۔ قصبے والوں کو اب بھالو کوئی بدروح یا آسیب لگنے لگا۔ وہ خاصے توہم پرست تھے۔ انھیں یقین ہوگیا کہ بھالو کوئی آسمانی بلا ہے۔ مگر ساشو حقیقت جانتا تھا۔ کھانے پینے کی معمولی چیزیں چرانے والے بھالو کو زخمی کر کے آدم خور بنانے والا وہ خود تھا۔ قصبے کے اکثر لوگ بزدل تھے، انھوں نے کہیں اور جانے کا فیصلہ کرلیا۔ صرف چند لوگوں نے وہاں رہ کر بھالو کو انجام تک پہنچانے کی ٹھانی۔ ساشوان میں سے ایک تھا۔ اس دوران اسے معلوم ہوا کہ ایک قریبی قصبے میں شکاری رہتا ہے۔ ساشو اس کے پاس گیا، آدم خور بھالو کی بات بتائی اور درخواست کی کہ وہ ساتھ چلے۔ مگر شکاری نے انکار کردیا۔

آخر یہ بات ضلعی انتظامیہ تک پہنچ گئی کہ ایک قصبے میں آدم خور بھالو نے قیامت مچا رکھی ہے۔ ڈپٹی کمشنر نے فوراً شکاریوں کی ایک ٹیم گاؤں کی طرف روانہ کردی۔

تقریباً آٹھ ماہر شکاری شام کے وقت قصبے میں پہنچے۔ ساشو اور اس کے بیٹوں نے انھیں ساری صورت حال بتائی اور بھالو کی عیاری و مکاری سے آگاہ کیا۔ شکاری انھیں ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے کیونکہ وہ ناتجربہ کار تھے مگر ساشو اور اس کے بیٹوں نے ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ وہ بھالو کو اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کرنا چاہتے تھے۔ جس عورت کو بھالو نے ایک روز قبل شکار کیا تھا، اس کی ادھ کھائی لاش مل گئی۔ شکاریوں کا گروہ اسی کے قریب سخت سردی میں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ تمام رات سردی سے کپکپاتے ہوئے وہ انتظار کرتے رہے مگر بھالو نہیں آیا۔ صبح جب وہ قصبے میں واپس پہنچے تو انھیں معلوم ہوا، جب وہ تمام رات ٹھنڈ سے مر رہے تھے، بھالو گھروں میں موجود کھانے پینے کی اشیا سے اپنا پیٹ بھرتا رہا۔ بھالو اُن کی توقع سے زیادہ مکار ثابت ہو رہا تھا۔

شکاریوں نے سوچا کہ انھیں حکمت عملی تبدیل کرنی چاہیے۔ وہ یہ تو جان چکے تھے کہ بھالو کو قصبے میں آکر پیٹ بھرنے کی عادت پڑ چکی ہے، چاہے وہ انسانی گوشت ہو یا کھانے پینے کی دوسری اشیا..... لہٰذا انھوں نے سوچا، رات کو جنگل سے قصبے میں داخل ہونے والے راستے پر درختوں میں چھپ کر بھالو کا انتظار کیا جائے۔ چنانچہ وہ درختوں میں چھپ کر بھالو کا انتظار کرتے رہے۔ مگر انھیں پتا ہی نہیں چلا بھالو کب آیا اور کب چلا گیا۔ صبح جب وہ قصبے میں پہنچے تو انھیں معلوم ہوا، رات بھالو جنگل سے کوئی پانچ سو گز دور واقع ایک گھر میں موجود شہد اور مکئی سے اپنا پیٹ بھر گیا۔ وہ گھر پر کوئی انسان موجود نہیں تھا اور نہ شاید بھالو اُسی کی دعوت اڑاتا۔ بھالو نے غصے میں گھر کی ہر چیز کو توڑ پھوڑ ڈالا، خصوصاً گدے تکیے وغیرہ تو اس نے بُری طرح ادھیڑ ڈالے۔

کیونکہ ان سے اسے انسانی خوشبو آرہی تھی۔

یامتو شکاریوں کے گروہ کا سربراہ تھا۔ اس نے سوچا کہ بھالو کو پھنسانے کا یہی طریقہ ہے کہ کسی انسان کو بطور چارا استعمال کیا جائے۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے بات کی، مگر ساشو نے جس کی جان سے پیاری بیٹی اور بیوی کو وہ درندہ کھا گیا تھا، پہلے ہی رضا کارانہ طور پر خود کو پیش کر دیا۔ طے پایا کہ ساشو رات اپنے گھر کے صحن میں بیٹھا رہے۔ تمام شکاری گھر کے اندر اور باہر چھپ جائیں گے۔ بھالو جب ساشو کی بُو پا کر وہاں آئے تو اس کو آسانی سے گھیر کر مار دیا جائے۔

منصوبے کے مطابق شام ہوتے ہی ساشو اپنے صحن میں چارپائی بچھا کر لیٹ گیا۔ بقیہ شکاری اسے گھیرے میں لیے چھپ گئے۔ رات کے تقریباً نو بج رہے تھے جب بھالو جنگل سے نکل کر قصبے کی طرف بڑھا۔ اسے دور سے صحن میں لیٹا ساشو نظر آیا تو اس کی رال ٹپکنے لگی۔ وہ فوراً بھاگتا ہوا ساشو پر حملہ آور ہونے کو لپکا۔ بھاگتے ہوئے درندے کا نشانہ باندھنا مشکل کام تھا مگر شکاریوں نے اپنی مہارت بروئے کار لاتے ہوئے گولیاں چلا دیں۔ اگر وہ گولی نہ چلاتے تو شاید بھالو ساشو کو ادھیڑ ڈالتا کیونکہ وہ عین اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ وہ بھالو واقعی کوئی چھلاوہ ثابت ہوا تھا۔ صرف یامتو کی گولی اسے زخمی کر سکی، باقی تمام شکاریوں کے نشانے خطا گئے۔ بھالو جنگل کی طرف واپس دوڑ پڑا۔ مگر اب اس کا واسطہ ماہر شکاری یامتو سے تھا۔ وہ ساشو اور اس کے ناتجربہ کار بیٹوں کی طرح زخمی بھالو کو زندہ چھوڑنے کا خطرہ ہرگز مول نہیں لے سکتا تھا۔ چنانچہ یامتو بقیہ شکاریوں کے ہمراہ بھالو کے پیچھے جنگل میں داخل ہوا۔ شام کو ہونے والی برفباری نے ان کا کام آسان بنا دیا تھا۔ برف پر قدموں اور خون کے قطروں کے تازہ نشانات انھیں بھالو کی طرف لے جانے میں مددگار ثابت ہوئے۔ جنگل میں کافی دیر چلنے کے بعد انھیں نشان ایک ڈھلوان کے پیچھے جاتے نظر آئے۔ وہ جب ڈھلوان کی دوسری طرف پہنچے تو انھیں ساٹھ گز دور جھاڑیوں میں چھپا بھالو اپنے زخموں سے خون چاٹتا نظر آیا۔ یامتو اب کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے باقی شکاریوں کو وہیں رک کر نشانہ باندھنے کو کہا اور خود زمین پر رینگتا بھالو کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ قریب سے نشانہ لینا چاہتا تھا تاکہ خطا ہونے کا امکان نہ رہے۔ یامتو نے باقی ساتھیوں کو تیار رہنے اور نشانہ باندھنے کا یوں کہا کہ اگر اس کا نشانہ چوک جائے تو وہ بھالو کو زندہ بچ کر نکلنے نہ دیں۔ یامتو رینگتا ہوا بھالو کے قریب ہو رہا تھا۔ بیس گز دور پہنچ کر وہ ایکدم کھڑا ہوا اور بھالو کا نشانہ باندھنے لگا۔ اسے دیکھتے ہی بھالو چونک کر اٹھا اور غراتے ہوئے اس کی طرف دوڑا۔ مگر اس دوران یامتو نے گولی چلا دی۔ جو سیدھی بھالو کے دل میں پیوست ہوئی۔ وہ الٹ کر گرا اور پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ بے شک وہ بہت قوی جانور تھا۔ لیکن اسی دوران یامتو نے دوسری گولی اس کے دماغ میں اتار دی۔ یوں قصبے کے لوگوں کو ایک آدم خور درندے سے نجات مل گئی۔ اس کا وزن تقریباً 380 کلو نکلا۔ وہ خونخوار بھالو تقریباً 9 فٹ لمبا تھا۔

ساشو اور اس کے بیٹے خوش تھے کہ ان کا دشمن بالآخر مارا گیا۔ اس کے علاوہ یامتو جیسے ماہر شکاری کے ساتھ شکار کر کے انھیں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ آنے والے وقت میں وہ بہترین شکاری بنے۔ مگر انھیں زندگی بھر یہ افسوس رہا کہ اگر وہ تجربہ کار ہوتے تو زخمی بھالو کو زندہ نہ چھوڑتے۔ تب وہ ان کی ماں اور بہن سے محروم کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر معصوم جانوں کے ضیاع کا باعث نہ بنتا۔

■■■

مبشر الحق عباس

تربوز اور آم نگر

دو پھلوں کی ناراضی کا دلچسپ ماجرا، انہیں ایک دوسرے کے نسب پر ہی نہیں، ذائقوں آب و ہوا اور تاثیر پر بھی اعتراض تھا۔ یہ ہلکی پھلکی ادبی دل لگی آپ کو بہت بھائے گی۔

ہر لفظ ہمارے دماغ کے نہاں خانے میں اپنی تصویر، کیفیت، ذائقے اور احساس کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ لفظ تربوز سنتے ہی شیرینی، تازگی اور سرخی سے بھرپور پھل اپنے رسیلے پن کے احساس کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اگر آپ نے ابھی ایسا ہی محسوس کیا ہے تو یہ بات تو طے ہے کہ آپ کا براہ راست تعلق آم نگر کی مردم خیز بستی سے نہیں اور اگر کسی طور ہے بھی تو آپ پر سے یہ واجبی اثر زائل ہو چکا

ہے اور آپ مقامی نچلے درجے کے طبقے میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ کیا؟ آپ آم نگر سے واقف نہیں؟ آم نگر برصغیر کا وہ خطہ ہے جو تربوز دشمنی کے علاوہ علم دوستی اور چند مزید خصائص (جن کا ذکر ابتداء میں مناسب نہیں) کے لئے مشہور ہے۔ اس خطے نے بلا شبہ بڑے بڑے لوگ پیدا کئے۔ لیکن یہی بات آپ اگر کسی آم نگر کے باشندے سے پوچھیں تو وہ آپ کو اتنے نام گنوا دے گا جتنی آم نگر کی آبادی بھی نہیں تھی۔ بس اس خطے کی یہ انکساری ہی ہمیں مار گئی ہے۔ اگر یہ لوگ اس خطے کی برصغیر میں وہ حیثیت قرار دیں جو قدیم لندن میں چیلسی (Chelsea) کو تھی تو ازراہ کرم اسے وطن پرستی سمجھ کر معاف کر دیں کہ یہ محبت تو ہر شخص میں ہی پائی جاتی ہے۔

حیرت ہے کہ آم نگر جس کے نام کا پہلا لفظ ایک پھل کے نام پر ہے تربوز سے نالاں کیوں ہے۔ آم نگر کے اصل باشندے اب بھی تربوز کے تصور کو موت، قبر کی تاریکی اور منکر نکیر کے سوالات سے منسلک کرتے ہیں۔ اور یہی ہر دور میں آم نگر کے ڈومیسائل کی سند رہی ہے۔ اس خوف کی اصل وجہ ہمارے بزرگوں کو بھی معلوم نہیں شاید ان کے پیش رو چند صدیوں قبل کہہ گئے ہوں کہ تربوز ملک عزرائیل کے باغ کا پھل ہے پس جوان سے ملاقات کا متمنی ہو اسے کھا لے۔ ہمارے انہی بزرگوں میں سے چند خاصے متشدد خیالات کے حامل تھے جو تقریری وصیت نامے میں جہاں دوسرے رشتے داروں کی اصلیت سے پردہ اٹھا گئے وہاں مال و زر کی تقسیم کے ساتھ تربوز کی مضرت پر بھی شدت سے اظہار رائے کر گئے۔ جن کے پاس مال و زر نہ تھا وہ کینے کی دولت سے بہر حال مالا مال تھے۔ سو رشتہ داروں کے دیئے داغ اور تربوز کی سمیت کا راز تو تھا ہی پس وہی اگلی نسل کو دے گئے۔ اب جو نئی نسل آئی تو بے مہری چرخ نے قرابت داروں کو ایسا جدا کیا کہ ان کے خصائل اور اوصاف تو کجا نام اور شکل تک کی پہچان ناممکن ہو گئی اس لیے وصیت اور بڑوں کی کوئی اور بات تو قابل عمل نہ رہی بس بچا تو بیچارہ تربوز۔ سب کا غصہ اس بے زبان پر نکلا۔ وہ اس طرح کہ اب چچی، تائی، خالو کے بھائی، ماموں کے بڑے سالے، پھوپھی کے داماد اور تربوز میں سے سب دوسرے شہروں ملکوں کو سدھارے اور رہ گیا تربوز تو آپ کے گلی محلے کی زینت بنا اسلاف کی یاد دلاتا رہا۔

تربوز پر اتنے غیر پارلیمانی (یا یہ کہیں کہ پارلیمانی) اعتراضات کے بعد اسے کھانا دیوانگی سے کم نہیں۔ اس لئے آم نگری خطے کے چند افراد جی کڑا کر کے اسے کھا تو لیتے ہیں لیکن ضمیر پر ایک ایسے بوجھ کے ساتھ جو تربوز کی شیرینی کو ماند ضرور کر دیتا ہے۔ نہ معلوم باقاعدگی سے تربوز کھانے والے غیر آم نگریوں کو کیا مزا آتا ہوگا؟ بس اسی نوعیت کے کئی وسوسے اور خیالات بد دماغ میں گردش پذیر رہتے ہیں۔ گزشتہ دور کے آم نگر میں قرابت داروں کی کڑواہٹ اور کسالت دور کرنے کے لئے تربوز کے علاوہ کیا طریقہ تھا؟ اتنی زرخیز زمین میں پیدا ہونے والے تربوز اگر چمار اور..... کھاتے تھے تو انکی نسل معدوم کیوں نہ ہو گئی؟ یا پھر اب موجود تمام گدھے دوسرے خطوں سے تعلق رکھتے ہیں؟ اور آم نگر سے صرف اور صرف حکماء و علماء کی نسل ہی برآمد ہوئی اور تمام دنیا میں پھیل گئی۔

ایک بات تو یقینی ہے کہ اس وقت بھی کہیں نہ کہیں کوئی بزرگ آم نگر کی اس روایت کا علم اٹھائے تربوز کی مذمت کرتے ہوئے اسکے تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈال

رہے ہوں گے۔ چند ایسے بزرگ بھی ہوں گے جو پوتوں اور نواسوں کی کثیر تعداد میں گھرے اس اجتماعی خودکشی میں شامل ہوں گے یا سلام کا ورد کرتے ہوئے۔ البتہ کہیں نہ کہیں کوئی بدطینت بہو اپنی مرحومہ ساس کی برسی پر اس بار بھی تربوزی رنگ کا جوڑا جسکے دوپٹے پر تربوز کے چھلکے سے ہم آہنگ سبز کناری لگی ہو اور فاتحہ میں تربوز اور کھیرے اس یقین اور گمان سے رکھے ہوں گے کہ یہ تمام مرحومہ کو بعینہٖ اسی طرح پہنچے گا چاہے تو تربوزی جوڑا پہن لیں ورنہ! بوسیدہ کفن تو ہے ہی۔ چاہیں تو تربوز کھالیں ورنہ قیامت تک جام کوثر کا انتظار کریں۔ یہ ہی نہیں بلکہ اپنی پڑوسن کو مشورہ دے رہی ہوں گی کہ سسرال میں کوئی نزع کے عالم میں ہو تو آب زمزم میں چند قطرے تربوز کے عرق کے ڈال کر مریض کو پلا دیں اور کان میں بتا بھی دیں۔ محلول اندر اور دم جالندھر۔ ہاں مریض آم نگر کا ہونا لازمی ہے ورنہ جی اٹھے گا۔ تو صاحب! اسلاف کی حکمت ایک طرف اور تربوز کا خوف ایک طرف۔ تربوز ان کے لئے ٹروجن ہارس تھا جس میں پیٹ کا درد، نزع اور رحلت اسی ترتیب سے پوشیدہ تھے۔ یہ لوگ جب کسی غیر کو تربوز کھاتے دیکھتے انہیں ہاضمے کی قوت سے زیادہ اس شخص کی حماقت پر حیرت ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ اس تمام قضیے میں کچھ قصور تربوز کا بھی ہے۔ کہاں درختوں پر آویزاں لہکتا مہکتا آم اور کہاں زمین کے گارے میں آلود تربوز۔ کہاں آم کی خاطر مدارات اور ناز برداری کہ چوٹ سے بچاتے ہوئے لایا جارہا ہے، پال دبائی جارہی ہے، دوستوں کا ہجوم اکٹھا ہورہا ہے اور آم خوری کی خاص محفل سج رہی ہے۔ کہاں اس طرف یہ حال کہ زمین پر پڑے پڑے ہی پک گئے، گدھے پر لادے گئے، منڈی میں آ گئے، بک گئے تو ٹھیک ورنہ جس پر سوار ہوکر آئے تھے اسی کی خوراک بن گئے۔

آم کے موسم میں اس کے ہمعصر پھلوں کی مٹی تو ویسے ہی پلید ہوتی ہے۔ یہ تو بھلا ہو مہنگائی کا کہ تربوز بھی معزز ٹھہرا۔ منڈیوں کے بے وقعت ڈھیر سے نکل کر بڑے شاپنگ پلازہ تک پہنچ گیا ہے۔ نہری علاقوں میں اس سے وہی سلوک کیا جاتا ہے جسے اہل علاقہ جانوروں، صنف نازک اور دوسری سبزیوں کے لئے روا سمجھتے ہیں۔ اسے پکنک پر لے جایا جاتا ہے۔ پانی میں ڈال کر ٹھنڈا کرتے ہیں۔ مکہ مار کر توڑتے ہیں جو کچھ بکھرتا ہے ناقابل بیان ضرور سہی قابل طعام ہوتا ہے۔ یہ سعادت بھی تربوز کے حصے میں آئی ہے ورنہ کوئی آم کو مکہ مار کے تو دکھائے۔ فتنۂ دجال کے اس دور میں بھی اسے قابل مذمت سمجھیں گے۔

بات اگر اس دنیا تک ہی رہتی تو ٹھیک تھا لیکن ازلی دشمنی اگر ابد تک نہ چلے تو مزہ نہیں آتا۔ اگلے جہان کا منظر دنیائے فانی سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ ایک وسیع و عریض باغ میں ہر طرف تربوز الگ الگ کیفیات میں مبتلا تھے۔ کچھ پژمردہ اور اداس اور بہت سے تازہ و شاداں۔ ایک تربوز نے چہکتے ہوئے دوسرے مغموم تربوز سے پوچھا کیا زندگی اچھی نہیں گزری۔ وہ پھٹ پڑا، خاک اچھی گزری، کھائے جانے کے لئے پیدا

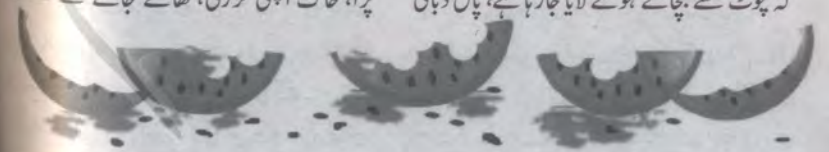

ہوئے تھے مگر ہم سڑ گئے کسی نے کھیت سے آکر اٹھایا تک نہیں۔ لیکن تم کہاں پیدا ہوئے تھے۔ پہلے نے پوچھا۔ ارے بھائی آم نگر میں اگے تھے ناقدری سے مر گئے۔ قریب ہی ایک درخت کے پیچھے سے آواز آئی۔ آم نگر کس نے کہا؟ اس کے ساتھ ہی ایک صاحب لنگڑاتے ہوئے آپہنچے۔ تربوز کہنے لگا تو آپ بھی ہمارے علاقے کے ہیں۔ ہاں بس کچھ ایسا ہی ہے۔ لیکن آپ کی ٹانگ کہاں رہ گئی۔ مت پوچھ بھئی ایک بڑے تربوز پر بیٹھتے ہوئے وہ صاحب بولے۔ دنیا میں ایک بار پھوپھی کو کوئی مشورہ دیا تھا۔ وقت حساب وہ اڑ گئیں کہ اس نے میرے معاملے میں ٹانگ اڑائی تھی معاف تو کردوں گی پر ٹانگ یہیں رہے گی۔ اوہو مگر خاتون خود کہاں ہیں؟ تربوز نے پوچھا۔ صاحب نے دور دھوئیں اور گرد کے غبار کی طرف اشارہ کیا۔ اسکا مطلب ہے پھوپھا یہاں ہوں گے۔ تربوز نے یقین سے کہا۔ نہیں وہ بھی وہیں ہیں اگرچہ نیک انسان ہیں لیکن وقت رخصت پھوپھی نے اتنا شور مچایا کہ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی اور نرم دل نورانی صورت اہلکار پھوپھا کو ایک طرف لے جا کر کہنے لگا حضرت چند دن کی بات ہے ٹھہر جائیں بعد میں اکٹھے چلے جائیے گا۔ چاہے وہاں جا کر جنگل میں گم ہو جائیے گا۔

اکٹھے؟ کیا مطلب؟ میاں یہ شریک حیات تھیں شریک بعد ممات نہیں ہیں۔ مجھے تو تم زہرہ مشتری پر بھیج دو میں ان کے ساتھ نہیں جانے والا۔ پھوپھا نے آخری فیصلہ سنا ڈالا۔ اوہو عمر گزر گئی اور خالہ زاد زہرہ نہیں بھولی۔ سنو جی تم آگے جا کر کرو گے بھی کیا تمہارے سب تو یہیں آئیں گے پھوپھی کی آواز آئی۔ اب پھوپھا کی باری تھی، ارے جانے دو تم بس یہ بتا دو تمہارے خاندان کیا پورے اسلاف میں کوئی ایک نیک شخص گزرا ہے۔ ہاں تایا جی جنہوں نے عین جوانی میں دنیا سے کنارہ کشی کر لی تھی، پھوپھی بولیں۔ پھوپھا کہنے لگے یہ تمہارے خاندان سمیت سب جانتے تھے کہ وہ دوسرے شہر ملازمت کو گئے تھے اور یہ کنارہ کشی زہد و تقویٰ کی بنا پر نہیں تھی اس جرم کی وجہ سے تھی جس کی پاداش میں انہیں کالا پانی ہوا تھا، ہونہہ دنیا سے کنارہ کشی۔

ہاں تو ہمارے چچا جنہیں سب پیر جی کہتے تھے وہ نیک نہیں تھے بولو، پھوپھی نے جواب داغا۔ بالکل نیک تھے مگر وہ تو لے پالک تھے تمہارے خاندان کا خون کیسے ہوئے۔ پھوپھا نے پوچھا۔ ٹھیک ہے دادا کو سیلاب میں بہتے ہوئے ملے تھے مگر تھے کیا نحیف یرقان زدہ ڈھانچہ، ان میں تو اپنے خاندان کا خون نہیں

تھا بھلا ہو دادا کی حکمت کا معجون فولاد کی دو خوراکوں میں ایسا خون بنا کہ انگریز لگنے لگے۔ اور اگر یہ بھی نہیں مانتے تو چلو ٹھیک، رہی بات کسی ایک نیک آدمی کی تو..... تو حضرت نوح علیہ السّلام۔ پھوپھی نے اطمینان سے جواب دیا۔ پھوپھا پیر پٹختے ہوئے بڑبڑا رہے تھے ضرور سام کی باقیات میں سے ہیں یہ لوگ۔

مغموم تربوز کہنے لگا تمہارے پھوپھا تو مجھ سے بھی زیادہ مظلوم نکلے۔ یہاں کی سنائیں۔ کیسی جگہ ہے۔ صاحب کہنے لگے کیا بات ہے سبحان اللہ۔ ہمارا علاقہ دو طبقات میں ہے۔ ایک اعلیٰ جس میں صلحا، حکما اور علما رہتے ہیں۔ ان سے کہیں بڑی آبادی دور دراز خطے میں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود تو ان میں سے کچھ بھی نہیں بلکہ عشر عشیر بھی نہیں بس اس بات کے دعویدار ہیں کہ فلاں حکیم ہمارے پڑوسی تھے، فلاں عالم ماموں کے ہم جماعت تھے، فلاں بزرگ دادا جان کے سالے تھے۔ کچھ نے اسی تعلق کی بنیاد پر حکمت شروع کر دی، کچھ نے مستعار کتابوں اور کسی عالم سے شناسائی کی بنیاد پر اپنے علم و فضل کی عمارت تعمیر کر لی، چند نے دراز گیسو کی مدد سے دادا جان کے برادر نسبتی کی بزرگی اپنے پر طاری کر لی اور زمانے تک نو واردوں کو تسلسل سے اپنی خاندانی حکمت اور عظمت کے قصے سنائے کہ خود انہیں بھی اسکا یقین آ گیا۔ ان کی زندگی دراصل ماضی بعید کی گردان کے سوا کچھ نہیں۔ تربوز بولا دولت و زر کی وراثت تو سنی تھی اس نوعیت کی وراثت پہلی بار سنی ہے۔ کہ حکمت محلے سے مل گئی، علم و زہد شب برأت کے حلوے کی طرح گھر آ گیا۔ صاحب نے تربوز کو گھورا تربوز دیکھ گیا کہ کہیں کھا ہی نہ لیں لیکن دوسرے لمحے ہی یہ ناممکن خیال جھٹک دیا۔ صاحب نے بات جاری

رکھی۔ حکمت و تقویٰ کے اسی تعلق اور فاصلے کے [illegible] سے مکان ملے ہیں لہٰذا باپ یہاں ہے تو لاکھوں میل دور بیٹا رہتا ہے کہ اس نے اسلاف سے خاندانی نام [illegible] لیا ہے علم اور اوصاف نہیں۔

گرمیوں کی ایک گرم دوپہر میں آم کے باغ سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ سرسراتی ہوا اور فرحت بخش سائے نے قدم تھام لئے۔ ابھی رکنے نہ پایا تھا کہ دیکھا ایک درخت کا خوش رنگ آم کچھ فاصلے پر ایک تربوز سے بحث میں مصروف ہے۔ میں نے سوچا کہاں نوابوں کا چہیتا پھل اور کہاں عام مزدوروں کا کھاجا۔ لیکن گفتگو ایسی دلچسپ تھی کہ سنے بغیر رہا نہ گیا۔

آم کہہ رہا تھا میاں تربوز کیا اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے اور تمھارے درمیان فرق کو ثابت کیا جائے؟

تربوز کہنے لگا قطعاً نہیں۔ اصل اور نقل میں کیا بحث۔ کیا مطلب؟ آم نے پوچھا۔ بھئی مطلب تو تم خوب جانتے ہو۔ زیادہ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ تربوز بولا۔

اب حیرانی کی باری میری تھی۔ میں نے تربوز سے پوچھا کہ اصل اور نقل سے کیا مراد ہے؟ کہنے لگا صحیح النسل ہونے کی بات ہے صاحب، اور آپ تو ہیں دور جدید کی پیداوار، سو یوں سمجھیں کہ اہل فرنگ میں کسی کا شجرہ پوچھو تو معلوم ہوتا ہے کہ پردادی روسی تھیں، دادی جاپانی اور والدہ فرانسیسی اور مردانے کا خانہ تک خالی؟ میں نے چھوٹتے ہی حیرت سے کہا۔

خالی؟ ارے میاں اتنا بھرا ہوا کہ الامان۔ ایسے بین الاقوامی تعلقات یا اختلاط عامہ کے نتیجے میں اکثر کوئی نیلی آنکھوں اور کالے بالوں والی نازک اندام حسینہ وجود میں آ بھی جائے تو اسمیں کون سا کمال کیا

اور اس حسن کا کیا کرنا جسکا اصل بے اصل اور ماضی کسی غریب کے مستقبل کی طرح موہوم ہو۔ بات کی وضاحت کرنے پر آؤں تو زاہدوں کا زہد خطرے میں اور تائبوں کو توبہ پر ملال ہونے لگے گا۔ بس کچھ ایسی کتھا اس زرد آم کی بھی ہے۔ قلم سہارن پور سے آئی ملتان میں جا لگی، حیدر آباد دکن سے پیوند آیا تو لاہور کے درخت میں لگا دیا گیا۔ میاں کوئی حد بھی ہے اختلاط کی۔ پھل نہ ہوا فرنگی معاشرہ ہو گیا، نہ باپ کی خبر نہ اجداد کی سرزمین کا پتا۔

آم کو اپنی زندگی کے بارے میں ایسی تیکھی تنقید کی توقع ہی نہیں تھی۔ کہنے لگا اخلاقیات کی پابندی انسانوں پر ہو تو ہو یہ پیوند کاری ان قیود سے یکسر آزاد ہے۔ لذت کام و دہن ہو یا لذت نفس اصل مزہ تو حدود کے اس پار ہی ہے اور خود تم کیا ہو؟ زمیں بوس بے ہنگم جسم، رفیق آلائش، زہر مہرہ رنگ اور اس پر ذہنیت پست اور زبان خاریدہ۔ کوتاہ نظری ایسی کہ اپنے کھیت کی منڈیر سے اس پار نظر نہیں آتا اور قلابے آسمان فرنگ کے..... کہاں میں لطیف ہواؤں میں پلنے والا خلائے بیکراں کا ساتھی، جو پھول بننے سے پھل پکنے تک کوئل کی کوک پر لہراتا باغبان کی آنکھوں کی محبت بھری آنچ سے سینچا جاتا ہوں اور کہاں تم جیسا حشرات الارض میں رہنے والا وجود۔

تربوز بولا میاں آم کہتے تو ٹھیک ہی ہو۔ کہاں نوابوں کی ملکیت، جاگیرداروں کی منظور نظر کنیز اور کہاں غریب کسان کا ذریعہ روزگار۔ کہاں تنگ و افلاس کی آگ کو گلزار کرنے والا تربوز۔ آسمان کی رفعتیں آپ ہی کو مبارک، ہمیں تو ہماری زمیں بوسی ہی بھاتی ہے۔ ایک گال زمین پر اور دوسرا رب آسمان کی جانب۔ آپ مستعار شیرینی اور مخلوط حسن پر نازاں، ہم ادنیٰ و رذیل مخلوق خدا میں خوش۔ فرق یہ ہے کہ آپ اتنے لطف و کرم اور ناز نخرے کے بعد جا کر کہیں شیریں ہوتے ہیں اور ہم سنگلاخ زمین اور بے مہر تپش میں رہ کر ہی ٹھنڈک اور شیرینی پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ تو قدرت کا کارخانہ ہے۔ کوئی رسیلے مہکتے پھولوں سے شہد بناتا ہے کوئی کڑوے کسیلے پتے کھا کر بھی فرحت بخش دودھ دیتا ہے۔ یہ تو جائے شکر ہے نہ کہ مقام فخر۔ آپ بنے امراء کی محفلوں کی جان اور ہم غرباء کے دستر خوان کی زینت۔ آپ کے حصے میں کوئل کی کوک آئی اور ہم مفلسوں کی صدائے شکر سن کر ہی جھومتے رہے۔ آپ کے لئے باغبان کی نگہبانی اور باغ کی قید مقدر ٹھہری ہم آزاد منش، درویشوں فاقہ مستوں کی طرح راہوں میں پڑے رہے۔

آم تلملا یا۔ کہنے لگا سچ کہا ہے بادشاہوں کو رعایا سے براہ راست مخاطب نہیں ہونا چاہیئے۔ نہ حفظ مراتب نہ رفعت خیال، ادب و احترام عنقا، کج بحثی میں کمال، علم و عقل مفقود اور جہل و رذالت میں بے مثال۔

یہ کہہ کر آم نے منہ موڑا اور پتوں کی اوٹ اوجھل ہو گیا۔

ادھر تربوز نے کروٹ لی اور دوسرے تربوز سے کہا۔ ارے انہیں جی بھر کر دیکھ لو معلوم نہیں کون سا آم کا تخم اگلے برس ان کی جگہ لے لے۔ ہونہہ..... بادشاہ..... ابن بادشاہ..... ابن بادشاہ.....

■■■

طنز و مزاح

عجب ہے یہ شہرِ شور و غوغا

غضب خدا کا یہاں تو ہر وقت، ہر طرف اور
ہر جگہ بس باجا ہی بجتا رہتا ہے

احمد حاطب صدیقی (اسلام آباد)

کراچی سے باہر (اور بیزار) رہنے والے ایک بزرگ کل ہمارے یہاں اچانک آ پہنچے!

ہم اُنھیں جانتے تو تھے.... غائبانہ طور پر.... مگر پہچانتے نہ تھے۔

آتے ہی اُنھوں نے سب سے پہلے ہم سے مصافحہ فرمایا، پھر ہمیں اپنے قریب کھینچ کر ہم سے معانقہ فرمایا اور اس دوران میں ہمارے ننگے منہ پر اپنی گھنی نورانی داڑھی کا اسپرے بھی فرمایا۔ پھر اپنی صفاچٹ مونچھوں والے ہونٹ تلے ہلکے سے مُسکرا کر ذرا کڑوا سا منہ بنایا اور فرمایا:

”حقیر کو مشتاق کہتے ہیں!“

ہم لگے اُن کی دِل جُوئی کرنے:

”بہت غلط کرتے ہیں.... اگر ہمارے سامنے کسی نے ایسا کیا تو آپ اطمینان رکھیے.... ہم ایک گھونسے سے اُس کی بُوتھی بگاڑ دیں گے.... نہ جانے زمانۂ قدیم ہی سے ایسی جاہلانہ رسم کیوں چلی آرہی ہے؟ چچا غالبؔ نے بھی آپ ہی کی طرح (کڑوا سا منہ بنا کر) یہ شکایت کی تھی کہ:

”ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں“.... اور بُروں کو اچھا.... آپ سے قبل بھی ایک صاحب کو ”کافور“ کہے جانے کی شکایت دُنیائے شعروادب کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ: ”بر عکسِ نہند نامِ زنگی کافور“ اور.....“ ہم آنکھیں موندے اور منہ کھولے تقریر کیے جا رہے تھے کہ اُنھوں نے ہمارا کندھا دبا کر ہماری آنکھیں کھلوائیں اور قدرے غُصیلے لہجہ میں بتایا:

”برخوردار میں مُشتاق ہوں..... مُشتاق..... شاہ مُشتاق الحق حقانی عفی عنہ۔“

اب ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ غلطی کا ازالہ کرنے کے لیے ہم نے ایک دِل خراش چیخ ماری اور اُن کے چوڑے چکلے سینۂ سوزاں سے لپٹ گئے:

”پھُوپھا.... ارے پھُوپھا.... آپ اکوڑہ خٹک سے کب تشریف لائے؟“

اُنھوں نے ہمیں اپنے سینے سے بہ زورِ بازو الگ کر کے ہمارے پس پُشت اشارہ کیا۔ پلٹ کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ پیچھے کھڑی ہوئی ٹیکسی پر اُن کا سامان کھچا کھچ لدا ہوا ہے۔ ویسا ہی سامان جسے دیکھ کر سید ضمیر جعفری (مرحوم) نے بڑی حیرت سے پوچھا تھا:

جنابِ والا کا یہ سات منزلہ صندوق
کسی مکاں کے لیے ہے کہ لامکاں کے لیے؟

مگر اب قبلۂ عالم ہمارے مہمان تھے۔

☆☆☆

ایک روز بیٹھے بیٹھے حکم فرمایا:

”میاں ذرا اپنا شہر تو دکھانا!“

بالکل ویسے ہی سرسری انداز میں جیسے کہہ رہے ہوں کہ: ”میاں ذرا یہ اخبار تو دکھانا!“

اب ہم اُنھیں بھلا کیسے بتاتے کہ ہمارا شہر دیکھنے کے لیے ”دیدۂ عبرت نگاہ“ ہونا اور اس کو دیکھنے سے پہلے ”گوشِ نصیحت نیوش“ کرنا ضروری ہے۔ ہمارا شہر دیکھ لینا ہر ہمہ شُما کے بس کی بات نہیں۔ داغؔ دہلوی نے غالباً ہمارے ہی شہر کا قصد کرتے ہوئے اپنا قصیدہ پڑھا تھا:

بہرِ نظارہ چلا ہے کوچۂ قاتل کو داغؔ
کس قیامت کا کلیجا، کس غضب کا دیدہ ہے

ہمارے شہر کو داغؔ کی نظر لگ گئی۔ یعنی:

دِل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اِس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اب تو یہ بات نہیں رہی، مگر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب ہمارا شہر کراچی فقط شعر و سخن ہی کی اصطلاح میں ”کوچۂ قاتل“ تھا۔)

مگر ہم اُنھیں یہ باتیں بتانے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ دیگر وجوہ کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگر ہمارے منہ سے یہ نکل جاتا کہ:

”ہمارا شہر دیکھنا ہر ہمہ شما کے بس کی بات نہیں۔“

تو وہ یقیناً اپنے آپ کو ”ہر ہمہ شما“ کی بھیڑ سے بھڑک کر باہر نکال لینے کو بھاگنے کے لیے پورا پورا زور لگا ڈالتے اور اپنے ہی زور میں ہمیں بھی باہر نکال لے جاتے۔ پس جب ہم نے دیکھا کہ ہر صُورت میں نتیجہ ایک ہی نکلنا ہے، یعنی:

ناکامیٔ عشق یا کامیابی
دونوں کا حاصل خانہ خرابی

تو آدابِ میزبانی پر کیوں حرف آنے دیا جائے؟ حرف آجانے کے بعد بھی، کرنا تو وہی پڑتا، جو وہ چاہتے تھے۔ پس ہم نے اُن کو جوتے پہنوائے اور گھر سے باہر نکال لائے۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا!

ہم نے اُن کا گوشِ نصیحت نیوش کروا کے راستے بھر جو ”آدابِ شہر بینی“ ازبر کروائے تھے، اُنھیں پہلے ہی پوائنٹ پر بھُلا بیٹھے اور سیدنا موسیٰ علیہ السّلام کی سنت پر عمل کرتے ہوئے بے صبری سے سوال کر بیٹھے:

”ارے میاں! یہ کیسا شہر ہے؟“

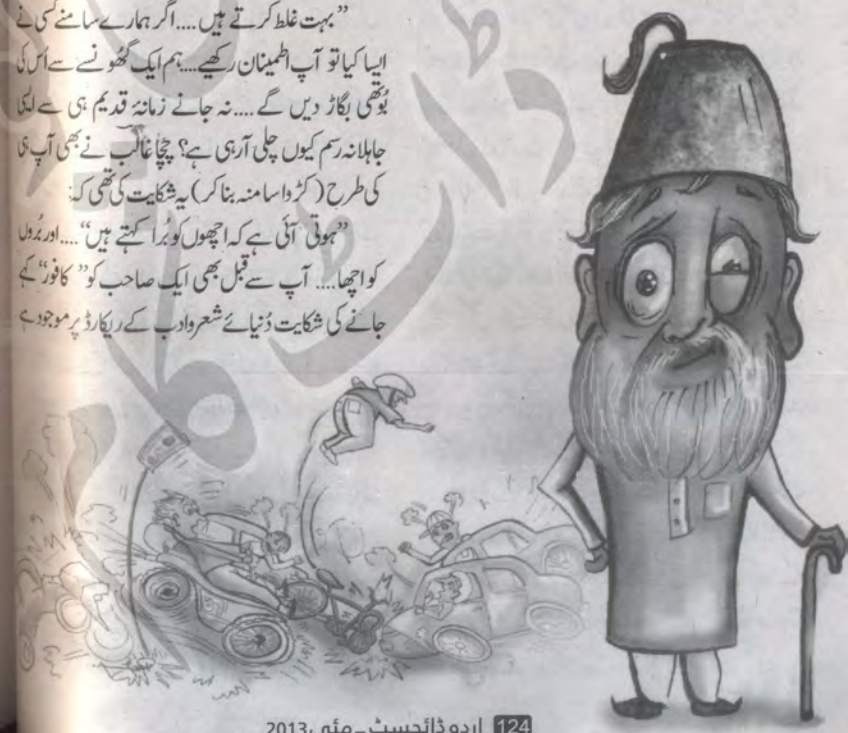

اردگرد کے خواتین و حضرات کی تیز چُبھتی ہوئی نظروں سے بچنے کے لیے ہم نے سر جھکا کر عرض کیا:

"کیا عرض کریں! بس ایسا ہی شہر ہے۔"

غضبناک ہو کر بلند آواز سے بولے:

"عجب ہے یہ شہرِ شور و غوغا..... غضب خدا کا..... یہاں تو ہر وقت، ہر طرف اور ہر جگہ بس باجا ہی بجتا رہتا ہے۔"

جی چاہا کہ اُن کا دامن تھام کر بازو تھامے جائیں اور درخواست کی جائے کہ:

"آئیے! اب کان دبا کر گھر کی سمت لوٹ چلتے ہیں۔ بس ہو چکی نمازِ مصلّیٰ اُٹھائیے!"

لیکن ہم ان دونوں میں سے کوئی بات یا دل تک آئی ہوئی مگر زبان تک آتے ہوئے دل کو ڈرائی ہوئی ایسی ہی بہت سی باتوں میں سے ایک بات بھی ان سے کہہ نہ پائے۔ بس دل مسوس کر رہ گیا کہ:

افسوس! کیسے کیسے سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

کہہ بیٹھتے تو وہیں اُڑ جاتے۔ سو اُن کے بجائے ضبط کا دامن تھام لیا اور عرض کیا:

"ابھی آپ نئے نئے آئے ہیں۔ کچھ دن یہاں قیام رہے گا تو ہماری طرح آپ بھی اس پُر شور زندگی کے عادی ہو جائیں گے۔"

بدک کر بولے:

"محض پُر شور؟ ارے میاں! ہم نے تو کسی شہر کے شہریوں کو اس قدر بھاگم بھاگ اور بھگدڑ بھری زندگی بسر کرتے نہیں دیکھا۔ ہمیں یقین ہے کہ اس شہر کے لوگ اپنی عُمرِ عزیز بھی اُسی پھرتی سے بسر کر جاتے ہوں گے، جس پھرتی کا ذکر لسان العصر حضرت اکبر الٰہ آبادیؒ نے یوں کیا ہے کہ:

"بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے"

غضب خدا کا..... جس چوک پر بھی دیکھو یہی دکھائی دیتا ہے کہ..... دوا دو ہر طرف بھگدڑ مچی ہے!..... واللہ! ہم نے کسی دوسرے شہر کے شہریوں کو ایسے شور و شغب میں یوں بندروں کی طرح چھلانگیں مار مار کر جیتے نہیں دیکھا۔"

اُن کا کہنا درست تھا۔ اُنھوں نے زندگی بھر اکوڑہ خٹک کے سوا کبھی کوئی شہر دیکھا تھا نہ شہری۔ مذکورہ شہر بھی بس اتنی ہی دیر کو دیکھا ہوگا جتنی دیر اُنھیں اپنے گھر سے دارالعلوم تک جانے یا وہاں سے گھر واپس آنے میں لگتی ہوگی۔

کراچی کے شہریوں کو جیتے جاگتے بندر قرار دے کر جب وہ خود اپنے فقرے اور ہمارے اہلِ شہر پر مُسکرا چکے تو ہم نے اُنھیں بتایا:

"آپ تو خیر ایک نسبتاً پُر سکون شہر سے تشریف لائے ہیں۔ احسان دانش مرحوم زندہ دلوں کے شہر لاہور سے جب یہاں تشریف لائے تو اُن کے میزبان بھی اُنھیں اسی جگہ یعنی صدر ایمپریس مارکیٹ لے آئے۔ انھوں نے بھی جب ایک بھیڑ کو بھگوڑوں کی طرح بھاگتے دیکھا تو سہم کر تھم گئے۔ میزبان نے اُن کو یوں سراسیمہ ہو کر ٹھٹکتے دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا:

"حضرت کیا ہوا؟" حضرت نے (دوڑتے ہوئے ہجوم کی طرف اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) خوف بھرے تجسّس سے پوچھا: "یہ..... یہ..... شہر کیوں خالی کرا رہا ہے؟"

موصوف یہ قصہ سن کر خاصے مسرور ہوئے۔ ہو چکنے کے بعد کہنے لگے:

"اللہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت کی پُر سکون نیند نصیب کرے۔ آمین!"

یہ کہہ کر اپنے مُنھ پر (اپنا ہی دُعا بھرا) ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا:

"واللہ مرحوم و مغفور نے اس میدانِ حشر کی کیسی جامع لفظی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے!"

تھوڑی دیر تک اس تصویر سے آنکھیں میچ کر لطف اندوز ہوتے رہے پھر آنکھیں کھول کر فرمایا:

"اگر ہم ہوتے تو مرحوم کو یہ بتاتے کہ سامنے فُٹ پاتھوں پر اور ان کے عقب میں موجود دکانوں پر جو شورِ قیامت برپا ہے، اُسی نے تو اِن شہریوں کے اندر چابی سی بھر دی ہے۔"

عرض کیا:

"آپ ہیں تو سہی، اگر ہم ہوتے" کی مشروط بدفال کیوں مُنھ سے نکال رہے ہیں؟ اگر آپ مرحوم کو کچھ بتانے کی خواہش رکھتے ہیں تو ابھی جا کر بہ نفسِ نفیس بتا سکتے ہیں۔ کراچی کی سڑکوں پر اس خواہش کی تکمیل کا معقول انتظام ہے۔ ایک پچھتاوا دِل میں لے کر جینے کا کیا فائدہ؟"

مگر ہماری سُنے بغیر اپنی ہی سُنائے گئے کہ:

"یہاں کوئی قیامت سی قیامت ہے؟ دیکھو تو سہی..... ایک طرف اگر ڈسکو میوزک سینٹرز نامی موسیقی فروشی کی دکانوں کے مابین شور شین کا مقابلہ ہو رہا ہے تو دوسری طرف یہ بَن کبابیے، کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ، اپنے توے پیٹ پیٹ کر گویا طبلے پر سنگت کر رہے ہیں۔ تیسری طرف موٹر سائیکلوں اور آٹو رکشوں والے اپنے اپنے سائلنسر نکالے باہم صور پھونکنے کا میچ کھیل رہے ہیں۔ صاحب ایک سے بڑھ کر ایک کریہہ آواز نکالی جا رہی ہے۔ چوتھی سمت میں بسوں اور ویگنوں والے اپنے ہاتھوں، اپنی ہی، بسوں اور ویگنوں کو "دھم دھم، دھم دھم" کُوٹے ڈال رہے ہیں۔ اس میدانِ حشر سے آدمی بھاگے گا نہیں تو کیا اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی سزا پانے کے شوق میں یہیں ڈٹا کھڑا رہے گا؟ ارے دیکھو تو سہی کہ لوگ بے چارے کس طرح..... گرتے، سنبھلتے، جھومتے..... سڑکوں کے کھمبے چومتے..... بھاگے چلے جا رہے ہیں۔"

دورانِ تقریر میں..... یکا یک..... اُنھیں سانس لینے کی ضرورت پڑ گئی۔ لمحہ بھر کو تھمے تو ہم نے اس نادر موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فی الفور وضاحت کی کہ:

"ملک کی طرح ہمارے شہر کا بھی مرکزی مقام "صدر" ہی ہے۔ یہاں پر آپ کو جو اس قدر ہجومِ خلائق نظر آ رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں سے ہر طرف کو راستے نکلتے ہیں۔ شہر کے گوشے گوشے میں جانے کی سہولت موجود ہے۔"

بڑے برہم لہجہ میں بولے:

"خاک سہولت موجود ہے۔ ہمیں یہاں کھڑے کھڑے گھنٹہ سوا گھنٹہ تو ہو ہی گیا ہوگا۔ ہم گھنٹہ بھر سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ سامنے والی بس کا کنڈیکٹر اپنی بس سے نیچے اُتر کر اُسی کو دو ہتڑ رسید کیے جا رہا ہے..... اور داد دینی پڑتی ہے کہ..... گھنٹے ہی بھر سے مسلسل..... "لالیکے..... لالیکے" کی رَٹ لگائے جا رہا ہے۔ لوگ اُس کی بس میں سر کے بل گھسے جا رہے ہیں اور گیٹ سے ٹانگوں کے بل اُبلے آ رہے ہیں، مگر وہ بندۂ خدا اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ ساٹھ منٹ سے بس میں سواریاں ٹھونسے یہیں کھڑا ہے اور مسلسل و متواتر "لالیکے..... لالیکے" کی گردان پڑھے جا رہا ہے۔ اماں! یہ تو بتاؤ کہ اس "لالیکے..... لالیکے" کا آخر مطلب کیا ہے؟"

ہم نے عرض کیا کہ: "شہر کے ایک مشہور و معروف علاقے "لالوکھیت" جانے کا قصد رکھنے والوں کو متوجہ کر رہا ہے کہ..... جا اینجاست!"

آنکھیں نکال کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے: "اچھا.....؟ ہر چند کہ اب تو بس میں کنڈیکٹر دھرنے کی بھی جانہیں رہی، مگر واللہ! کیا انداز ہے دامن کھینچنے کا (پکڑ پکڑ کر)۔ مزید برآں شارٹ کٹ اور شارٹ ہینڈ کے شوق نے اس شہرِ عجلت و اختصار پسند کے شہریوں ہی کا نہیں شہر کی بستیوں کے ناموں کا بھی بیڑا غرق کر دیا ہے۔"

ایک بار پھر شہر کی صفائی (پیش) کرنے کی کوشش کی:

"دراصل ہمارا شہر پھیلتا جارہا ہے۔ دور دراز جگہوں تک پہنچنے کی اتنی جلدی ہوتی ہے کہ کسی کے پاس درست شین قاف کے ساتھ آواز نکالنے کا وقت ہے نہ کسی کے پاس وہاں کھڑے ہوکر اپنی نگرانی میں نکلوانے کا (ہمیں مولانا سے ڈر تھا کہ اب یہ کام نہ شروع کردیں) یہاں کوئی کسی کی نہیں سُنتا، بس سنی ان سنی کر کے گزر جاتا ہے۔"

اب ذرا بلند آواز سے ڈانٹنے کے انداز میں بولے: "سُنے کیسے؟ اس شہر میں گونجتی ہوئی یہ 'کان لیوا موسیقی' کسی کو کچھ سننے دے تو کوئی کسی کی سُنے نا! یہ موسیقی ہی سن سن کر سب کے کان سُن ہو چکے ہیں۔ شہر بھر میں موسیقی کا ایک ہیجان برپا ہے۔ یوں تو گھر گھر ریڈیو، ٹیلی وژن اور گانوں کے کیسٹ مسلسل بجتے ہی رہتے ہیں۔ مگر کل جب تمھارے محلے میں کسی کی دُختر نیک اختر کی شادی ہورہی تھی تو جو عزیز، رشتہ دار اور اہلِ محلّہ تقریب میں آموجود ہوئے تھے اُنھی کا دِل بہلانے کو نہیں، بلکہ شہر کے مختلف حصوں سے جو مہمان ضعیفی، بیماری یا کسی اور عذر سے نہیں آسکے تھے، اُنھیں بھی محظوظ کرنے کو لاؤڈ اسپیکر کی پوری آواز کھول کر گانے بجائے جارہے تھے۔ ممکن ہے کہ مرحوم اعزہ بھی بینڈ باجے بجنے کی آواز سن کر اپنی اپنی قبروں سے نکل کھڑے ہوئے ہوں۔"

مضحکہ اُڑانے کے بعد غصہ میں استفسار فرمایا: "میں پوچھتا ہوں کہ اس تکلیف دہ مشغلہ کا کسی کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟"

ہم نے اُن کی اطلاع کے لیے عرض کیا: "اس طرزِ [illegible] کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تقریب میں آئے ہوئے تمام مہمان اپنی سماعت زائل ہوجانے کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے خاموش بیٹھے رہتے ہیں اور یوں وہ شہر بیاہ کی محفلوں کی روایتی برائیوں مثلاً میزبان کی بدانتظامی، نکتہ چینی یا غیر حاضر رشتہ داروں کی غیبت وغیرہ کے گناہ سے مبتلا ہوجانے سے بچے رہتے ہیں۔"

یہ سن کر تو ایک بار پھر بدک اُٹھے:

"سماعت زائل ہوجانے کا خوف چہ معنی دارد؟ ہم نے یہ دیکھا ہے کہ سماعتیں زائل ہوچکی ہیں۔ تم ہمیں جس [illegible] میں چڑھا کر .... بلکہ میہوڑا کر .... یہاں تک لے آئے ہو، ہم نے اُسی میں دیکھا کہ ڈرائیور بریکوں کے چھکّے دھچکے دے دے کر اور کنڈیکٹر دھکوں پر دھکے دے دے کر لوگوں کو ڈانٹتا رہا کہ: "باؤ جی آگے بڑھو..... آگے باؤ جی!" مگر باؤ جی ہیں کہ باؤلے بنے جہاں کے تہاں کھڑے ہیں۔ ٹس سے مس نہیں ہورہے ہیں۔ جس طرح کنڈیکٹر ویگن کو باہر سے پیٹ رہا تھا اُسی طرح مسافر [illegible] اندر سے پیٹ رہے تھے کہ: "اُستاد جی گاڑی چلاؤ..... چلاؤ اُستاد جی!" مگر اُستاد جی بھی موسیقی کی دھن میں [illegible] اپنا سر دھنتے رہے، جب کہ گاڑی دونوں طرف سے دُھن [illegible] رہی۔ کوئی کسی کی سننے کے قابل نہیں رہا۔"

ہم نے دبی دبی زبان سے کہا:

"دراصل سب کہیں نہ کہیں پہنچے ہوئے ہیں۔ اپنے اپنے روحانی ارتقا کے باعث۔ ہم نے تو سنا ہے کہ موسیقی روح کی غذا ہے....."

جلدی سے بات کاٹ کر ہمیں خونخوار نگاہوں [illegible] دیکھتے ہوئے بولے: "ہے..... مگر تمھاری یہ موسیقی معلوم بھی ہے کہ کس روح کی غذا ہے؟"

ڈرتے ڈرتے پوچھا: "کس روح کی غذا ہے؟"

دُپٹے ہوئے بتایا:

"کسی بدروح کی غذا ہے، جو یہ چیختی، چنگھاڑتی موسیقی سن سن کر طاقتور ہوئی جارہی ہے اور پورے شہر پر چھارہی ہے۔ ہمارا تو مشاہدہ یہ ہے کہ تمھارے شہر کی ٹریفک پولیس کی سماعت بھی جاتی رہی ہے۔ کیوں کہ یہ وِیگنیں اُن کی ناک، ان کے منہ اور اُن کے دیگر اعضاء کے آگے سے گاتی بجاتی گزر جاتی ہیں اور وہ نابیناؤں کی طرح کھڑے خلاؤں میں گھورتے رہ جاتے ہیں۔" ہم نے پھر وضاحت کی:

"ہمارے شہر کی پولیس کی بینائی ہی نہیں، اُس کی سماعت بھی بالکل "سکس بائی سکس" ہے۔ جب "دھاڑ" یا "دیہاڑ" لگانی ہوتی ہے تو کسی سارجنٹ کی سرپرستی میں ایسی گاڑیاں اُنھیں کلومیٹروں دور ہی سے دکھائی بھی دے جاتی ہیں اور سنائی بھی۔"

یکایک اُنھیں ایک بات یاد آگئی: "میاں! تم تو مسافروں کے دھکے کھا کھا کر پیچھے تک پسپا ہوگئے تھے۔ ہمیں آگے کوڈرائیور کی سیٹ کے عقب میں دھانس دیا گیا تھا۔ ہم نے اسی حالت میں یہ مشاہدہ بھی کیا کہ ویگن ڈرائیور ٹریفک پولیس کے دودھیا آستانوں اور بزرگوں کے مقبروں، مزاروں اور زیارتوں کو قریب آتے دیکھتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے کیسٹ آف کردیتا ہے، لیکن اِس قُربت کے خاتمہ پر پھر آن کر دیتا ہے، ہم بیٹھے ہوئے مسافروں کے سر پر کسی شجرِ سایہ دار کی طرح حالتِ رکوع میں لیٹے ہوئے تھے کہ ایسا ہی ایک موقع ہاتھ آگیا۔ ہم نے دیر سے لیٹے لیٹے کسی کچھوے کی طرح ذرا سی گردن اُٹھائی اور اُسے غیرت دِلائی کہ: "میاں جب تم مقبروں، مزاروں، آستانوں اور تُربتوں کا اتنا احترام کرتے ہو تو یہ جو تم نے ہم جیسے "اُمتِ مرحوم کے مسافروں" کی اجتماعی قبر بنا رکھی ہے، اس کا بھی تو احترام کرو۔ کم از کم ہمارے سرہانے تو باجا مت بجاؤ۔" اس پر اُس ستم ظریف ڈرائیور نے ہم اہلِ قبور سے تو کچھ سلام کلام نہ کیا، البتہ گانے کی نسوانی آواز میں اپنی مردانی آواز (کے گُر) کا رس گھولتے ہوئے الاپنے لگا کہ..... آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو باپ....."

"باپ رے باپ..... بلکہ..... پاپ رے پاپ"

ہمارے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ہم نے مولانا کی تصحیح کرتے ہوئے اُنھیں بتایا کہ: "بات بن جائے..... بات بن جائے..... مغنّیہ کے منہ سے اتنے فحش بول نہیں نکلے تھے جتنے آپ کے منہ سے بس نکلنے ہی والے تھے....."

ہماری بات کاٹ کر ہمیں سمجھانے لگے:

"ارے میاں منہ پر کچھ ہوتا ہے اور دل میں کچھ۔ خواتین کی موجودگی میں ایسے ایسے بے ہودہ، واہیات اور ذواالمعنین گانے بجتے رہتے ہیں کہ گمان گزرتا ہے کہ پوری انتظامیہ کے کان "کر" ہوچکے ہیں۔ کسی کو یہ شور شرابا قطعاً سنائی نہیں دیتا۔"

ہم نے پھر اپنی شہری انتظامیہ کی لاج رکھنے کی کوشش کی: "نہیں نہیں، ایسی بات نہیں۔ ہم تو اسی شہر میں پیدا ہوئے ہیں۔ یہیں پلے بڑھے ہیں۔ ہمیں یہاں آج تک کوئی شہری انتظامیہ دکھائی تو کیا سنائی بھی نہیں دی۔"

بس یہ سنتے ہی اُن کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ سنسنی دوڑتے ہی وہ خود بھی دوڑ گئے، ہمارا ہاتھ چھڑا کر۔ ہم نے اُن کو ایک بریک مارتی ہوئی ویگن کی زد میں آنے سے کود کود کر بچتے ہوئے تو دیکھا مگر اُس کے بعد وہ ہجوم میں ایسے گم ہوئے کہ دوبارہ نظر نہیں آئے۔ اب ہم اتنے بھیڑ بھڑکّے میں اُنھیں کہاں کہاں ڈھونڈتے؟

■■■

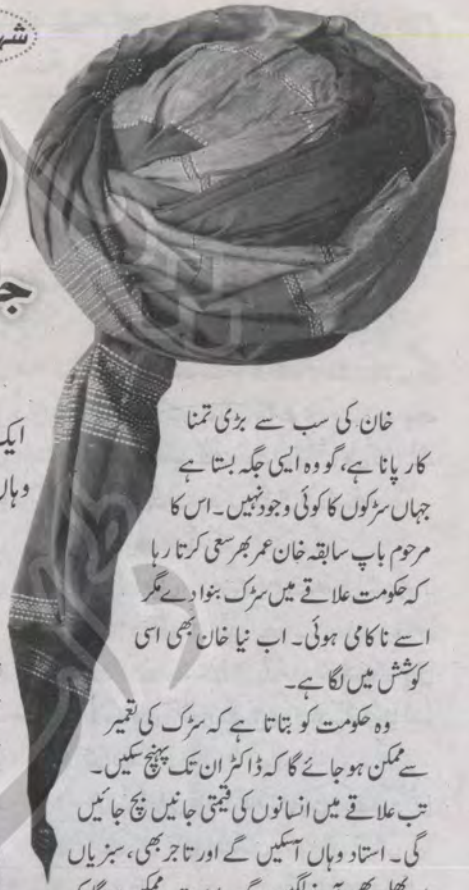

واخان

جہاں کاغذی کرنسی کاگزر نہیں

ایک خوب صورت اور شاعرانہ نام کے باوجود وہاں موسم اس قدر بے رحم ہے کہ انسان بمشکل ہی زندہ رہ پاتے ہیں۔

سعید انصاری

خان کی سب سے بڑی تمنا کار پانا ہے، گو وہ ایسی جگہ بستا ہے جہاں سڑکوں کا کوئی وجود نہیں۔ اس کا مرحوم باپ سابقہ خان عمر بھر سعی کرتا رہا کہ حکومت علاقے میں سڑک بنوا دے مگر اسے ناکامی ہوئی۔ اب نیا خان بھی اسی کوشش میں لگا ہے۔

وہ حکومت کو بتاتا ہے کہ سڑک کی تعمیر سے ممکن ہو جائے گا کہ ڈاکٹر ان تک پہنچ سکیں۔ تب علاقے میں انسانوں کی قیمتی جانیں بچ جائیں گی۔ استاد وہاں آسکیں گے اور تاجر بھی، سبزیاں اور پھل بھی آنے لگیں گے۔ یوں تب ممکن ہو گا کہ افغانستان کے دور دراز علاقے میں مقیم اس کے قبیلے والے زندہ رہ سکیں۔ سڑک بنتے دیکھنا خان کا خواب ہے اور کار پانا دلی تمنا۔

لیکن ابھی نہ سڑک ہے اور نہ کار، چناں چہ خان اور اس کے سبھی قبیلے والوں کا یاک (پالتو بیل) پر انحصار ہے۔ آج آغاز سفر کا دن ہے۔ اسی لیے خان اپنے لوگوں کے ساتھ یاکوں پر سامان باندھنے لگا۔ سفر ان قبائلیوں کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ وہ موسم اور گھاس کی دستیابی کے حساب سے سال میں تین چار بار ہجرت کرتے ہیں۔

یہ لوگ افغان کرغز کہلاتے اور خان پٹی کے باسی ہیں۔ اپنے وطن کو ''بام دنیا'' کہہ کر پکارتے ہیں یعنی دنیا کی چوٹی۔ یہ ایک خوبصورت اور شاعرانہ نام ہے۔ علاقہ بھی خاصی فطری خوبصورتی رکھتا ہے، تاہم وہاں کا موسم اتنا سخت و بے رحم ہے کہ انسان بمشکل ہی زندہ رہتے ہیں۔

واخان پٹی دو طویل وادیوں پر مشتمل ہے جن کے اردگرد بلند و بالا پہاڑ ہیں۔ ان کی اوسط اونچائی 14 ہزار فٹ ہے۔ وہاں تیز و تند ہوائیں چلتی ہیں اور فصل اگانا ناممکن ہے۔ سال کے 340 دن درجہ حرارت منفی درجے پر رہتا ہے۔ واخان میں بسنے والے کئی لوگوں نے آج تک درخت نہیں دیکھا۔

لمبی و پتلی واخان پٹی شمال مشرقی افغانستان کے کونے میں واقع ہے۔ یہ علاقہ انیسویں صدی میں برطانیہ اور روس کے مابین کھیلی گئی ''گریٹ گیم'' کی بدولت وجود میں آیا۔ اس زمانے کی دونوں سپر پاور وسطی ایشیا میں اپنی برتری چاہتی تھیں۔ آخر 1873ء تا 1895ء کے مابین انھوں نے دوستانہ معاہدے کیے اور انہی کے باعث واخان پٹی نے جنم لیا۔ اس کے ذریعے روس اور برطانیہ کے درمیان بفرزون قائم ہو گیا۔ پچھلی صدیوں میں یہ علاقہ شاہراہ ریشم کا حصہ تھا۔

بیسویں صدی میں کمیونسٹ انقلاب آئے اور نت نئی سیاسی تبدیلیوں نے جنم لیا تو سرحدیں مستحکم ہو گئیں۔ یوں واخان کا آزاد علاقہ شمال مغرب میں افغانستان کے درمیان گھر کر رہ گیا۔ واخان پٹی دو سو میل لمبی ہے جس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں۔ اسی لیے وہاں مقیم کرغز، مرکزی افغان معاشرے ہی نہیں جدید تاریخ اور سیاست سے بھی کٹ کر رہ گئے۔ آج بھی انھیں یہی لگتا ہے کہ وہ کسی الگ تھلگ ملک میں آباد ہیں۔

واخان پٹی سے قریب ترین سڑک تین روز کی مسافت پر ہے۔ اس دوران ایسے دشوار گزار پہاڑی راستوں سے گزرنا پڑتا ہے کہ ذرا پیر پھسلے تو جان جاتی ہے۔ خان اسی سڑک کو واخان پٹی تک لانا چاہتا ہے۔ ہسپتال اور دکانیں رکھنے والا شہر مزید ایک دن کی مسافت پر ہے۔ شدید تنہائی کی وجہ سے ہی افغانستان کرغزوں میں شرح اموات بہت زیادہ ہے۔

پٹی میں ڈاکٹر ہیں اور نہ کلینک اور لوگ جڑی بوٹیوں پر مشتمل چند ادویہ ہی استعمال کرتے ہیں۔ اسی لیے معمولی زخم یا کھانسی نزلہ بھی بعض اوقات جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں شاید کرغز بچوں کی شرح اموات سب سے زیادہ ہے..... صرف 50 فیصد ہی اپنی پانچویں سالگرہ تک زندہ رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیش تر والدین اپنے چھ سات بچوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اسی طرح دوران زچگی کئی خواتین چل بستی ہیں۔

اب ایک جوڑے عبدالمطلب اور ہالا خان ہی کو لیجیے۔ جن کے ہاں 11 بچے تولد ہوئے۔ عبدالمطلب کہتا ہے، ''ہمارے سبھی بچے تین چار سال کے ہو کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بیش تر ایسی بیماریوں سے چل بسے جن کا بآسانی علاج ممکن تھا۔ بچوں کی اموات نے ہماری دنیا اندھیر کر دی یہ جوڑا اب افیون کا اسیر ہو چکا جو علاقے میں وافر ملتی ہے۔''

علاقے میں صرف خان بیرونی دنیا سے آگاہ ہے۔ وہ دوبار پٹی سے باہر جا چکا ہے۔ نیز وہ واخان آنے والے تاجروں سے بھی تبادلہ خیال کرتا ہے جو مویشی خریدنے آتے اور کپڑے، زیورات، عینکیں، کاٹھیاں، قالین اور موبائل فون دے جاتے ہیں۔ گو یہ موبائل کالیں کرنے نہیں موسیقی سننے اور تصاویر اتارنے کے کام آتے ہیں۔

خان کو شدت سے احساس ہے کہ بقیہ دنیا رفتہ رفتہ اسے اور اس کے لوگوں کو پیچھے چھوڑ رہی ہے۔ واخان میں تقریباً 1100 افغان کرغز خانہ بدوش بستے ہیں۔ ان میں ابتدائی تعلیمی نظام اب آ کر شروع ہوا ہے۔ خان

بھی مکمل طور پر ناخواندہ ہے۔ تاہم اسے یہ ضرور معلوم ہے کہ دنیا میں تقریباً سبھی لوگوں کو علاج میسر ہے۔ دنیا والے کمپیوٹروں اور کاروں کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور بچے علاج کے لیے ترستے ہوئے جان نہیں دیتے۔

یہ جان کاری نوجوان خان کو چین نہیں لینے دیتی، وہ صرف 32 سال کا ہے۔ تاہم زندگی کی سختیوں نے اسے سخت جان بنا دیا۔ اس کا نام حاجی روشن خان ہے۔ وہ اور اس کی بیگم تو لیک چار بچیوں کے والدین ہیں۔ ''حاجی'' کا لاحقہ نام کے ساتھ اس لیے لگا کہ وہ حج کر چکا ہے۔

افغان کرغز سنی مسلمان ہیں۔ 2008ء میں روشن خان اپنے والد عبدالرشید خان کے ساتھ مکہ مکرمہ گیا۔ چودہ بچوں میں صرف اسی کو یہ اعزاز ملا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ واخان سے باہر گیا۔ دوسری بار 2012ء کے موسم بہار میں کرزئی سے ملا اور ان پر زور دیا کہ وہ واخان میں کلینک، اسکول اور سڑک تعمیر کرائیں۔

گو اس کا باپ خان تھا، لیکن یہ عہدہ وراثتی نہیں۔ قبیلے کے بزرگ خان کا انتخاب کرتے ہیں۔ لہٰذا 2009ء میں عبدالرشید اللہ کو پیارا ہوا تو بزرگوں نے روشن کو خان بنا لیا۔ یہ فیصلہ خیمے میں ہوا جو ان کی زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔

بام دنیا کے باسی افغان کرغز غریب نہیں کہے جا سکتے۔ گو ان میں کاغذی کرنسی عنقا ہے اور ہر گھرانا مویشیوں کی تعداد کے لحاظ سے امیر ہوتا ہے۔ مویشیوں میں بھیڑ، گدھے، گھوڑے، یاک اور اونٹ شامل ہیں۔ کرغز کرنسی کی بنیادی اکائی بھیڑ ہے۔ واخان میں ایک موبائل فون کی قیمت ایک بھیڑ ہے۔ اعلیٰ قسم کا گھوڑا 50 بھیڑوں میں ملتا ہے۔ جب کہ 100 بھیڑیں دے کر دلہن مل جاتی ہے۔ علاقے کے امیر ترین خاندان دو کوہانوں والا اونٹ (باختری اونٹ) رکھتے ہیں۔

علی بھائی کا شمار بھی امراء میں ہوتا ہے۔ وہی واخان میں ایک مرغی رکھنے والا واحد باشندہ ہے۔ اس کے پاس مرغ بھی تھا، لیکن وہ سردی لگنے سے چل بسا۔ علی بھائی ہی نے روشن کو خان بنوانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ورنہ کئی بزرگوں کا کہنا تھا کہ وہ ابھی ناتجربہ کار ہے۔

خان سمیت تمام کرغز وادی کے جنوبی گرم حصے میں موسم سرما گزارتے ہیں۔ وہاں وہ مٹی کی جھونپڑیاں بنا کر رہتے ہیں۔ جب موسم گرما ہو تو وہ پہاڑوں کے نزدیک آجاتے ہیں۔ وہاں خیمے (یورت) ان کی رہائش گاہیں بنتے ہیں۔

واخان پٹی دنیا کے تین بڑے سلسلہ ہائے کوہ..... ہندوکش، قراقرم اور قنلن کے اتصال پر واقع ہے۔ اس جگہ پہاڑ اتنے ملے جلے ہیں کہ وہ ''پامیر ناٹ'' (Pamir Knot) کہلاتی ہے۔ یہی پٹی مشرق اور مغرب، دونوں اطراف بسنے والے دریاؤں کا بھی مولد ہے۔ ان میں وسطی ایشیا کا مرکزی دریا آمو بھی شامل ہے۔ علاقے میں ندی نالے بھی کثرت سے ہیں۔ جب برف پگھلنے کا وقت آتا ہے تو ان میں طغیانی آجاتی ہے۔

واخان کے باسی مجلسی انسان نہیں۔ وہ کم ہی ہنستے ہیں۔ ان کے پاس کتابیں ہیں، نہ کیرم بورڈ، تاش اور لڈو کے کھیل۔ ان کا ناچ صرف رومال لہرا کر جھولے ہولے کمر لچکانے تک محدود ہے۔ کسی کو مصوری یا مجسمہ سازی سے دلچسپی نہیں۔ شادی میں بھی کوئی شور ہنگامہ نہیں ہوتا۔ صرف بُزکشی کا کھیل کھیلا جاتا ہے جو تیز رفتار اور متشدد ہے۔ یہ گھوڑوں پر بیٹھ کر کھیلا جاتا ہے جب کہ بغیر سر والی بھیڑ کی لاش گیند کی حیثیت رکھتی ہے۔

افغان کرغز آداب سے بھی ناآشنا اور خاصے بدتمیز ہیں۔ ان کے نزدیک دوران گفتگو اٹھ کر چلے جانا معمول کی بات ہے۔ ان کی ایک عجیب عادت یہ ہے کہ باتیں کرتے ہوئے مرد اچانک ایک دوسرے کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر کیا ہے۔ دوسرے کی چیز مثلاً عینک یا موبائل لے لینا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ دعوت میں حصے کا گوشت بچ جائے تو مہمان اسے جیب میں ڈال لیتا ہے۔

عجیب طرز زندگی

تاہم جب وہ سختیاں دیکھی جائیں جو واخان کے مکین برداشت کرتے ہیں تو ان کا مزاج سمجھ آتا ہے۔ اس علاقے کے متعلق خان کا کہنا ہے، ''یہاں انسان بہت جلد بوڑھا ہو جاتا ہے۔'' دراصل یہاں سردی بہت پڑتی ہے۔ پھر جب انسان بچوں کو مرتے دیکھے تو ویسے ہی اس کے جذبات مر جاتے ہیں۔ یہ بھی دیکھیے کہ علاقے میں تیز ہوا چلتی ہے اور یہاں زندگی گزارنا جان جوکھم کا کام ہے۔ یہ ماحول انسان کو قتل نہ کرے تب بھی اسے بہت زخمی کر دیتا ہے۔ تب ہی انسان اپنی خوشیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔

لیکن کرغز یورت میں داخل ہوتے ہی یک دم منظر بدل جاتا ہے۔ اب ایک کرغز طلسم سامنے آتا ہے۔ یورت میں قالین، کمبل گدے، دیواری چادریں غرض کپڑے نما ہر شے میں کاڑھے گئے رنگ برنگے بیل بوٹے، سلمٰی ستارے، ڈیزائن وغیرہ نظر آتے ہیں۔ یہ رنگین ماحول نئے آنے والے پر عجب اثر ڈالتا ہے۔

ایک خاندان اسی رنگ برنگے خیمے میں سوتا، جاگتا اور بہت سے کام کرتا ہے۔ یورت کے وسط میں عموماً آگ جلتی رہتی ہے۔ چونکہ واخان میں لکڑی نہیں ہوتی لہٰذا انگیٹھی میں مویشیوں خصوصاً یاک کا گوبر جلتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یاک کا گوبر جلے تو بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔ یوں یورت ہمہ وقت معطّر رہتا ہے۔

کرغز یاک کے دودھ سے بنا دہی بھی بصد شوق

واخان وادی کا ایک منظر

کھاتے ہیں۔ یہ خاصا گاڑھا اور مزے دار ہوتا ہے۔ اسی دودھ سے کورت (Kurut) نامی سخت پنیر بھی ملتی ہے۔ کرغز اسے منہ میں ڈال کر چوستے رہتے ہیں۔

کرغز خواتین بھی آرٹ کا چلتا پھرتا نمونہ ہوتی ہیں۔ وہ رنگ برنگا لباس زیب تن کرتی، لمبی چوٹیاں بناتی، سروں پر رنگین ٹوپیاں اور بدن پر مختلف زیورات پہنتی ہیں۔ غرض سرتا پا وہ آرٹ کا شاہکار دکھائی دیتی ہیں۔

مگر یہ عورتیں سخت جان اور جفاکش بھی ہیں۔ صبح سے شام تک سیکڑوں گھریلو امور انجام دیتی ہیں۔ مثلاً مویشیوں کا دودھ نکالنا، کپڑے سینا، کھانا پکانا، صفائی کرنا اور بچے پالنا۔ جب یورت میں مرد ہوں تو بہت کم بولتی ہیں۔ لڑکیوں کی شادیاں بہت جلد ہو جاتی ہیں۔ مثلاً خان اور اس کی بیگم پندرہ سال کے تھے کہ شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

تاریخ پہ ایک نظر

افغان کرغز بہت آزادی پسند اور غیور ہیں، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی پسند نہیں کیا کہ وہ کسی راجہ یا حکمران کی حاکمیت تسلیم کریں۔ ان کی اصل ماضی کے دھندلکوں میں پوشیدہ ہے۔ خیال ہے کہ ان کے آباؤاجداد سائبیریا اور منگولیا سے آئے۔ افغان کرغز کبھی بڑا قبیلہ نہیں رہا اور صدیوں وسطی ایشیا میں گھومتا پھرتا رہا۔ جب انھوں نے شاہراہ ریشم پر چلنے والے قافلوں پر چھاپے مارے تو ان کو شہرت ملی۔

1700ء تک افغان کرغز ان وادیوں میں مقیم ہو گئے جہاں آج آباد ہیں۔ تاہم وہ موسم سرما میں تاجکستان، پاکستان (ہندوستان) یا چین کے گرم علاقوں میں چلے جاتے۔ تب روس، برطانیہ کے مابین

غزل

نہ سیو ہونٹ، نہ خوابوں میں صدا دو ہم کو
مصلحت کا یہ تقاضہ ہے، بھلا دو ہم کو
جرم سقراط سے ہٹ کر نہ سزا دو ہم کو
زہر رکھا ہے تو یہ آب بقا دو ہم کو
بستیاں آگ میں بہہ جائیں کہ پتھر برسیں
ہم اگر سوئے ہوئے ہیں تو جگا دو ہم کو
ہم حقیقت ہیں تو تسلیم نہ کرنے کا سبب؟
ہاں اگر حرف غلط ہیں تو مٹا دو ہم کو
خضر مشہور ہو، الیاس بنے پھرتے ہو
کب سے ہم گم ہیں، ہمارا تو پتا دو ہم کو
زیست ہے اس سحر و شام سے بیزار و زبوں
لالہ و گل کی طرح رنگ قبا دو ہم کو
شورش عشق میں ہے حسن برابر کا شریک
سوچ کر جرم تمنا کی سزا دو ہم کو

(شاعر: احسان دانش انتخاب: محبوب اقبال لیہ)

گریٹ گیم شروع ہو گئی اور 1950ء تک واخان میں مقیم تمام کرغز افغان شہری بن گئے۔

1978ء میں کمیونسٹ اقتدار پر قابض ہوئے تو افغان کرغزوں کو تشویش ہوئی۔ وہ بڑے اسلام پسند تھے اور انھیں کمیونسٹ حکمران ایک آنکھ نہ بھائے۔ چناں چہ سبھی افغان کرغز اپنے سردار رحمان گل کے ساتھ براستہ ہندوکش پاکستان چلے آئے۔ تب ان کی تعداد 1300 تھی۔

1980ء تک بیماریوں نے ایک سو قبائلی مار ڈالے۔ اس دوران بہت سے افغان کرغز "دیس ہڑکا" (Homesickness) میں گرفتار ہو گئے۔ انھیں بام دنیا پہ واقع اپنا وطن شدت سے یاد آنے لگا۔ اب ان کی

100 پیالی چائے روزانہ

آبادی پر ہر وقت سماوار بھی نظر آتا ہے۔ اس میں ابلتی چائے فوراً تیار ملتی ہے۔ چائے افغان کرغزوں کا قومی مشروب ہے۔ 100 سے زائد چائے کی پیالیاں پینا معمول ہے۔

واحد تمنا یہی تھی کہ وہ واپس واخان چلے جائیں۔

رحمان گل نے انھیں روکنے کی بہت کوششیں کیں۔ یہ کہا کہ کمیونسٹ انھیں بھی کافر بنا لیں گے۔ لیکن تین سو افغان کرغز بغاوت کر کے اپنے دیس چلے گئے۔ ان کا سردار عبدالرشید خان تھا۔ تب اسے واخان آنے والے افغان کرغزوں کا خان چنا گیا۔

روسی فوج نے بہرحال ان کرغزوں سے کوئی تعرض نہ کیا اور انھیں ان کے حال پہ چھوڑ دیا۔ چناں چہ واخان کے کرغز پھلے پھولے۔ بلند شرح اموات کے باوجود ان کی آبادی ایک ہزار سے بڑھ گئی۔

اُدھر جو کرغز پاکستان میں رحمان گل کے ساتھ رہے، انھیں بالآخر ترک حکومت نے مشرقی ترکی میں پناہ دے دی۔ وہ اب اپنے مخصوص گاؤں میں رہتے ہیں۔ وہاں اینٹوں سے بنے گھروں میں زندگی کی ہر آسائش دستیاب ہے۔ بجلی، ٹرانسپورٹ، پختہ سڑکیں، پانی، ہسپتال، اسکول اور سب کچھ۔ وہ قبائلی اب تقریباً شہری بن چکے۔

حاجی روشن خان جب کابل گیا تو اس کا اپنڈکس پھول گیا۔ بعدازاں اسے آپریشن کے ذریعے نکال دیا گیا۔ یہ معمولی آپریشن تھا مگر اس نے روشن خان کو ہلا ڈالا۔ وہ کہتا ہے، "اگر وادی میں یہ عارضہ مجھ پر حملہ کرتا تو یقیناً میں مر جاتا۔ وہاں ایسے ہی معمولی امراض سے لوگ چل بستے ہیں۔"

گرم چائے حلق میں اتارتے ہوئے خان ہی نہیں شاید واخان کا ہر باسی یہ سوچتا ہے، "بہتر نہیں یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور ٹھکانہ بنایا جائے؟" درست کہ واخان میں لڑائی کا کوئی وجود نہیں جب کہ بقیہ افغانستان جنگوں کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ مگر اس علاقے میں رہنا بھی مسلسل بقا کی جنگ لڑنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی کرغز مل بیٹھیں تو اکثر نئی جگہ جانے پر تبادلہ خیال ہوتا ہے۔ کچھ باشندے کرغزستان جانا چاہتے ہیں۔ وہاں زبان ایک ہو گئی اور پھر کئی رسوم و رواج بھی مشترک ہیں۔ تاہم یہ خیال ابھی عملی جامہ نہیں پہن سکا۔

خان کی فی الحال یہی کوشش ہے کہ واخان میں اس کے علاقے تک سڑک آ پہنچے۔ لیکن کرغز بزرگوں کے نزدیک یہ ناممکنات میں سے ہے۔ دراصل افغان حکومت غریب ہی نہیں وہاں کرپشن کا بھی دور دورہ ہے۔ چناں چہ اس کے پاس کروڑوں روپے کہاں ہیں کہ وہ صرف کرغزوں کی خاطر واخان میں سیکڑوں میل لمبی سڑک تعمیر کرے؟

کرغز بزرگوں کو یہ بھی خطرہ ہے کہ سڑک بنی تو علاقے کا فطری حسن اور پُرامن ماحول جاتا رہے گا۔ پھر نئی نسل کچھ آسائشات کی عادی ہوئی تو وہ واخان سے نکلنے کی کوشش کرے گی تا کہ مزید آسائشیں حاصل کر سکے۔ چناں چہ یہ حقیقت ہے کہ سڑک معرض وجود میں آنے سے خان کا سپنا تو پورا ہو جائے گا۔ لیکن علاقے کے باسیوں کا جو رہن سہن تقریباً دو ہزار برس سے چلا آ رہا ہے، وہ بھی باقی نہیں رہے گا۔

■■■

توہمات کا شکار بیچارا انسان؟

ہزاروں برس کی تاریخ میں پوشیدہ جواب!

ایسی سچائی جسے جانتے ہوئے بھی یقین نہیں ہوتا

عبیداللہ بیگ

یوہان کرائیف ہالینڈ کا مشہور فٹ بالر رہا ہے۔ یہ 1984ء میں ریٹائرڈ ہوا۔ 1999ء میں انٹرنیشنل فیڈریشن آف فٹ بال نے اسے بیسویں صدی کا بہترین یورپی فٹ بالر قرار دیا۔ جب کہ عالمی سطح پر وہ پہلے کے بعد دوسرے نمبر پہ آیا۔ اس کرائیف کی عادت تھی کہ ہر میچ شروع ہونے سے قبل وہ اپنے گول کیپر کے شکم پر طمانچہ رسید کرتا۔ دراصل کرائیف اس توہم کا شکار تھا کہ یوں ہالینڈیزی ٹیم میچ جیت جائے گی۔

یہ معاملہ صرف یوہان کرائیف کو درپیش نہیں تھا، اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے لوگ بھی کسی نہ کسی توہم میں پائے گئے ہیں۔ مثلاً ٹینس کی مشہور امریکی کھلاڑی سیرینا ولیمز پہلی سرونگ کے وقت پانچ بار زمین پر گیند مارتی ہے۔ اسے یقین ہے کہ یوں خوش قسمتی کی دیوی اس پر مہربان ہو جاتی ہے۔

اسی طرح برطانوی گلوکارہ، جنیفر اینسٹون کی عادت ہے کہ وہ ہوائی جہاز سے اترتے وقت ہمیشہ سیدھا پاؤں زمین پر رکھتی ہے۔ وجہ وہی ضعیف الاعتقادی کہ یوں وہ آفتوں سے محفوظ رہے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی خاص درخت کو چھونے سے لے کر سیڑھی کے گرد گھومنے تک تقریباً ہر فرد کوئی نہ کوئی توہم پرستانہ عادت ضرور رکھتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ یہ عادت خوش بختی لائے اور بدبختی بھگائے گی۔

دلچسپ بات یہ کہ بیش تر عادات عجیب بلکہ مضحکہ خیز ہوتی ہیں۔ پھر ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ ایسی ہی خوشی و مسرت کا سامان مہیا کریں۔ یہی نہیں، بعض اوقات عادت خواہ مخواہ اپنا لی جاتی ہے۔ مثلاً رضوان کی عادت ہے کہ جب کیتلی میں پانی ابلنے لگے، تبھی وہ چائے بناتا ہے۔ حالانکہ گرما گرم پانی پیالی میں ڈالنے سے بھی چائے بن جاتی ہے۔

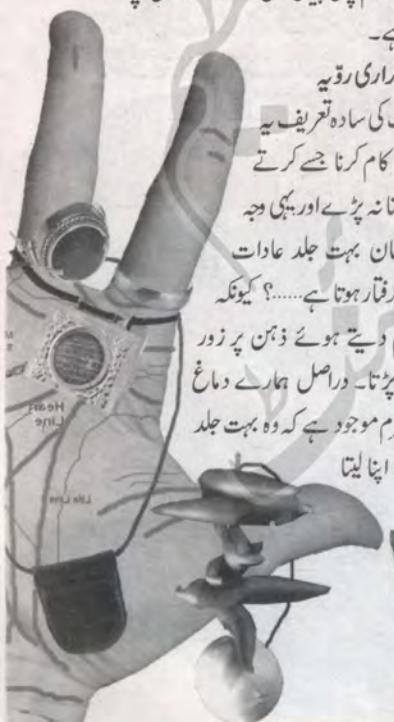

تکراری رویہ

عادت کی سادہ تعریف یہ ہے کہ ایسا کام کرنا جسے کرتے ہوئے سوچنا نہ پڑے اور یہی وجہ ہے کہ انسان بہت جلد عادات میں کیوں گرفتار ہوتا ہے.....؟ کیونکہ اسے انجام دیتے ہوئے ذہن پر زور نہیں دینا پڑتا۔ دراصل ہمارے دماغ میں یہ میکنزم موجود ہے کہ وہ بہت جلد نئی عادات اپنا لیتا

ہے۔ لہٰذا رفتہ رفتہ عادت کو انجام دینا معمول بن جاتا ہے۔ مگر یہ میکنزم صرف انسانوں تک محدود نہیں، اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو بھی ودیعت فرمایا ہے۔

مثال کے طور پر کبوتر بھی توہم پرستانہ عادتیں اپناتے ہیں۔ اس کا ثبوت مشہور امریکی ماہر نفسیات بی ایف سکسر کے ایک تجربے سے ملا۔ بی ایف سکسر لیکچر کا آغاز کرتے ہوئے حاضرین کو ایک پنجرہ دکھاتا۔ اس میں ایک خودکار (آٹومیٹک) فیڈر نصب تھا جو ہر 15 سیکنڈ بعد دانہ کبوتروں کے سامنے کر دیتا۔

بی ایف سکسر پھر پنجرے میں پانچ، چھ بھوکے کبوتر بند کر دیتا۔ وہ معمول کے مطابق پنجرے میں اِدھر اُدھر پھرتے اور دانہ کھانے لگتے۔ چند منٹ بعد پنجرہ حاضرین کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا جاتا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد پنجرہ پھر حاضرین کے سامنے آتا۔ تب حاضرین پہ انکشاف ہوتا کہ مختلف کبوتروں میں مختلف عادات جنم لے چکی۔

مثال کے طور پر ایک کبوتر تین بار چکر پھیری کھا کر فیڈر کی طرف متوجہ ہوتا۔ دوسرا چند لمحوں کے لیے اپنا سر پنجرے کے دائیں کونے میں چھپا دیتا۔ تیسرا فیڈر کی طرف بڑھنے سے قبل پَر ضرور پھیلاتا۔ غرض ایک گھنٹے ہی میں تقریباً تمام کبوتروں نے ایسی خاص عادات اپنا لیں جنھیں وہ بار بار انجام دیتے۔

بی ایف سکسر کی تشریح کے مطابق یہ عجیب رویہ جنم لینے کی وجہ اختراعی ہونے کے ساتھ ساتھ سادہ بھی ہے۔ دراصل ہم تو جانتے ہیں کہ ہر 15 سیکنڈ بعد کبوتر کو کھانا ملے گا، چاہے وہ کیسا ہی انوکھا طرز عمل دکھائیں۔ لیکن کبوتر اس حقیقت سے آگاہی نہیں رکھتے۔

کچھ دیر کے لیے آپ خود کو ایک کبوتر سمجھیے۔ آپ انسانوں کی دنیا کے متعلق بہت کم معلومات رکھتے ہیں۔ اسی طرح آپ پنجرے یا خودکار غذائی فیڈر سے بھی ناواقف ہیں۔ جب فیڈر میں دانہ ختم ہوتا تو آپ اِدھر اُدھر گھومنے لگتے۔ پھر آپ نے طے کیا کہ تین بار چکر پھیری کھا کر فیڈر کو دیکھیں گے۔ اتفاقاً تیسرے پھیرے پر خوراک پھر نمودار ہوگئی، دوسری اور تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا۔ ظاہر ہے، پھر آپ کا یہی عمل آپ کی عادت بن جائے گا۔

عادت کی تشکیل

عادت کی ہیئت سمجھنے کے لیے کیمبرج یونیورسٹی کے نفسیات دان ٹونی ڈکنسن نے ایک نادر تجربہ کیا۔ اس نے پنجرے میں قید چوہوں کو سکھایا کہ جب ایک لیور یا کھٹکا دبایا جائے تو فیڈر سے خوراک نکل کر سامنے آجاتی ہے۔ ایک ڈیڑھ ہفتے میں چوہے لیور دبا کر فیڈر سے غذا نکالنا سیکھ گئے۔

پھر ایک عجیب بات رونما ہوئی۔ جب فیڈر خالی ہوتا اور لیور دبانے سے غذا نہ نکلتی تو تب بھی چوہے اسے دباتے رہتے۔ گویا لیور دبانا ان کی عادت بن گئی، حالانکہ اب انھیں کھانا نہیں ملتا تھا۔ لیکن شاید امکان یا موقع موجود تھا۔ لہٰذا ناکامی کے باوجود وہ لیور دباتے رہتے۔

یہی امر انسانوں کے ساتھ بھی پیش آتا ہے۔ کئی عمل عقل کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے، لیکن انسان انھیں اس اُمید پہ دہراتے ہیں کہ شاید کامیابی مل جائے۔ یہی عمل پھر رفتہ رفتہ عادت میں اور آخر توہم پرستی میں ڈھل جاتے ہیں۔ گویا یہ عمل ارتقا کے باعث ہمارے ڈی این اے میں راسخ ہو چکے اور لیے ہماری جان نہیں چھوڑتے۔

اس وقت جب آپ یہ تحریر پڑھ رہے ہیں ایک جفاکش جان مسافر ہمارے سورج کی سلطنت پار کر چکا ہے۔ یہ مسافر پینتیس سال قبل ہماری نیلی زمین سے ہی روانہ ہوا تھا۔ اور اس کھوجی کے سفر کا مقصد قدرت کے کئی سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانا تھا۔ یہ مسافر ساٹھ ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی تیز پرواز کرتا ہوا سورج کے گرد گھومنے والے تمام سیاروں اور سیارچوں سے آگے جا چکا ہے۔ میں آپ کو اسی ان تھک مسافر کی کہانی سنانے والا ہوں۔

چاند سے آگے کے جہاں

یہ بات ہے انیس سو ساٹھ کی دہائی کے آغاز کی۔ یہ ایسا دور تھا جب سائنس کی دنیا میں خلائی تحقیق کے آغاز کو صرف پندرہ برس ہوئے تھے۔ انسان ایک بار چاند پر قدم رکھنے کے لیے بے چین تھا۔ دنیا بھر کی کئی خلائی تحقیق کی لیبارٹریاں دن رات ایسے مشن لانچ کرنے کی منصوبہ بندیاں کرتی تھیں جن کی مدد سے کسی طور چاند پر دوسروں سے پہلے پہنچا جا سکے یا کوئی ایسی مشین ہی تیار کی جائے جو چاند پر جائے اور پل پل کی خبریں کرہ ارض کی اس لیبارٹری میں بھیج سکے۔ ایسے میں کون سوچ سکتا تھا کہ دو سَر پھرے ریاضی دان ایک ایسی مشین بنانے کا سوچ رہے ہیں جو خلا سے آگے، چاند سے پار، سورج کے سنہرے تھال سے بھی پرے چلی جائے گی۔

ان تھک مسافر

ایک سائنسی کھوجی کی حیرت انگیز کہانی
اسے کسی اپنے جیسے وجود کی تلاش تھی

فیصل صدیق وڑائچ

دیوانوں نے سوچا اور کر دکھایا

مائیکل منووچ اور گیری فلنڈرو، دو امریکی ریاضی دان تھے جو امریکی خلائی تحقیق کے سب سے معتبر ادارے ناسا میں خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ کسی بھی خلائی مشین کو خلا میں بھیجنے کے لیے بہت زیادہ ایندھن

(پٹرول، گیس وغیرہ) کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس مشین کا وزن اور حجم بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ خرچ بھی ڈھیر سارا اٹھتا ہے۔ اسی لیے یہ دونوں سائنسدان ایک ایسی مشین کی تیاری کے لیے سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے جسے کم سے کم ایندھن کے ساتھ خلا میں پہنچایا جا سکے تا کہ خرچ بھی کم اٹھے اور مشین کی جسامت بھی زیادہ نہ ہو۔ گیری فلنڈرو نے اس دوران خلائی تحقیق کی سب سے بڑی دریافتوں میں سے ایک دریافت کر ڈالی۔ اور وہ یہ کہ اگر سیاروں کی کشش ثقل کو استعمال کیا جائے تو ہم خلائی گاڑیوں کو زمین کے مدار سے نکالنے کے بعد بغیر کسی ایندھن کے بھی لامحدود فاصلوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ ایسے میں یہ دریافت بھی سامنے آئی کہ اگر ایک دہائی بعد یعنی انیس سو چھہتر اور انیس سو نواسی کے درمیان اگر کسی خلائی گاڑی کو مخصوص طریقے سے خلا کی مخصوص سمت میں پرواز کرنے دیا جائے تو وہ بغیر کسی زمینی ایندھن کے مریخ، مشتری، زحل، نیپچون اور پلوٹو تک جا کر بآسانی تحقیقات کر سکتی ہے۔ مطلب یہ کہ سب سیاروں کے قریب سے گزر کر تصاویر اور دوسرے سگنلز ناسا لیبارٹری میں بلا رکاوٹ بھیج سکتی ہے۔ یہ ایک غیر معمولی دریافت تھی۔ لیکن اس میں ایک پیچیدگی بھی تھی۔ وہ یہ کہ ایسا صرف انہی تین سالوں کے دوران کیا جا سکتا تھا۔ یعنی انیس سو چھہتر سے انیس سو نواسی کے درمیان۔ کیونکہ انہی تین سالوں میں نظام شمسی کے بڑے سیارے ایک ایسی ترتیب میں مل سکتے تھے کہ اس ترتیب کو خلائی گاڑی سیڑھی کے طور پر استعمال کر کے تمام سیاروں کے گرد گھومتی ہوئی آگے بڑھ سکے۔ اگر یہ وقت ضائع کر دیا جاتا تو کائنات میں دوبارہ ایسا موقع ایک سو چھہتر سال بعد ملنا تھا۔ چنانچہ کام کا آغاز اس طرح ہوا کہ ایک نہیں بلکہ اس مخصوص اور محدود وقت میں چار تحقیقاتی خلائی مشن بھیجنے کا منصوبہ ترتیب دیا گیا۔ جو تمام سیاروں کے گرد گھوم کر مکمل معلومات زمین پر بھیجیں گے۔ لیکن اس مشن کے لیے جتنی رقم چاہیے تھی وہ امریکی کانگریس نے دینے سے انکار کر دیا۔

کیونکہ امریکا کو روس سے مقابلے کے لیے بہت سے جنگی ہتھیار چاہیئے تھے اور اس کے بجٹ میں خلائی تحقیق کے لیے زیادہ رقم نہیں تھی۔ لیکن ناسا نے تھک محنت کے بعد کانگریس سے چار کے بجائے دو خلائی مشن بھیجنے کا بجٹ منظور کروا ہی لیا۔ ان منصوبوں کو وائجر ون اور وائجر ٹو کا نام دیا گیا۔ وائجر ون کو خاص طور پر مشتری اور زحل کی تحقیق کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اور اس نے خلا میں سفر کرتے ہوئے زیادہ وقت ان سیاروں کے گرد گھومنا تھا۔ لیکن جب اسے ان سیاروں تک پہنچانے کے لیے راستوں کا تعین ہونے لگا تو پتا چلا کہ اسے دس ہزار مختلف راستوں اور مختلف سمتوں سے بھیجا جا سکتا ہے۔ اس لیے جلد ہی وائجر ٹو کی تیاری بھی شروع کر دی گئی۔ مشتری اور زحل پر زیادہ تحقیق کرنے کے بجائے تمام کے قریب سے گزرتا ہوا آگے نکل جائے اور اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کی معلومات زمین پر ناسا ہیڈکوارٹر بھیجے گا۔ آج ہم نظام شمسی کے تمام سیاروں اور لاتعداد چاندوں کے بارے میں جو کچھ بھی جانتے ہیں اس کا بہت بڑا حصہ انہی دو مسافروں (وائجر ون اور ٹو) کی وجہ سے ہے۔

کائنات میں کوئی ہم جیسا ہے؟

شاید ہم کائنات میں تنہا نہ ہوں۔ کائنات میں شاید کوئی ہم جیسی ذہین مخلوق ہو۔ اسی خیال کی بدولت ان مسافروں کو ایسا سامان مہیا کیا گیا ہے کہ اگر ان کے راستے میں کوئی ایسی جگہ آئے جہاں کوئی ہم جیسی یا ہم سے زیادہ ذہین مخلوق بستی ہو تو وہ ہم سے رابطہ قائم کرے۔ وائجر ون اور ٹو دونوں میں اسی مقصد کے لیے ایک ایک گولڈ پلیٹ لگائی گئی جس پر ہماری نیلی زمین 'دنیا' کے بارے میں اہم معلومات اشاروں میں درج ہیں۔ یہ سونے کی ایک گول پلیٹ ہے جس کے کور پر کچھ اشارے اور کور کے اندر ایک گول ڈسک ہے۔ جس پر آڈیو اور ویڈیو کی صورت میں

گولڈ پلیٹ

بہت کچھ محفوظ کر دیا گیا ہے۔ گولڈ پلیٹ کی بیرونی پرت پر اشاروں کے علاوہ ایک دو سطری پیغام بھی درج ہے۔ تا کہ اگر کبھی یہ مسافر کسی ذہین خلائی مخلوق تک پہنچ جائیں یا وہ اسے پکڑ لیں اور پڑھ سکیں تو پڑھ لیں۔ اس پر لکھا ہے۔۔

''یہ دور بسنے والی ایک چھوٹی سی دنیا کی طرف سے تحفہ ہے۔ یہ ایک حوالہ ہے ہماری موسیقی، ہمارے احساسات، ہماری سائنس، ہماری زندگیوں اور ہماری آوازوں کا۔ ہم اپنے حصے کی زندگی جی رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ بھی جئیں۔''

وائجر ون اور ٹو میں ایک طویل صوتی پیغام بھی محفوظ ہے۔ جو ہر وقت بجتا رہتا ہے۔ اس میں دنیا کی باون زبانوں میں خوش آمدید کہا گیا ہے۔ اور یہ پیغام ہر وقت خلا میں نشر ہوتا رہتا ہے۔ ان باون زبانوں میں اردو، عربی اور پنجابی بھی شامل ہیں۔ یعنی آپ فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت زمین سے اربوں میل دور کوئی ہے جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

''السّلام علیکم، ہم زمین پر رہنے والوں کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔''

یہ سو فیصد وہی فقرہ ہے جو مشین میں ریکارڈ کیا گیا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ یہ بھی پتا چلا لوں کہ یہ آواز کس کی تھی لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ اس کے علاوہ اس میں دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں ننانوے منٹ کی موسیقی بھی ریکارڈ کر کے چلا دی گئی ہے۔ اس موسیقی میں راگ بھیرویں میں 'جات کہاں ہو' بھی ایک ہے۔ صوتی ریکارڈنگ میں زمین پر پائے جانے والے چیدہ چیدہ جانوروں کی آوازیں بھی رکھی گئی ہیں۔ ان میں ایک آواز وہیل مچھلی کی بھی ہے۔

دنیا چھوڑی اور مسافر چل پڑے

اگست اور ستمبر 1977ء میں دونوں خلائی کھوجیوں کو امریکی ریاست فلوریڈا سے ایک ایک کر کے ہمیشہ کے لیے الوداع کر دیا گیا۔ کیونکہ اب انھیں کبھی زمین پر واپس نہیں آنا تھا۔ تین ماہ میں دونوں مسافر مریخ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے نکل گئے۔ وائجر ٹو کا مقصد زمین کے بعد آنے والے چار سیاروں

،مشتری، زحل، یورنیس اور نیپچون کے پاس سے گزرنا اوران کی عمومی تحقیقی تصاویر اتارتے ہوئے آگے بڑھ جانا تھا۔ جبکہ وائجر ون کا مقصد خاص طور پر مشتری اور زحل کے گرد زیادہ دیر رُکنا اور تحقیقات کرنا تھا۔ لیکن دونوں کو بہرحال تمام سیاروں کے قریب سے گزرتے ہوئے جانا تھا۔ جس دوران تصاویر بھی لینا تھا۔

برف کا چاند

وائجر ون کو مشتری تک پہنچنے میں صرف دو سال لگے۔ دو سال میں وہ نظام شمسی کے سب سے بڑے سیارے تک پہنچ گیا۔ اس کے ذمے پہلا کام مشتری کے چاندوں پر تحقیق کرنا، ان کی تصاویر بنانا اور وہاں موجود دھاتوں کا پتا لگانا تھا۔ اور اس سب کے لیے اس کے پاس صرف اڑتالیس گھنٹے تھے۔ مشتری کے گرد چار بڑے چاند ہیں۔ جن میں 'لوو' سب سے مشہور اور توجہ حاصل کرتا تھا۔ قدیم زمانے میں جب آسمان پر گرد کی موٹی تہہ اور رات کو مصنوعی روشنیاں نہیں جلتی تھیں تو تقریباً ہر انسان اس کا مشاہدہ کر لیا کرتا تھا۔ جس کی ایک وجہ اس کی چمک بھی تھی۔ وائجر ون نے پہلی بار ہمیں یہ معلومات بھیجیں کہ 'لوو' پر سلفر کے آتش فشاں ہیں۔ سلفر انتہائی آتش گیر اور چمک دار مادہ ہے۔ جو جلنے پر نیلی آگ پیدا کرتا ہے۔ جو بہت تباہی لاتی ہے۔ کیونکہ اسے پانی ڈال کر بجھانا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ سلفر دواؤں اور سائنسی تجربات میں بھی بہت استعمال ہوتا ہے۔ تو جناب وائجر ون نے ہمیں بتایا کہ 'لوو' پر سلفر کے آتش فشاں ہیں جو ہمہ وقت سلفر اگلتے رہتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی دریافت تھی کیونکہ اب تک انسان یہی سمجھتا تھا کہ آتش فشاں پہاڑ صرف زمین پر ہی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس دریافت نے خیالات تبدیل کر
اس کے علاوہ اسی برس وائجر ون نے ایک اور
شاندار دریافت کی۔ جس کے بارے میں انسا
پہلے رتی بھر بھی نہیں جانتی تھی۔ اور یہ دریافت
مشتری کے ایک اور بہت بڑے چاند 'یوروپا'
یوروپا کے بارے میں ہم بالکل نہیں جانتے تھے کہ
یوروپا 'لوو' کی چمک کے پیچھے چھپ جاتا تھا اور
ماہرینِ فلکیات سے لے کر جدید تک اس کی موجو
سے ہی لاعلم تھے۔ لیکن صرف یہی حیرت کی بات
تھی کہ 'لوو' کے قریب ایک اور اس جتنا بڑا جسم مو
ہے بلکہ حیرت کی بات تو ایک اور تھی جس نے خ
تحقیقات کرنے والوں کو ششدر کر کے رکھ دیا۔
وہ یہ کہ سلفر کے آتش فشاں کے پیچھے چھپا یو
بالکل قطب شمالی جیسا ہے۔ اس کی سطح پر میلوں
برف کی تہہ ہے۔ جس کے نیچے یقیناً پانی کا سمند
چاہیے۔ اگر ایسا ہے پانی میں کسی نہ کسی شکل
زندگی بھی ہونی چاہیے۔ اگر یہ اندازہ بھی درست
تو یقین کیجیے ہم کائنات میں زمین کے علاوہ کسی
جگہ پر زندگی کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔
برف کی اس میلوں موٹی تہہ کے نیچے کیسے
جائے۔ ناسا سمیت دنیا بھر کے خلائی تحقیق
ادارے ایٹمی دھماکوں سمیت کئی منصوبوں پر
کر رہے ہیں۔ لیکن بجٹ سب سے بڑی رکاوٹ
کر راستے میں آن کھڑا ہوتا ہے۔ امید ہے
آپس کی نفرتوں اور ہتھیاروں کی تیاری سے
ملے گی تو وہ بجٹ کا بڑا حصہ خلائی تحقیق اور
ضروریات جیسی اہم ترین چیزوں کے لیے
گے۔

مسافر بیمار ہوگیا

اگست انیس سو اکیاسی میں وائجر ٹو ایک مشکل میں پھنس گیا۔ وائجر ٹو پر ایک کیمرہ نصب تھا جسے زمین سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ اور جس طرف چاہے اس کا رخ موڑ کر تصاویر بنائی جاتی تھیں۔ لیکن بہت زیادہ استعمال کی وجہ سے کیمرے کے گیئر باکس کا تیل ختم ہوگیا۔ جس کی وجہ سے کیمرے کو بآسانی اِدھر اُدھر موڑنا ناممکن ہوگیا۔ اب اگر اسے ٹھیک نہ کیا جاتا تو وائجر ٹو کو خلا میں بھیجنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا کیونکہ اس کے کاموں میں سے اہم ترین کام نظام شمسی کے سیاروں، چاندوں، سیارچوں اور دوسرے لاتعداد خلائی اجسام کی تصاویر زمین پر بھیجنا ہی تو تھا۔ چنانچہ سارے منصوبے کو بچانے کے لیے سائنسدانوں کی ایک ٹیم دن رات کام میں جُت گئی۔ کیمرے کے ہینڈل کو ٹھیک کرنے کے لیے پچاسی مختلف طریقے آزمائے گئے۔ سب ناکام رہے۔ لیکن ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ چھیاسیواں طریقہ کام کر گیا اور ہینڈل اس حد تک ٹھیک ہوگیا کہ اس سے مرضی کا کام لیا جا سکے۔ لیکن اس وقت تک وائجر ٹو زحل سیارے کو پیچھے چھوڑتا ہوا یورنیس اور نیپچون کے قریب پہنچ چکا تھا۔

چاند پر برف کی دیواریں

وائجر ٹو نے ٹھیک ہونے کے بعد پھر سے کام شروع کر دیا اور یورنیس سیارے کے گرد گھومنے والے دس چاند دریافت کیے۔ جن میں سے ایک چاند 'میرانڈا' ایسا بھی تھا جس پر برف کی بارہ میل اونچی دیوار دریافت ہوئی۔ وائجر نے انیس سو چھیاسی میں اس دیوار کی تصویریں زمین پر بھیجیں تو سائنس کے حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ لیکن یہ کھلبلی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ کیونکہ انہی دنوں انسانیت کو ایک بڑا صدمہ سہنا پڑا۔ جب خلائی تحقیق کے لیے جانے والے ایک خلائی جہاز 'چیلنجر' کو خوفناک حادثہ پیش آیا۔ حادثے میں نا صرف جہاز تباہ ہوگیا بلکہ اس میں سوار سات خلاباز جل کر دھواں بن گئے۔ اور خلا میں تحلیل ہو گئے۔ ان خلابازوں میں دو خواتین بھی شامل تھیں۔

خدا حافظ سیارو

وائجر ٹو نے انیس سو نواسی میں ہمارے نظام شمسی کے آخری سیارے نیپچون کی تصاویر بھیجیں تو پہلی نظر میں ہر کوئی اچھل پڑا۔ کیونکہ تصاویر کے مطابق نیپچون پر سفید بادل تیر رہے تھے اور سیارے کی سطح نیلے سمندروں سے نیلگوں ہو رہی تھی۔ بہت سے لوگ سمجھے کہ ایک اور زمین دریافت ہوگئی۔ لیکن وائجر ٹو نے جب ڈھیر ساری مزید تصاویر بھیجیں اور اپنے سائنسی آلات سے جائزہ لے کر رپورٹس ناسا ہیڈکوارٹر بھیجیں تو راز کھلا۔ دراصل نیپچون پر سفید بادل

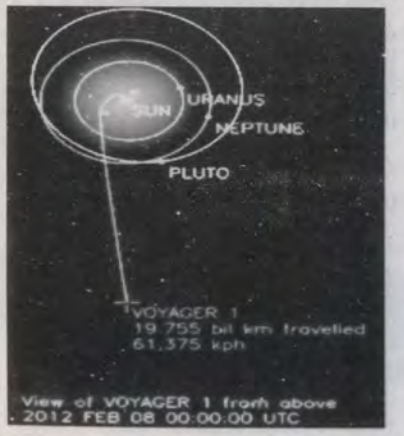

تو ہیں لیکن یہ زمین جیسے بادل نہیں ہیں۔ بلکہ یہ میتھین گیس کے منجمد بادل ہیں جو سیارے کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ سیارے کی سطح کا نیلا رنگ نیلے سمندروں کی وجہ سے تو ہے لیکن یہ پانی کے سمندر نہیں بلکہ میتھین گیس کے سمندر ہیں۔ ہمارے مسافر کی ارسال کردہ یہ تصاویر نظام شمسی کو ایک قسم کا خدا حافظ تھا۔ وہ اس لیے کہ اس کے بعد کوئی سیارہ اس کا منتظر نہیں تھا۔ اب اسے کسی سیارے کی تصاویر نہیں بھیجنی تھیں اور اس کے رستے میں ہمارے نظام شمسی کے کسی سیارے کو کبھی نہیں آنا تھا۔ مسافر کو ایک نہ ختم ہونے والے خلا کی جانب بڑھ جانا تھا۔ جہاں اس کا ساتھی وائجر ون پہلے سے محو پرواز ہے۔ ہم کیا ہیں؟ فقط ایک روشنی کی لہر میں اٹکے ہوئے ذرے!

وائجر ون نے انیس سو نوے میں ایک ایسی تصویر بھیجی جو رہتی دنیا تک ہمیں ہماری اوقات یاد دلاتی رہے گی۔ جب ہمارا یہ دوست زمین سے ساڑھے سات ارب میل دور تھا تو اس نے ایک بار پلٹ کر زمین کی جانب دیکھا اور اپنے کیمرے سے ایک تصویر بنائی۔ کیونکہ اس مسافر کو اب کبھی زمین پر لوٹ کر پھر نہیں آنا۔ اور مزید آگے جانے پر وہ زمین کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ تصویر جب واپس زمین پر پہنچی تو اسے انسانی تاریخ کی سب سے شاندار یادگار تصویر کہا گیا۔ تصویر میں زمین ایک بہت ہی مدھم سا نیلگوں ذرہ محسوس ہوتی ہے۔ جیسا کہ کبھی کسی درز سے دھوپ چھن کر اندر آرہی ہو تو اس میں کئی ذرات نظر آتے ہیں۔ لیکن اس تصویر میں صرف ایک ذرہ تھا۔ نیلا سا، مدھم سا، معمولی سا۔ اس تصویر پر اس دور کے ایک عظیم فلاسفر اور سائنسی مصنف کارل سیگن نے ایک شاندار کتاب بھی لکھی تھی۔ جس کا ایک ہ انسانیت کی پوری تصویر کشی کر دیتا ہے۔

سورج کی سلطنت کا کنارا آ گیا

وائجر ون اور ٹو اس وقت سورج کی سلطنت کو کرنے والے ہیں۔ خاص طور پر وائجر ون تو کائن میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے جس سے آ ہمارے نظام شمسی کا مقناطیسی میدان ختم ہو جاتا ہے اس لیے اسے خلا سے آنے والی خطرناک شعاعوں کا دوسرے خطرات کا سامنا ہے۔ لیکن ہمارے دو مسافر ہمیں اب بھی خلا سے ملنے والی ہر معلومات بذر سگنلز اور تصاویر زمین پر بھیجتے رہیں گے۔ اور کائن کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی گستاخانہ کوش کرتے رہیں گے۔

مسافر اتنا بھی تنہا نہیں

وائجر ون گو کہ سورج کی حدوں سے نکلنے پہلا مشن ہوگا۔ چار مشن اور بھی ہیں جو اسی کی طر کریں گے۔ جن میں سے ایک وائجر ٹو ہے جس کچھ کہانی آپ پڑھ چکے۔ جبکہ پائنیئر دس اور گیا ان دونوں سے پانچ سال قبل زمین سے چلے تھے لیکن ذرا سست رفتار ہونے کی وجہ سے پیچھے دو ہزار چھ میں نظام شمسی کے آخری قابل ذکر پلوٹو، جسے کبھی سیارہ سمجھا جاتا تھا کی تحقیق خاص طور پر ایک مشن روانہ کیا گیا۔ اس مشن ہورائزن' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ مشن بھی پلوٹو مکمل کرنے کے بعد وائجر ون اور ٹو کے پیچھے سورج کی سلطنت سے نکل کر کسی اور ستارے کی میں داخل ہو جائے گا۔ اور ہمیں کائنات کے رازوں سے آشنا کرے گا۔

رومن کیتھولک چرچ کی دو ہزار سالہ تاریخ کا انوکھا واقعہ

مجرمانہ اخلاقی اور مالی بے ضابطگیوں کے الزامات کے بعد پوپ بینیڈکٹ کا استعفیٰ

پاپائے روم کا قبل از وقت انتخاب

پروفیسر محمد فاروق قریشی

پاپائے روم جان پال II جن کو پوپ بینیڈکٹ XVI کا خطاب دیا گیا تھا، نے رومن کیتھولک چرچ کی انتظامیہ اور اس کی پالیسیوں پر اخلاقی اور مالی بدعنوانیوں کے الزامات کی بوچھاڑ کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے اپنے عہدے سے 28 فروری 2013ء کو استعفیٰ دے دیا۔ کسی رومن کیتھولک پوپ کا استعفیٰ چرچ کی دو ہزار سالہ تاریخ میں پہلا واقعہ ہے۔ کیونکہ نئے پوپ کا انتخاب ہمیشہ اس کے پیشرو کے انتقال کے بعد ہی ہوتا آیا ہے۔

سابق پوپ نے اپنے آخری بیان میں کہا کہ وہ خدا کے حکم پر اپنا عہدہ چھوڑ رہے ہیں تا کہ باقی عمر اس کی عبادت اور خدمت میں صرف کر سکیں۔ سابق پوپ کے اس بیان سے قطع نظر کڑوی حقیقت یہی ہے کہ پوپ اور اس کے قریبی ساتھیوں پر مجرمانہ اخلاقی اور مالی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے سنگین الزامات لگائے گئے تھے۔ جس کے نتیجے میں پوپ نے ان معاملات کی باقاعدہ چھان بین کرائی اور تین سو صفحات کی تحقیقی رپورٹ سامنے آئی۔ چونکہ اس رپورٹ میں ناقابل تردید روح فرسا حقائق منظر عام پر آئے اور چرچ کے سربراہ کے طور پر ان کے پاس بری الذمہ ہونے کے لیے کوئی معقول عذر موجود نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے رومن چرچ کی سربراہی سے استعفیٰ دینے میں ہی خیریت سمجھی اور چرچ کی گندگی کو صاف کرنے کی ذمہ داری نئے پوپ پر ڈال دی۔

ویٹی کن کے رہائشی علاقے میں ہم جنس پرستوں کا کلب

آئیے دیکھتے ہیں کہ رومن کیتھولک چرچ کے خلاف الزامات کیا تھے۔ سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ ویٹی کن کے اندر ہم جنس پرستوں کا ایک گروہ موجود ہے۔ ویٹی کن اٹلی کے دارالحکومت روم میں وہ چھوٹی سی ریاست ہے جس میں چرچ کے سینیئر اور ممتاز آرچ بشپ اور کارڈینل رہتے ہیں۔ پوپ اس منی اسٹیٹ کا سربراہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیرونی ممالک کے دوروں میں پوپ کو سربراہ مملکت کا پروٹوکول دیا جاتا ہے۔ اس الزام کو مزید تقویت اس انکشاف سے ملی کہ چرچ انتظامیہ نے تیئس ملین ڈالرز کا زرکثیر خرچ کر کے روم میں رہائشی اپارٹمنٹس کا ایک پورا بلاک خریدا ہے جس کے اندر بڑی تعداد میں پرتعیش اپارٹمنٹس ہیں۔ یہاں بڑے بڑے کارڈینل رہائش پذیر ہیں جو مرتبے میں پوپ سے صرف ایک درجہ کم ہوتے ہیں اور دنیا بھر کے کارڈینلز پر مشتمل الیکٹورل کالج ہی نئے پوپ کا انتخاب کرتا ہے۔ اس عمارت میں کارڈینل آئیوان ڈپاس جو چرچ کا شہزادہ کہلاتا ہے ایک 12 کمروں پر مشتمل پرتعیش اپارٹمنٹ میں رہتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ اسی بلاک میں پورپ کے ہم جنس پرستوں کا سب سے بڑا نائٹ کلب واقع ہے۔ اس طرح کلیسا کے ان اعلیٰ قائدین کو اپنے ذوق لواطت کی تسکین کے لیے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ کلب کے اشتہارات میں پادریوں کے لباس میں ملبوس مردوں حتیٰ کہ ایک بھاری بھرکم پادری ''برونو'' کو کلب کی ویب سائٹ پر صرف جانگیا پہنے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔

روایتی طور پر رومن کیتھولک چرچ کو شمولیت اختیار کرنے والے مرد راہب (Monks) اور خواتین راہباؤں (Nuns) کو ساری زندگی شادی کرنے کی اجازت نہیں ہوتی اور وہ مجرد زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ ایک غیر فطری پابندی ہے اس لیے یہ خواتین وحضرات جنسی خواہش سے مغلوب ہوکر باہم جنسی تعلقات استوار کر لیتے ہیں اور ناجائز بچے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ رومن چرچ کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ نیز ماضی بعید میں رومن چرچ ایک طاقتور، بااختیار ادارہ ہوتا تھا۔ اس کی اپنی عدالتیں ہوتی تھیں، جو اختلاف عقیدہ کے مرتکب افراد کو سخت ظالمانہ سزائیں دیتی تھیں۔ درحقیقت پادریوں کی جنسی کرپشن، تنگ نظری اور ظلم و بربریت کے خلاف احتجاج کے نتیجے میں ہی پروٹسٹنٹ چرچ وجود میں آیا تھا۔

دوسرا بڑا الزام پادریوں کا بچوں کے ساتھ جنسی تعلقات اور تشدد میں ملوث ہونے کا ہے۔ تیسرا ویٹی کن بینک کا مشکوک کردار ہے۔ برازیلی کارڈینل جو براز ڈی اوپز نے ویٹی کن کے مالی معاملات پر انگلی اٹھائی جس کی حمایت بہت سے دوسرے کارڈینلز نے بھی کی۔ کارڈینل ٹارسیسیو برٹون جو رومن چرچ کی نوکر شاہی کا انتہائی بااثر رکن اور ویٹی کن کا سیکرٹری آف اسٹیٹ ہے، نے بینک کے معاملات کو نکتہ چینی سے مستثنیٰ قرار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ بینک کو منی لانڈرنگ کے مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

تیسرا مسئلہ جو اس وقت کافی شدت اختیار کر چکا ہے وہ ویٹی کن انتظامیہ اور کارڈینل اسمبلی میں طاقت اور اقتدار کی رسہ کشی ہے۔ اس لیے پوپ کا انتخاب محض مذہبی روحانی رہنما کا انتخاب نہیں بلکہ اقتدار پر قبضے کے لیے دو واضح گروہوں کے درمیان مقابلے کا مظہر بھی

ہے۔ کارڈینل پادریوں کا ایک گروہ اصلاح پسندوں پر مشتمل ہے جو ویٹی کن انتظامیہ کی تمام اخلاقی اور مالی خرابیوں سے مکمل تطہیر چاہتا ہے جب کہ دوسرا گروہ ویٹی کن کے نظام کو جوں کا توں جاری رکھنے کا حامی ہے تاکہ ان کی سیاہ کاریوں پر ہمیشہ کے لیے پردہ پڑا رہے۔ کیونکہ وہاں ایسے مذہبی رہنما افسران موجود ہیں جو اخلاقی و مالی بدعنوانیوں میں ملوث ہیں اور جو دباؤ اور تحریص کے خلاف مزاحمت نہیں کر سکتے۔

پاپائے روم بینیڈکٹ XVI کے استعفیٰ کے بعد نئے پوپ کے انتخاب کا مرحلہ آیا۔ پوپ کے انتخاب کے لیے روایتی طور پر دنیا بھر سے آئے ہوئے کارڈینل پاپری سسٹائن چرچ ویٹی کن میں اجلاس منعقد کرتے ہیں۔ 80 برس سے کم عمر کے کارڈینل پاپری انتخاب میں حصہ لینے کے اہل ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ کل 207 کارڈینل پادریوں میں سے 117 ووٹ ڈالنے کے اہل تھے۔ انڈونیشیا کے کارڈینل جولیس خرابی صحت کی بنا پر اور اسکاٹ لینڈ کے کارڈینل کیتھ جنسی اسکینڈل کی وجہ سے اس اجلاس میں شریک نہ ہوئے۔ اس طرح 115 کارڈینل پادریوں نے ووٹ ڈالا۔ انتخاب کا عمل مکمل ہونے تک تمام شرکاء حلفاً راز داری کے پابند ہوتے ہیں۔ پوپ منتخب ہونے کے لیے دو تہائی ووٹ حاصل کرنے ضروری ہیں۔ اگر ایک دفعہ کی ووٹنگ میں انتخاب نہ ہو سکے تو ووٹنگ کا عمل دہرایا جاتا ہے حتیٰ کہ کسی ایک کارڈینل کا انتخاب ہو جاتا ہے۔ انتخاب میں ناکامی پر چرچ کی چمنی سے سیاہ دھواں جب کہ کامیابی پر سفید دھواں خارج کیا جاتا ہے۔ جو چرچ کے باہر منتظر ہجوم کے لیے اشارہ ہوتا ہے۔ جب تک انتخاب کا عمل مکمل نہیں ہوتا تمام شرکاء چرچ کے اندر بند رہتے ہیں اور باہر نہیں جا سکتے خواہ اس عمل میں کئی دن ہفتے یا مہینے لگ جائیں۔ طویل ترین کارڈینل اسمبلی 1268ء میں دو سال نو ماہ جاری رہی۔ بالآخر عوام کے شدید دباؤ کی وجہ سے گریگوری X کو منتخب کر لیا گیا۔

نئے پاپائے روم فرانسس I کا تعلق جنوبی امریکا کے ملک ارجنٹائن سے ہے۔ ووٹنگ کے کئی راؤنڈ ہوئے اور بالآخر 13 مارچ 2013ء کو 76 سالہ کارڈینل جارج میریو برگولیو (اصلی نام) کو رومن کیتھولک چرچ کا دو سو چھیاسٹھواں پوپ منتخب کر لیا گیا۔ منتخب ہونے کے بعد انھوں نے اعلان کیا کہ انھوں نے تیرھویں صدی کے سینٹ فرانسس آف آسیسی کے نام پر اپنے لیے فرانسس I کا نام اختیار کر لیا ہے کیونکہ مذکورہ سینٹ نے اپنی زندگی غربا کی مدد اور امن کے فروغ کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس کے کردار سے متاثر ہوکر انھوں نے اپنے لیے ان کا ہی نام اختیار کر لیا ہے اور اسی جذبے اور پیغام سے مغلوب پوپ نے اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کا اعلان کرتے ہوئے کہا ''میں پسند کروں گا کہ چرچ سادگی اور کفایت شعاری اختیار کرے اور غریبوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرے۔''

پوپ فرانسس I 17 دسمبر 1936ء کو پیدا ہوئے۔ وہ مشہور مذہبی گروہ ''دی سوسائٹی آف جیسس'' (یسوع کی تعلیمات کے پیروکار) ہیں اور شام سے تعلق رکھنے والے پوپ سینٹ گریگوری III کے بعد 1272 سالوں میں جنوبی امریکا (ارجنٹائن) سے تعلق رکھنے والے پہلے غیر یورپی پوپ ہیں۔ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے والد ایک ریلوے ملازم اور والدہ گھریلو خاتون تھیں۔ وہ فلسفے اور کیمسٹری کی ڈگری کے حامل اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان ہیں۔ ان کا ایک گردہ لڑکپن میں بیماری کے

سبب نکال دیا گیا تھا۔ وہ ارجنٹائن فٹ بال کلب سان لارینزو کے رکن بھی رہے۔ وہ ہسپانوی، لاطینی، اطالوی، جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانیں بولتے ہیں اور فلسفہ، ادب، نفسیات میں مہارت رکھتے ہیں۔ اکیس سال کی عمر میں انھوں نے پادری بننے کی تعلیم شروع کر دی۔ 1969ء ان کا تقرر بطور پادری ہو گیا۔ وہ 1998ء میں ارجنٹائن کے دارالحکومت بیونس آئرس کے آرچ بشپ بنے اور 2001ء میں ان کو کارڈینل بنا دیا گیا۔ انھوں نے آرچ بشپ کی پُرتعیش رہائش گاہ میں رہنے سے انکار کر دیا اور ایک سادہ اپارٹمنٹ ہی ان کے زیر استعمال رہا۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنا کھانا خود پکاتے ہیں، پبلک ٹرانسپورٹ استعمال کرتے ہیں اور روم آنے جانے کے لیے اکانومی کلاس میں سفر کرتے ہیں۔ 2005ء میں پوپ بینیڈکٹ xvi کے انتخاب کے موقع پر چار مرتبہ کی ووٹنگ میں ہر دفعہ دوسرے نمبر پر آنے والے کارڈینل برگوگلیو یعنی موجودہ پوپ فرانسس I ہی تھے۔ ان کے انتخاب پر ارجنٹائن میں زبردست خوشیاں منائی گئیں۔ چرچ کی چمنی سے سفید دھواں نکلتے ہی لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ لاطینی امریکا یعنی جنوبی امریکا کے کیتھولک عوام بے انتہا مسرور ہیں کیونکہ چرچ کی دو ہزار سال کی تاریخ میں پہلے غیر یورپی اور جنوبی امریکا سے تعلق رکھنے والے پوپ منتخب ہوئے ہیں۔ ارجنٹائن کی صدر کرسٹینا نے ان کے انتخاب پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔

پوپ فرانسس I معاشرتی انصاف اور حقوق انسانی کے علمبردار ہیں۔ وہ مذاکراتی مہارت اور مقتدر افراد سے ٹکر لینے کی صلاحیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے 2010ء میں ہم جنس پرستوں کے حقوق اور باہمی شراکت کے قوانین بنانے پر ارجنٹائن کی صدر کرسٹینا فرنانڈیز کرچنر اور اس کے مرحوم شوہر کی شدید مخالفت کی۔ انھوں نے کہا ''یہ قوانین خدا کے منصوبے کو تباہ کرنے کی کوشش ہے اور یہ کنبے کے نظام کو شدید نقصان پہنچائیں گے۔ ماں، باپ بچوں یعنی پورے کنبے کی شناخت اور خطرے میں ہے۔ یہ ہمارے دلوں میں گندھے ہوئے خدا کے قانون کا مکمل استرداد ہے۔'' پوپ فرانسس نے ارجنٹائن میں اپنی کوششوں کو معاشرتی انصاف اور غریبوں کے حقوق کے دفاع پر مرکوز رکھا۔ پچھلے سال انھوں نے بن بیاہی ماؤں کے بچوں کو بپتسمہ (نام رکھنے کی رسم) ادا کرنے دینے پر پادریوں کو لعن طعن کیا۔ 2007ء میں انھوں نے لاطینی امریکا کے بشپ پادریوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''اشیا کی مسلسل غیر منصفانہ تقسیم نے معاشرتی ناانصافی اور زیادتی کو جنم دیا ہے۔ جس نے پورے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور ہمارے بے شمار بھائیوں کے لیے ایک بھرپور زندگی گزارنے کے امکانات کو کم کر دیا ہے۔''

نئے غیر یورپی پوپ کے انتخاب کو اس زاویہ نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے کہ یہ دنیا بھر میں عیسائیت کی وسعت اور مقبولیت کا ایک مثبت اشارہ ہے۔ پچھلی صدی کے دوران رومن کیتھولک چرچ میں زیادہ تر توسیع یورپ سے باہر کی دنیا میں ہوئی ہے اور اس وقت براعظم یورپ کے مقابلے میں لاطینی امریکا میں کیتھولک عیسائیوں کی تعداد 20 کروڑ سے زیادہ ہے۔

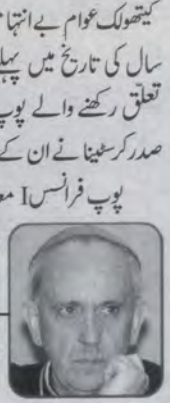

ہم جنس پرستی ہمارے دلوں پر گندھے ہوئے خدا کے قانون کا مکمل استرداد ہے

میراڈونا کا بدنام زمانہ گول

پوپ فرانسس کے بارے میں ایک اور واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ ارجنٹائن کے عالمی شہرت یافتہ فٹ بالر ڈیگو میراڈونا سے ہاتھ ملایا تھا۔ یہ میراڈونا کا وہی ہاتھ تھا جس کی مدد سے اس نے 1986ء کے ورلڈ کپ میں انگلستان کے خلاف بدنام زمانہ گول کیا تھا۔ میراڈونا نے اپنے ہاتھ کو خدا کا ہاتھ قرار دیا تھا۔ تفنّنِ طبع کے طور پر بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ پوپ اب اپنے اس ہاتھ سے کیا شعبدہ دکھائیں گے انتظار کیجیے.....!

پوپ بینیڈکٹ کی چرچ کے نظام میں موثر تبدیلی لانے میں ناکامی اور استعفیٰ نے نئے پوپ فرانسس I پر چرچ کے ادارے میں گہری اور فوری اصلاحات کے لیے دباؤ میں اضافہ کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ آوازیں باہر سے نہیں اندر سے اٹھ رہی ہیں۔ ویٹی کن کے کلیدی انتظامی عہدیداران کے اصلاح مخالف رویے کے خلاف احتجاج بلند ہوتا جا رہا ہے۔ ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ خدانخواستہ پوپ چرچ کی گندگی کو کس حد تک صاف کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

پوپ فرانسس I پر دو الزامات بھی لگائے جاتے رہے ہیں۔ 1976ء میں ایک فوجی جنرل جارج رافیل وڈیلہ نے بغاوت کرتے ہوئے ارجنٹائن کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ جو 1983ء تک جاری رہا۔ اس وقت موجودہ پوپ یعنی برگوگلیو ارجنٹائن کے چرچ میں ایک اعلیٰ عہدے یعنی ''پراونشل'' پر فائز تھے۔ ان پر الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے امریکا کی حمایت یافتہ فوجی ڈکٹیٹرشپ کی کھل کر مذمت اور مخالفت نہیں کی جب کہ عام لوگ آمر کے ہاتھوں تشدد، اغوا، قتل وغارت اور قید و بند کا شکار ہو رہے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فوجی آمر کو چرچ کی درپردہ حمایت حاصل تھی۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ شاید برگوگلیو اور چرچ کے لیے فوجی آمر سے براہ راست ٹکر لینا ممکن نہیں تھا اس لیے انھوں نے مصلحتاً خاموشی اختیار کیے رکھی۔ لیکن یہ شکایت بہرحال موجود ہے۔

دوسرے الزام کا تعلق بھی فوجی آمریت سے ہی ہے۔ 2005ء میں انسانی حقوق کے وکیل مریم برگیمین نے کارڈینل برگوگلیو کے خلاف ایک مقدمہ دائر کیا اور الزام لگایا کہ وہ یسوعی (Jesuit) پادریوں، فرانسسکو جیلکس اور آرلینڈو یوریو کے اغوا اور تشدد میں آمرانہ حکومت کے ساتھ شریک جرم تھے۔ رہائی پانے کے بعد پوروپونے نے بھی الزام لگایا کہ برگوگلیو نے انھیں بچانے کی کوشش نہیں کی۔ ان پادریوں پر الزام تھا کہ وہ کچی آبادیوں میں جا کر لوگوں کو فوجی حکومت کے خلاف اُکسا رہے تھے اور آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ فوجی حکومت نے سات سال تک اپنے ہی عوام کے ساتھ جنگ لڑی جس میں بے شمار افراد مارے گئے یا تشدد کا نشانہ بنائے گئے۔ اس جنگ کو ڈرٹی وار (Dirty war) کا نام دیا گیا۔ فوجی آمر اس وقت ارجنٹائن میں عمر قید کی سزا بھگت رہا ہے۔ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ چرچ کے قائدین کی درپردہ حمایت کے بغیر فوجی آمر اس طرح ظلم و بربریت کا بازار گرم نہیں کر سکتا تھا اور بہت سے لوگوں کی جانیں بچائی جا سکتی تھیں۔ ■■■

اولمپک انعام یافتہ بھارتی باکسر کا زوال

اپنے ہاتھوں اپنا سنہرا مستقبل تاریک کرنے والوں کے لیے خاص

فتح نیاز

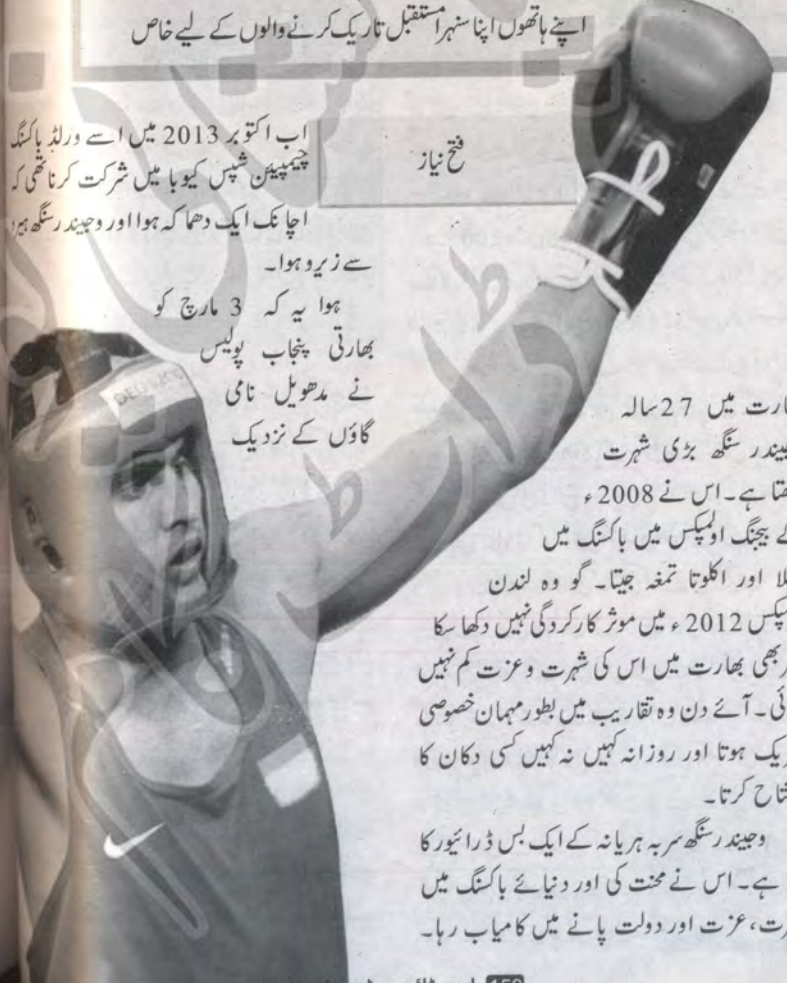

بھارت میں 27 سالہ وجیندر سنگھ بڑی شہرت رکھتا ہے۔ اس نے 2008ء کے بیجنگ اولمپکس میں باکسنگ میں پہلا اور اکلوتا تمغہ جیتا۔ گو وہ لندن اولمپکس 2012ء میں موثر کارکردگی نہیں دکھا سکا پھر بھی بھارت میں اس کی شہرت و عزت کم نہیں ہوئی۔ آئے دن وہ تقاریب میں بطور مہمان خصوصی شریک ہوتا اور روزانہ کہیں نہ کہیں کسی دکان کا افتتاح کرتا۔

وجیندر سنگھ سربہ ہریانہ کے ایک بس ڈرائیور کا بیٹا ہے۔ اس نے محنت کی اور دنیائے باکسنگ میں شہرت، عزت اور دولت پانے میں کامیاب رہا۔

اب اکتوبر 2013 میں اسے ورلڈ باکسنگ چیمپئن شپس کیوبا میں شرکت کرنا تھی کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا اور وجیندر سنگھ ہیرو سے زیرو ہوا۔

ہوا یہ کہ 3 مارچ کو بھارتی پنجاب پولیس نے مدھویل نامی گاؤں کے نزدیک ایک سابق اے ایس آئی انوپ سنگھ کا ہلون اور اس کے ڈرائیور کلوندر سنگھ عرف راکی کو کار میں آدھ کلو خالص ہیروئن لے جاتے ہوئے پکڑا، جب ان سے پوچھ گچھ ہوئی اور وہ ''چھترول'' کا نشانہ بنے تو وہ پولیس کو اپنے گھر زرک پور (نزد چندی گڑھ) لے گئے۔

انوپ سنگھ کے گھر خفیہ تہہ خانے سے 26 کلو ہیروئن برآمد ہوئی جس کی مالیت 130 کروڑ روپے تھی۔ اب پنجاب پولیس کو احساس ہوا کہ اس نے تو بڑا لمبا ہاتھ مارا ہے۔ چنانچہ تفتیش کا دائرہ پھیلا دیا گیا۔ پولیس نے پھر مختلف علاقوں سے پانچ مزید ملزم پکڑے۔ ایک ملزم سے 45 کلو ایسا کیمیکل برآمد ہوا جو ہیروئن صاف کرنے میں آتا ہے۔

ملزمان سے پوچھ گچھ ہوئی تو انکشاف ہوا کہ وہ منشیات کے ایک بین الاقوامی اسمگلنگ نیٹ ورک سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ نیٹ ورک افغانستان سے براستہ پاکستان افیون اسمگل کرتا ہے۔ پھر بھارت میں اسے ہیروئن وغیرہ کی صورت دے کر امریکا و یورپ سپلائی کیا جاتا۔ بھارت میں اس نیٹ ورک کے مقامی چیف سابق پولیس انسپکٹر جگدیش نے 1997ء میں ارجن ایوارڈ بھی حاصل کیا۔

وجیندر سنگھ کا نام

دوران تفتیش انوپ سنگھ نے یہ بڑا دھماکہ بھی کیا کہ وجیندر سنگھ اپنے ساتھی رام سنگھ کے ساتھ اس سے ہیروئن خریدتا رہا ہے۔ چنانچہ پولیس نے اسے بھی تفتیش کے لیے بلا لیا۔ ڈی ایس پی ہریادل سنگھ نے بیان لیا۔ وہ بتاتا ہے ''پوچھ گچھ کے دوران وجیندر گھبرایا ہوا تھا۔ دراصل اس دیہاتی لڑکے کو شہر کی ہوا لگ گئی ہے۔''

وجیندر سنگھ کا کہنا تھا کہ وہ بے گناہ ہے لیکن اس کا دوست 29 سالہ زام سنگھ پولیس دباؤ کی تاب نہ لا سکا اور اس نے اقرار کیا کہ دسمبر 2012ء کے بعد انھوں نے پانچ چھ بار انوپ سنگھ سے ہیروئن خریدی۔ تاہم وجیندر نے خود استعمال نہ کی بلکہ اپنے دوستوں کو دیتا رہا۔

وجیندر اچھی شکل و صورت رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ ممبئی پہنچا اور دو تین فلم ڈائریکٹروں سے ملا۔ اسے فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔ ممبئی ہی میں وہ خلاف قانون شراب نوشی کی (Rave) پارٹیوں میں جانے کا شوقین ہو گیا۔ ان پارٹیوں میں امیر گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں شریک ہوتے ہیں۔ وہ خوب ہلہ گلہ اور نشہ کرتے نیز ناچ گانے سے دل بہلاتے ہیں۔

ان پارٹیوں کے ذریعے کئی لڑکیاں وجیندر کی دوست بن گئیں۔ انھوں نے اسے ہیروئن کے نشے سے متعارف کرایا۔ تبھی وہ اپنے نائب رام سنگھ کے ذریعے انوپ سے ہیروئین خریدنے لگا۔ رام سنگھ بھی باکسر ہے۔ یاد رہے بھارتی حکومت نے وجیندر کو بطور انعام ڈی ایس پی بنا رکھا ہے جب کہ رام سنگھ انسپکٹر ہے۔

یوں بھارت کا ایک ابھرتا باکسر نشے اور مادر پدر آزاد معاشرت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ یقیناً وہ منشیات کے عالمی نیٹ ورک کا حصہ نہیں تھا، لیکن اب اس کے دامن پہ یہ دھبہ مستقل لگ چکا کہ وہ ہیروئن پی رہا ہے۔ سچ ہے، کئی نوجوان اپنے ہاتھوں اپنا سنہرا مستقبل تباہ کر کے قسمت کھوٹی کر بیٹھتے ہیں۔

■■■

شکیل احمد

آپ کی قسمت، مقدر اور منزل

اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے
ایک واضح مقصد اور سوچ پیدا کیجیے

قسمت، مقدر، منزل کس قدر زبردست الفاظ ہیں اور ان الفاظ کی عظمت کیا ہے؟ ہر چیز کے ساتھ ایک عظمت منسلک ہوتی ہے۔ آپ کی ایک قسمت، مقدر اور منزل ہے۔ قسمت، مقدر اور منزل کے متعلق ایک اور عظمت کیا ہے؟ اپنی قسمت اور مقدر تشکیل دینے میں ہمارا اپنا اہم کردار ہے۔ مختصر یہ کہ آپ اپنی قسمت، مقدر اور منزل کا انتخاب مع دن خود کر سکتے ہیں۔

آپ کی قسمت، مقدر اور منزل آپ کا وہ خواب ہے جو آپ کے مطلوبہ اور ترجیحی مستقبل میں پوشیدہ ہے۔ ہر روز ہم جن خیالات کا انتخاب کرتے ہیں، وہ ہمیں ہماری قسمت، مقدر اور منزل کی طرف لے کر جاتے ہیں۔ ہمارے رویے، طرزِ ہائے عمل، ہمارے الفاظ و افعال اور تعلقات یہ سب امور ہمارے مقدر، قسمت اور منزل کا تعین کرتے ہیں اور اس مخصوص دن کا بھی تعین کرتے ہیں جب ہم اپنی منزل پر پہنچیں گے۔

(جب آپ اپنی قسمت، مقدر اور منزل اور اس سے منسلک مخصوص دن کے متعلق سوچتے ہیں تو پھر مندرجہ ذیل افکار پر غور کیجیے)

ذہنی سوال: کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ خوشحالی کی زندگی حاصل کر سکتے ہیں؟ واضح اور سچی بات تو یہ ہے کہ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی دلی خواہشات کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ کامیابی ایک ایسی چیز ہے جو ذہین اور باصلاحیت افراد کے لیے مخصوص ہے۔ یہ نظریہ درست نہیں ہے اور شاید آپ کی طرف سے اپنی منزل کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ بھی یہی ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی میں خوشحالی کے خواہشمند ہیں تو پھر ہمیں سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم یہ خوشحالی حاصل کر سکتے ہیں۔

سچائی تو یہ ہے:

یہ عمل قابلِ اہمیت نہیں ہے کہ آپ کی ذہانت کا معیار کیا ہے؟

آپ کے موجودہ وسائل و ذرائع کیا ہیں؟

آپ کا خاندانی پس منظر کیا ہے؟

آپ کے موجودہ حالات کیا ہیں؟

اور یہ وہ پیغام ہے جو ہمیں مسلسل دوسروں تک پہنچانا چاہیے ''میں یہ کام کر سکتا ہوں۔'' واضح سوچ اور

واضح مقصد۔ ذیل میں چند سوالات دیے گئے ہیں جن کے ذریعے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی سوچ اور مقصد واضح اور صاف ہے کہ نہیں۔

کیا آپ اسے مفصّل بیان کر سکتے ہیں؟

کیا آپ اسے ''دیکھ'' سکتے ہیں؟

کیا آپ اسے ''محسوس'' کر سکتے ہیں؟

کیا آپ اسے ''سن'' سکتے ہیں؟

اس ضمن میں ایک دو مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

شاید آپ اپنے گھرانے کے معذور فرد ہیں اور آپ کا خواب اور مقصد یہ ہے کہ آپ اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ آزادانہ طور پر نقل و حرکت کر سکیں۔ آئیے اب ہم ''دعوت یوم تشکر'' سے آغاز کرتے ہیں۔ کیا آپ وہاں ہر شخص کو دیکھ سکتے ہیں؟ انھوں نے کون سا لباس پہنا ہوا ہے؟ کیا وہ مسکرا رہے ہیں؟ ان کے درمیان کیا گفتگو ہو رہی ہے؟ کیا آپ ان کے قہقہے سُن سکتے ہیں؟ کیا آپ لطف اور مسرت محسوس کر رہے ہیں؟ کیا آپ بھنے ہوئے مرغ کی خوشبو سونگھ سکتے ہیں؟ رخصت ہونے کے وقت کیا آپ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کو گلے لگا رہے ہیں اور ''دعوت یوم تشکر'' کو شاندار قرار دے رہے ہیں؟

دوسرا منظر

آپ کا وہ ادارہ جس کے آپ آجر ہیں۔ کیا آپ وہ وسیع عمارت دیکھ سکتے ہیں جس کے اندر آپ موجود ہیں؟ کیا آپ اپنے ملازمین کو دیکھ سکتے ہیں؟ کیا آپ ان کے مثبت رویے کو محسوس کر سکتے ہیں؟ جب 2 ماہ بعد آپ کے پاس آپ کے ادارے کے نتائج آتے ہیں تو کیا آپ خوشی اور مسرت محسوس کر سکتے ہیں؟ کیا آپ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ آپ ایمانداری سے کاروباری امور انجام دے رہے ہیں جو آپ کے ملازمین کے لیے تعجب کا باعث ہے؟ آپ کی سوچ اور مقصد کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔ اپنی قسمت، مقدر اور منزل کے متعلق واضح سوچ۔ اپنے وسائل و ذرائع پر غور کیجیے۔ کیا آپ کو اپنے مطلوبہ مقاصد کے حصول کے ضمن میں اپنے پاس موجود وسائل اور ذرائع کا ادراک اور آگہی حاصل ہے؟ کیا آپ کو یہ علم ہے کہ آپ یہ وسائل اور ذرائع کیسے حاصل کر سکیں گے؟

آپ کے پاس موجود خداداد صلاحیتیں کون کون سی ہیں اور اپنے مقصد اور منزل کے حصول کے ضمن میں آپ انھیں زیادہ بہتر طور پر کیسے استعمال کر سکتے ہیں؟

آپ کے موجودہ وسائل و ذرائع کی نوعیت و حیثیت کیا ہے؟

رقم / دولت، وقت؟ ذہنی و جذباتی صحت؟

دوستوں، افرادِ خانہ، ملازمین کی طرف سے مدد اور معاونت؟

مستقبل کے لیے مطلوبہ ذرائع و وسائل کی نوعیت و کیفیت اور کیا آپ نے مطلوبہ وسائل و ذرائع حاصل کرنے کے ضمن میں کوئی منصوبہ بندی کی ہے؟

آخری تجویز میں آپ کے سامنے یہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی مطلوبہ قسمت، مقدر اور منزل کے حصول کے لیے ایک مخصوص تاریخ مقرر کیجیے۔ ایک عملی اور حقیقی تاریخ اور دن۔ اس عملی اور حقیقی دن/تاریخ کے تعین کے باعث آپ اپنے مطلوبہ مقاصد و اہداف کی تکمیل کے لیے ایک مربوط منصوبہ مرتب کر سکیں گے۔

اب دوبارہ ان نکات پر توجہ دیجیے

اس ذہنی سوال کا جواب دیجیے: کیا مجھے واقعی یقین ہے؟

ایک واضح مقصد اور سوچ پیدا کیجیے

مطلوبہ وسائل و ذرائع پر نظر رکھیے

ایک مخصوص دن/تاریخ مقرر کیجیے

منصوبہ بندی کیجیے۔

(از کرس وائیڈز)

■■■

خبر بنانے والی کبھی خود بھی خبر بنتی ہیں

حنا انور

ملک کے موثر و مؤقر اخبارات کی لیڈی رپورٹرز ایڈیٹرز پہلی بار خود اپنے بارے میں بات کرتی ہیں

صحافت روزناموں کی ہو یا ہفت روزوں اور ماہناموں کی، اب ہماری زندگی کا لازم حصہ ہے۔ بات خبروں سے کہیں آگے جا چکی۔ اخباروں کی خوب صورتی کہیے یا پہچان، تو یہ صرف معروف سیاسی لوگوں کی بڑی بڑی اہم خبروں، انٹرویوز یا اب تصویروں پر مبنی نہیں رہی۔ اخبارات و رسائل کے ہفتہ وار یا روزانہ گلیمرائیڈیشن نے اپنے وجود کو پوری خوبی سے منوالیا ہے۔ حسن اتفاق سے یہ ذمہ داری کم و بیش ہر جگہ لڑکیوں کے حصے میں آتی ہے۔ خوب صورتی لفظوں کی ہو یا خیالوں کی مضبوطی روابط کی ہو یا اہمیت انٹرویوز اور رائٹ اپ کی ٹائمنگ کی، انہیں قدم قدم پہ ان گنت چیزوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ کہیں اداروں کی پالیسی، کہیں بڑھی ہوئی توقعات اور کہیں گھر اور خاندان کے پیاروں کے خدشات و تحفظات اور کبھی کبھی ان دیکھے خطرات راہ روکتے ہیں۔ آئیے ہمارے اس نئے سلسلے میں آپ کو ملک کی معروف رپورٹرز اور ایڈیٹرز کی زندگی کے دلچسپ واقعات اور تجربات میں شامل کرتے ہیں جو ہماری رپورٹر نے پہلی بار ان سے خصوصی طور پر اردو ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے حاصل کیے ہیں۔ (ایڈیٹر)

بیگم کلثوم نواز کی سادگی دیکھ کر میں اٹھ کھڑی ہوئی

کل کی لڑکی وزیراعظم کی فیملی کا انٹرویو کیسے کر لائی؟

فرزانہ چودھری (فیملی میگزین)

18 سال قبل میں نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ کنیئرڈ کالج سے بی ایس سی کرنے کے بعد مزید پڑھنے کا ارادہ تھا لیکن حادثاتی طور پر صحافت میں آ گئی اور تب سے آج تک یہی کام کر رہی ہوں۔ ہوا کچھ یوں کہ ایک فوٹو گرافر ہوا کرتے تھے۔ انھیں کبھار تصویروں کے حوالے سے کوئی نہ کوئی خبر دیتی تھی۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ نواز

وقت ایک فیملی میگزین شروع کر رہا ہے تو تمھیں بھی وہاں درخواست دینی چاہیے لیکن میں نے کہا کہ مجھے تو اس حوالے سے کچھ بھی علم نہیں وہاں جا کر کیا کروں گی؟ لیکن انھوں نے اور میرے استاد ریاض باجوہ صاحب نے اصرار کیا کہ تمھیں ضرور درخواست دینی چاہیے۔ حتیٰ کہ ریاض باجوہ صاحب نے خلیل نظامی (مجید نظامی صاحب کے بھائی) کے نام ایک خط لکھ دیا۔ میں وہ لے کر نوائے وقت کے دفتر پہنچ گئی اور جا کر خلیل صاحب کو دکھایا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ مجھے صحافت کے بارے میں زیادہ علم نہیں۔ آپ مجھے کوئی اسائنمنٹ دے دیں۔ اگر میں کر سکی تو ٹھیک ورنہ آپ انکار بھی کر دیں گے تو مجھے برا نہیں لگے گا۔ انھوں نے مجھے بیوٹی پارلر کے حوالے سے ایک اسائنمنٹ دے دی۔ میں نے اسی دن دو بیوٹی پارلر ڈھونڈے، ایک شادمان میں تھا، دوسرا مال کے قریب تھا۔ وہاں گئی، لوگوں سے ملی اور ایک رپورٹ تیار کر کے انھیں دے دی۔ جب رپورٹ لے کر نظامی صاحب کے پاس گئی تو انھوں نے کہا کہ ہاں ہمارے معیار کی نہیں، لیکن اچھی ہے۔ یوں مجھے انھوں نے فیملی میگزین میں رکھ لیا۔ مجھے وہاں کام کرتے ہوئے ابھی صرف دو ڈھائی ماہ ہی گزرے تھے اور نواز شریف کا دور حکومت ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ مجھے یہ ٹاسک ملا کہ میں اُن کا فیملی انٹرویو کروں۔ میں نے کہیں سے نواز شریف کے گھر کا نمبر لیا اور اسی دن فون ملایا۔ لیکن دو دن تک آپریٹر مجھے لڑھاتا رہا کہ سات بجے فون کریں، نو بجے کریں۔ مسلسل دو دن کی خواری کے بعد میں نے اسے خوب سنائیں کہ اگر بات کرانی ہے تو کرا دو ورنہ صاف منع کر دو یوں ٹرخاؤ نہیں۔ وہ شاید میرے غصے سے ڈر گیا اور اس نے فوراً گھر میں میری بات کرا دی۔

مریم نواز نے فون اٹھایا، انھیں بھی میں نے سنا دیں کہ آپ نے انٹرویو کرانا ہے تو صاف بتا دیں، یوں آگے پیچھے کا وقت دے کر ٹرخائیں نا۔ انھوں نے کہا کہ آپ صبح انٹرویو کے لیے آ جائیں۔ مریم نواز تب کالج میں پڑھتی تھیں۔ میں نے کہا نہیں آپ بیگم نواز سے میری بات کرائیں۔ یوں میں نہیں آؤں گی۔ مریم کہنے لگیں کہ اماں کا گلا خراب ہے، وہ بات نہیں کر سکتیں۔ میں نے کہا کہ میں نے ان سے صرف کنفرم کرنا ہے، کوئی تقریر نہیں کرانی پھر فون پر ہی میں نے کلثوم نواز کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ مریم! ہماری بڑی مصروفیت ہے۔ لیکن مریم لڑ رہی تھی کہ نہیں میں نے اب فرزانہ کو وقت دے دیا ہے اور مجھے کہا کہ بس کل آپ پہنچ جائیں۔

میں حسبِ وعدہ صبح ہی پہنچ گئی۔ ابھی گیٹ کے پاس ہی گئی تھی کہ ایک ملازم بھاگا آیا اور کہا، ''آپ فرزانہ ہیں؟ اندر آ جائیں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔'' میں اندر گئی تو گھر میں خواتین پارٹی ارکان کی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔ لیکن مجھے لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ اتنے میں نواز شریف کی والدہ بھی آ گئیں اور ملازمہ سے کہا کہ جاؤ مریم سے کہو، فرزانہ آ گئی ہے جس کے لیے وہ لڑائی کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں مریم آ گئی اور یوں پورا دن میں نے ان کے گھر میں گزارا اور ایک بھرپور فیملی انٹرویو کیا۔

بیگم کلثوم نواز کے اپنے بیڈ روم میں جس تصویر پر میں نے ہاتھ رکھا وہ مجھے دلوا دی۔ ایک بات جو قابلِ ذکر ہے کہ میں صوفے پر بیٹھی تھی تو وہ البم لے کر نیچے قالین پر بیٹھ گئیں۔ ان کی سادگی، معصومیت اور بے

نیازی دیکھ کر میں فوراً اٹھ کھڑی ہوئی کہ آپ خاتون اول ہیں، اس طرح نہ بیٹھیں۔

خیر یہ انٹرویو چھپا اور بہت پسند کیا گیا۔ اس سے میرے کیریئر کو بھی Boost ملا اور یہاں تک کہ دیگر اداروں میں لیڈی رپورٹرز کو شوکاز نوٹس بھی ملے کہ کل کی لڑکی وزیراعظم کا فیملی انٹرویو کر آئی اور وہ عرصے سے فیلڈ میں ہیں اور یہ کام نہ کر سکیں۔

مشکلات کا سامنا میرے خیال میں ہر اس شخص کو کرنا پڑتا ہے جو کام کرنے کی نیت سے کہیں بھی ہو۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ ؎

اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

میں نے ہمیشہ اچھا کام کرنے کی کوشش کی ہے اور کہیں نہ کہیں پیشہ ورانہ حسد کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کام کر کے ایسی باتوں کا منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں۔

میں نے جنرل طارق پرویز کا انٹرویو کیا۔ انھوں نے 1973ء کی جنگ میں حصہ لیا تھا اور ان جوانوں میں شامل تھے جو سرنگ بنا کر بھارت سے فرار ہو کر آئے تھے۔ اس انٹرویو کے بعد مجھے باہر کے کئی چینلز سے کالز آئیں۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ میں کون ہوں؟

میرا آئیڈیل (Ideal) کوئی نہیں ہے۔ میں تین سال تک مسلسل پریس کلب کی ایگزیکٹو سیکرٹری رہی ہوں۔ میرے خیال میں کامیابی وہی ہے جب لوگ آپ کی تعریف کریں۔ آپ کے کام کو سراہیں اور آپ خود بھی ایک اچھا انسان ہونے کا ثبوت دیں۔

مریم نواز کی جب شادی ہوئی تو میڈیا کو کور کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ شادی کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ میں مریم کا فیملی انٹرویو کروں لیکن مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ اب اجازت ہی نہیں ہے تو کیا کرنا ہے؟ خیر میں سیدھا ان کے گھر چلی گئی لیکن گیٹ کیپر نے مجھے اندر نہیں جانے دیا۔ میں نے اسے اپنا کارڈ دیا اور کہا، جب بی بی آئیں تو انھیں یہ کارڈ براہ کرم پہنچا دیجیے گا اور میں واپس آ گئی۔ مجھے اپنی والدہ کے ساتھ شاہدرہ کہیں جانا تھا، دلچسپ بات یہ ہے کہ جیسے ہی مریم کو پتا چلا کہ میں آئی تھی، انھوں نے میرے گھر فون کیا۔ وہاں سے انھیں پتا چلا کہ میں شاہدرہ میں ہوں تو انھوں نے جہاں میں گئی ہوئی تھی، وہاں کا نمبر لیا اور مجھے کال کی کہ فرزانہ تم ابھی آ جاؤ۔ میں نے کہا کہ میں ابھی نہیں آ سکتی، صبح آ جاؤں گی۔ چنانچہ صبح نو بجے کا ٹائم مقرر ہوا اور میں وہاں پہنچ گئی۔ فوٹو گرافر میرے ساتھ تھا لیکن مریم نے تصویر بنوانے سے انکار کر دیا اور مجھے البم سے کافی تصویریں دے دیں۔ ابھی میں وہیں موجود تھی کہ نواز شریف صاحب آ گئے۔ میں نے مریم سے پوچھا، آپ نے اجازت لی تھی تو انھوں کہا کہ نہیں لیکن وہ پھر بھی کچھ نہیں کہیں گے۔ مریم نے مجھے نہیں جانے دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں نواز شریف صاحب انٹرویو سے منع نہ کر دیں۔ میں نے جلدی جلدی Tapes اور کاغذ سمیٹے اور چل پڑی۔ باہر گیراج سے پہلے ایک بہت بڑا شیر بنا ہوا ہے، نواز شریف صاحب وہاں ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اکیلے بیٹھے تھے۔ میں نے وہاں سے فوراً نکلنے کی کوشش کی کہیں وہ مجھ سے انٹرویو کی ٹیپ ہی نہ لے لیں۔

وہاں سے تو آ گئی لیکن مجھے ڈر ہی لگا رہا کہ کہیں وہ فون کر کے انٹرویو چھاپنے سے منع نہ کر دیں۔ میں نے پوری رات لگا کر 78 صفحات لکھ ڈالے۔ بدھ کو میگزین نکلنا تھا۔ میں نے ایک دن میں ہر صفحہ کا کام مکمل کر کے بدھ کو انٹرویو فارورڈ کر دیا۔

جب میگزین مارکیٹ میں گیا تو صرف تین گھنٹوں کے اندر اندر اس کی ساری کاپیاں بک چکی تھیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہمیں تین دفعہ یہ انٹرویو مزید چھاپنا پڑا۔ صحافت کی تاریخ میں ایسا بہت ہی کم بار ہوا ہے کہ ایک مضمون تین دفعہ پرنٹ ہوا ہو۔ اس کے بعد مجھے مریم نواز کی کال آئی اور انھوں نے کہا کہ میں یہ میگزین خریدنے خود گئی تھی۔ سوچا کہ ڈرائیور کو بھیجا تو وہ زیادہ وقت لگائے گا۔

صحافت چھوڑنے کا ارادہ تو نہیں کیا۔ ہاں، کئی بار مشکلات کا سامنا ضرور کرنا پڑا اور کبھی تو ایسی ایسی مشکلات آئیں کہ واقعی لگا، چلنا ناممکن ہے۔ لیکن ہمت، حوصلے، دل جمعی کے ساتھ کام کو جاری رکھا تو اب لوگ جانتے بھی ہیں اور تعریف بھی کرتے ہیں۔

میرا کہنا تو یہی ہے کہ پروفیشن جو بھی ہو، اچھا انسان بننا زیادہ ضروری ہے۔

نئی آنے والی لڑکیوں کو پیغام دینا چاہوں گی کہ ہم نے تو اس پیشے میں آ کر سیکھا اور جانا کہ صحافت کیا ہے؟ جب کہ وہ تو اب پیشہ ورانہ ڈگری کے ساتھ آتی ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ محنت اور لگن کے ساتھ کام کریں۔ شارٹ کٹ نہ ڈھونڈیں بلکہ کام سے اپنے آپ کو منوائیں۔

میں نے پیر صاحب کی علیحدگی کی خبر دی تو وہ ناراض ہو کر بولے
بولے اس کو تو میں ایسا کھانا کھلاؤں گا کہ یاد رکھے گی

فاخرہ تحریم (روزنامہ جنگ)

8 جنوری 1988ء میں کام کا آغاز کیا تھا۔ کافی سال ہو گئے، اسی لیے یاد کرنا پڑ رہا ہے۔ اس وقت چل ہی پرنٹ میڈیا رہا تھا۔ الیکٹرانک میں صرف ایک پی۔ٹی۔وی تھا۔ ویسے اس وقت لوگ زیادہ تر پرنٹ کو ہی ترجیح دیتے تھے۔ میں نے جنگ سے آغاز کیا تھا اور تب سے وہیں ہوں۔ جب میں نے جوائن کیا تب بھی وہ ہر لحاظ سے بڑا اخبار تھا۔ تھوڑے سے پیسوں کے لیے اسے چھوڑ کر کسی دوسرے اخبار میں جانا میرے خیال میں کوئی عقل مندی نہیں تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے کوئی بھی نیا اخبار آئے تو وہ آفر تو زیادہ کی کرتے ہیں۔ پھر پتا بھی نہیں ہوتا کہ نیا اخبار چلتا بھی ہے یا نہیں تو آپ اپنا کیریئر داؤ پر لگا لیں۔ ویسے آج کل تو میڈیا میں یہ اسٹائل ہو گیا ہے کہ جب تک آپ چھوڑ کر آگے نہیں جاتے، آپ ترقی نہیں کر پاتے۔

آغاز میں ظاہر ہے مشکلات ہوتی ہیں جن پر محنت سے آپ قابو پا سکتے ہیں۔ خواتین کو میڈیا میں

سب سے بڑی پرابلم ٹرانسپورٹ کی ہوتی ہے۔ گھر میں اگر 7,8 لوگ ہیں تو ممکن نہیں کہ ہر وقت آپ کو گاڑی مل جائے۔ میری فیلڈ ہی ایسی ہے کہ سارا دن فیلڈ ورک کرنا ہوتا تھا جوگر پہنے ہوتے تھے وہ اب بھی پہن رکھے ہیں۔

سارا دن بسوں پر گزرتا، کبھی والد صاحب نے صبح چھوڑ دینا، کبھی کہنا آج تم گاڑی لے جاؤ۔ لیکن بہرحال ہم نو بہن بھائی تھے، یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ گاڑی ہر روز مجھے ہی مل جاتی۔ کبھی انھوں نے کہنا رکشہ لے لو۔ لیکن میں اکثر وین پر جاتی تھی، شروع میں جب اسٹارٹ کیا تو میری پندرہ سو روپے تنخواہ تھی۔ اس میں پٹرول ہی مشکل سے پورا ہوسکتا تھا اور جب بس یا وین پر جانا ہو تب بھی کرائے مشکل سے ہی پورے ہوتے تھے۔ لیکن ایک شوق تھا، والد صاحب نے بھی بہت سپورٹ کیا۔ کبھی وہ کہتے بیٹا! آج گاڑی لے جاؤ تو میں کہتی کہ نہیں ابو آج پٹرول کے پیسے نہیں۔ وہ کہتے، اچھا میں پٹرول ڈلوا دیتا ہوں۔ بس اسی طرح سے سلسلہ چلتا رہا۔ میں نے کافی تکالیف اٹھائیں۔ پھر میں نے ایک کمیٹی ڈالی، سوچا کہ گاڑی لے لوں گی۔ آفس میں ایک گاڑی بک رہی تھی لیکن وہ قسطوں پر تو نہیں ملی۔ خیر گاڑی میں نے بعد میں لے لی۔ ابو سے میں نے کہا کہ آپ گاڑی کے پیسے دے دیں، ان دنوں ہماری فیملی کار چوری ہوگئی۔ میں نے ابو سے کہا کہ گاڑی آپ رکھ لیں میں پلاٹ لے لیتی ہوں۔ ہم self made لوگ ہیں۔

اللہ کا بہت شکر ہے، اتنی عزت دی اور آج جس جگہ پر کھڑے ہیں، وہ اللہ ہی کی مہربانی ہے۔

میرا خیال ہے محنت سے ہی آپ اپنی منزل کی بھی فیلڈ میں حاصل کر سکتے ہیں اور اس میں کوئی میل یا فی میل کی بات نہیں۔ کوئی بھی ہو، جب تک آپ محنت نہیں کرو گے اور دوسرے سہارے ڈھونڈو گے آگے بڑھنے کے لیے تو ترقی کرنا بڑا مشکل ہے۔ جیسے 25 رپورٹر ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک ہی چیف رپورٹر بنتا ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ باہر سے لے آتے ہیں۔ اندر کے لوگوں کی اس طرح سے پروموشن کم ہی ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ ایک سینیئر ہو جاتا ہے۔ رپورٹر تو رپورٹر ہی رہتا ہے۔

بڑی خوشی ہوتی ہے کہ آج کل کی خواتین بہت آگے جا رہی ہیں۔ جیسے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ Anchor جرنلسٹ نہیں ہوتے جب کہ یہ ایسی فیلڈ ہے کہ anchor کو بھی اتنا ہی study کر کے آنا پڑتا ہے۔ کافی خواتین آگے نکلی ہیں۔ لیکن میرا کوئی آئیڈیل نہیں ہے لیکن اچھا کام کرنے والوں کو سراہتی ضرور ہوں۔

میں نے دراصل خواتین کے ایشوز کو ہی ہر طرح سے نمایاں (highlight) کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے لگا اس فیلڈ میں آنے کا جو فائدہ ہوا کہ بہت سارے ایسے ایشوز ہیں جن کو ہم عام زندگی میں اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن جب آپ اس فیلڈ میں آتے ہو تو آپ کو حقیقت کا پتا چلتا ہے تو پھر آپ کو لگتا ہے کہ ہاں واقعی یہ تو بہت بڑا مسئلہ ہے۔ لہٰذا جو مسائل ہیں، ان کی سمجھ بوجھ آئی تو اپنی اسی فیلڈ کے ذریعے میں نے اسے آگے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ بات یہ ہے کہ آپ کے پاس اگر صلاحیت ہے

لیکن مواقع نہیں ملے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن مجھے اپنا آپ منوانے کے لیے مواقع بھی ملے۔ گھر والوں کی سپورٹ بھی رہی اور ادارے کی بھی سپورٹ رہی۔ خود اپنی محنت اور اللہ کا کرم سب شامل حال رہا۔ ورنہ اتنا عرصہ خواتین کام نہیں کرتیں، شادی ہوئی اور چھوڑ کر چلی گئیں۔ اس طرح کے مسائل ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے سپورٹ رہی ہمیشہ گھر والوں کی طرف سے۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ امام کعبہ کی بیٹی آئیں۔

رات ایک بجے وہ پہنچی ہیں تو ظاہر ہے کہ اگر آپ یہ کہیں کہ ایک بج گیا ہے، میں کیسے جاؤں گی تو یہ نہیں ہوتا۔

دفتر کی گاڑی آتو گئی لیکن آگے بھی تو آپ نے گھر جانا ہے۔ ایسا تو نہیں ہوگا کہ دو تین باڈی گارڈز کی صورت گھر کے افراد آپ کے ساتھ ہوں۔ ایک بجے وہ آئیں۔ پھر ان کا انٹرویو کیا۔ اس کے بعد دفتر جا کر وہ پروگرام کیا اس طرح سے کافی مصروفیت رہتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر وقت ایسا ہو۔ ادارے خواتین کو بہت سپورٹ کرتے ہیں۔ آپ نے اپنا کام جلدی کر لیا ہے تو آپ بھیجی جا سکتی ہیں۔ لیکن جہاں ضرورت ہو، وہاں یہ کوئی معذرت (Excuse) نہیں کہ آپ نہیں رک سکتے یا کام نہیں کر سکتے۔

آپ روزانہ کام کر رہے ہوتے ہیں جیسے ہر ہفتے میرا ایڈیشن آتا ہے۔ وہ میں 1997ء سے کر رہی ہوں۔ مجھے یہ بھی تھا کہ اس وقت ادارہ تھوڑے بحران (crises) میں تھا۔ ہمارے ایڈیٹر ان چیف نے کہا کہ فاخرہ، آپ میگزین کے ساتھ رپورٹنگ بھی کریں۔ یہ بھی ایک فخر ہوتا ہے کہ ہاں بھئی کہ آپ پر اعتماد کیا گیا ہے کہ آپ کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا! سر دو دو کام بہت مشکل ہیں لیکن انھوں نے کہا، نہیں آپ کر سکتی ہیں۔ انھوں نے اتنا حوصلہ دیا کہ میں اس وقت سے اب تک دونوں کام کر رہی ہوں۔ بلکہ پچھلے دنوں سے تو خواتین کا ایک روزانہ ایڈیشن بھی آ رہا تھا۔ چناں چہ صبح سے نکلے ہیں رات ہوگئی۔ تصویریں بھی خود بنا رہے ہیں ہر طرح کا کام خود کر رہے ہیں۔ جو بھی کام میں کرتی ہوں، ہر دفعہ پوری محنت سے کرتی ہوں اور اپنا سو فیصد کام دیتی ہوں۔

مجھے تو یہی لگتا ہے کہ اگر محنت ہے تو آپ کامیاب ہیں۔ اگر کسی کو سیڑھی بنا کر چڑھنے کی کوشش کریں تو کتنی دیر وہ سیڑھی برقرار رہے گی؟ لیکن محنت آپ کو آگے لے جا سکتی ہے۔ مجھے تو یہی لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری محنت قبول کی ہے۔ اللہ کی مدد کے بغیر آپ کچھ بھی نہیں بلکہ بالکل زیرو ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس پروفیشن میں عزت دی۔ میں نے کبھی پیسے کو اہمیت نہیں دی۔

کچھ لوگوں کے ذہن میں ہر وقت رقم ہوتی ہے اور مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔ بعض اوقات کسی کانفرنس وغیرہ میں جانا ہو تو کچھ لوگ سب سے پہلے پیسے کی بات کرتے ہیں۔ مجھے اس سے بہت کوفت ہوتی ہے۔

جرنلسٹ بھی عورت ہی ہوتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اعتماد سب سے بڑا فرق ہے کیونکہ یہ فیلڈ ایسی ہے کہ آپ جب باہر نکلتے ہیں، لوگوں سے ملتے ہیں تو سب سے پہلے تو آپ کا اعتماد بڑھتا ہے۔ ہم پانچ بہنیں ہیں تو سب سے زیادہ مجھے ہی بااعتماد کہا جاتا

ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ پہلے اتنا اعتماد نہیں تھا۔ ایک دفعہ میں امی کے ساتھ جا رہی تھی۔ مجھے کسی جگہ پر اترنا تھا۔ میں نے کہا مجھے یہاں اتار دیں تو میری والدہ کہنے لگی کہ تم ایسے ہی منہ اٹھا کر کسی کے گھر چلی جاتی ہو۔ انھوں نے کہا کہ تمھیں ڈر نہیں لگتا؟ حالات اتنے خراب ہیں، یہ ہے، وہ ہے۔ لیکن ظاہر ہے، مجھے تو ایسی چیزیں محسوس نہیں ہوتیں لیکن ایک عام دیکھنے والا تو پریشان ہوتا ہے۔ ملک سے باہر بھی کئی دفعہ جانا پڑا۔ چین، ایران، جاپان، امریکا میں بھی گئی ہوں۔ ہر جگہ سیکھتی ہوں۔

پیر پگاڑا کے حوالے سے مجھے ایک اسائنمنٹ ملی کہ ان کا انٹرویو کرنا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے مالک تھے۔ جب لاہور آتے تھے کسی کو وقت دیتے کبھی نہ دیتے۔ تو ہمارے چیف رپورٹر تھے پرویز بشیر صاحب، وہ اکثر جب پیر صاحب آتے تھے تو یہ کھانے وغیرہ پر جایا کرتے تھے۔ ان سے کہا کہ میں نے پیر صاحب کا انٹرویو کرنا ہے، مجھے اسائنمنٹ ملی ہے۔ سنڈے میگزین کے لیے تو کہتے ہیں، بھئی میں ان سے پوچھ لوں گا۔ لیکن ان کے موڈ کا نہیں پتا کہ وقت دیں یا نہ دیں۔ میں نے کہا، میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ اگر دے دیا تو ٹھیک نہیں تو باہر بیٹھی رہوں گی۔ خیر ان سے جب ملے تو بتایا کہ ہماری لیڈی رپورٹر میرے ساتھ ہی آئی ہوئی ہیں۔ اگر آپ وقت دے دیں تو..... انھوں نے کہا ٹھیک ہے، بلا لو۔ ان کی اپنی بیوی کے ساتھ کوئی کشیدگی چل رہی تھی۔ میں نے سب سے پہلے خبر بریک کر دی، بعد میں ان کی علیحدگی بھی ہو گئی تھی۔

تو خیر وہ خبر پیر پگاڑا صاحب کے خلاف تھی جس پر وہ بہت تلملائے بھی۔ ایک دفعہ ہمارے چیف رپورٹر دفتر میں ہی پیر صاحب سے فون پر بات کر رہے تھے، کہنے لگے کہ پیر صاحب فاخرہ پاس بیٹھی ہوئی ہے اور کہہ رہی ہے کہ کافی عرصہ سے پیر صاحب نے کھانے پر نہیں بلایا۔ کہنے لگے، اس کو تو میں ایسا کھانا کھلاؤں گا کہ یاد رکھے گی۔ اس طرح کے حالات ہوتے ہیں۔ کسی کے خلاف خبر لگ جائے تو لوگ نقصان پہنچانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ کبھی کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنا کوئی میگزین شروع کروں خواتین کے حوالے سے، شاید زندگی میں کبھی کوئی ایسا موقع بن جائے۔ لیکن ابھی سرمائے کے حوالے سے اتنے مضبوط نہیں ہیں کہ ضائع بھی ہو جائے تو برداشت کر سکیں۔

لڑکیوں کے لیے یہی ہے کہ اگر وہ اس فیلڈ میں آنا چاہیں تو سنجیدہ ہو کر آئیں۔ اکثر انٹرنشپ پر لڑکیاں آتی ہیں لیکن وہ ہچکچاہٹ کا شکار رہتی ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ انھیں فیلڈ میں بھیج دیا جائے، چار پانچ لڑکیاں گروپ میں ہی چل پڑتی ہیں۔ ابھی بھی انٹرنشپ پر کچھ لڑکیاں آئی تھیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ جاؤ تا کہ اپنے آپ کو پتا ہو کہ کون سا کام کرنا ہے۔ پہلی دفعہ غلط ہو گا، دوسری دفعہ ہو گا لیکن پھر کام سمجھ میں آجائے گا۔ ایونٹ پر جاؤ، لوگوں سے ملو، وہاں خبر کے ساتھ ساتھ اور چیزیں سیکھنے کو ملیں گی۔

مجھے لوگ کہتے ہیں کہ آپ ہر ایونٹ پر جاتی ہیں، کبھی فون پر بھی خبر لی جا سکتی ہے۔ میں کہتی ہوں کہ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کسی ایک چیز کے لیے جاتے ہیں، وہاں جا کر دس چیزیں اور مل جاتی ہیں۔

آرسی

صوفی جی اور صفیہ کی دل دہلا دینے والی کہانی

عقیدت اور رفاقت کی ہمیشہ ایک قیمت ادا کرنی پڑتی ہے

فنی چابک دستی نے اس کہانی کو ایک نئی جہت عطا کر دی ہے

فرخندہ لودھی

فضا سازگار نہ تھی۔ اس کے قصبے کے لونڈے بھی آزادی حاصل کرنے کے لیے لٹھ لیے پھرتے تھے۔ اگرچہ وہ اس کے مفہوم سے اتنے ہی واقف تھے جتنا

عزیز فوج میں ملازم تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سرکاری ملازمین کو گورنمنٹ آف انڈیا دریا دلی سے رخصتیں عطا کر رہی تھی کہ ملک میں آزادی کی تحریک زور پکڑ گئی۔ ہندو اکھنڈ ہندوستان مانگتے تھے اور مسلمان پاکستان..... سکھ خالصتان کے مطالبے پر اڑے تھے۔ ایسے ہنگامی حالات کے دوران بھی کچھ دل ایسے ہوتے ہیں جو صرف کسی کا ہاتھ اور ساتھ مانگتے ہیں۔ انھیں سیاست اور اقتدار سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ سادگی اور خلوص کا اعتماد لیے پھرتے ہیں، جن کو عرف عام میں رومان کہا جاتا ہے۔

عزیز کی طبیعت ہی کچھ ایسی تھی..... وہ ڈیڑھ سال بعد گھر لوٹا تھا۔ گھر سے دوری نے اس میں سوئے ہوئے کئی احساسات کو جگا دیا تھا۔ اس کے شادی شدہ اور بڑی عمر کے ساتھی، اپنے گھروں سے دور بیرکوں کی غیر رومانی فضا میں اپنی بستیوں اور بیویوں کی باتیں دہراتے۔ عورتوں کے قصے

بتتے..... جانے کیا بات تھی کہ ساری کہانیاں بھول جاتیں۔ صرف عورت یاد رہ جاتی۔ کوئی لڑکی..... کوئی بھی لڑکی جو اس بھری دنیا میں اس کے حصے کی تھی۔

عزیز کو اور باتوں سے قطع نظر نسوانی قرب کے لطیف احساس سے محظوظ ہونے کی تمنا تھی۔ مگر یہاں

کوئی الہڑ عشق کے مراحل اور معاملات سے..... عزیز کا جی چاہتا وہ بھی اسی ریوڑ میں ہوہا کرتا پھرے۔ گھر میں جڑواں بھائی اور بوڑھی ماں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ بھائی اتنا کم گو اور سنجیدہ تھا کہ لوگ اس کا اصل نام بھول گئے اور صوفی جی کہہ کر پکارنے لگے۔ بہنیں؟ بہنیں جب اپنے گھروں میں سکھی ہوں تو انھیں میکا کم ہی یاد آتا ہے..... اس کا گھر سونا تھا، جیسے قبرستان۔ ہاں اس کے ہمسائے میں زندگی کی حرارت تھی۔ صفیہ..... جو ہر وقت چہکتی رہتی۔

صفیہ کی ماں رابعہ عین شباب کے زمانے میں بیوہ ہوئی تو بیٹی کی زندگی بتانے کا بہانہ بنا کر اپنے آپ کو دنیا سے ایسے ہی کاٹ لیا جیسے وہ عورت نہ تھی، انسان ہی نہ تھی..... پھر بیسویں صدی کی دوسری دہائی کا زمانہ..... ابھی بیاہتا عورتوں کی آنکھوں میں بھی حیا اور لحاظ باقی تھا۔ برادری اور عزیز داری کے بندھن ٹوٹے نہ تھے۔

رابعہ سسرال جاتے ہی سہاگ کھو بیٹھی تو سب نے اسے بیک زبان منحوس قرار دے دیا۔ اس نے جوانی میں بیوگی کا غم اٹھایا تھا..... وہ ڈائن، چڑیل، منحوس اور نہ معلوم کیا کیا ہوتے ہوئے بھی ماں تھی اور اسے صفیہ کو پالنا تھا، اس لیے وہ اپنے بھائی اور بھاوج کے گھر کی گاڑی میں ایک ایسا پرزہ بن گئی جس کی اہمیت کو کوئی نہیں سمجھتا۔

قدرت نے رابعہ کو ایسی کافور میں سنی ہوئی مٹی سے بنایا تھا کہ جیتے جی مردہ۔ گوری ایسی جیسے میسے کی بھری ہوئی بوری..... اس میں ہمیشہ سے وہ تمام اوصاف موجود تھے جنھیں لوگ، بیوہ عورتوں میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ موٹا جھوٹا پہننا اور چپ رہنا۔ شادی کے بعد بھی اس کی ذات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوئی یہی وجہ تھی کہ راج سنگھاسن چھن جانے نے اسے زیادہ دیر نہ کلپایا۔ ہاں، یہ تجربہ اسے زیادہ عبادت گزار بنا گیا..... صفیہ کے لیے جو مامتا کا جذبہ تھا، وہ کام کی زیادتی اور وضع داری کے نیچے دبا گھٹی گھٹی سانسیں لیتا رہا۔ رابعہ دن بھر کولھو کے بیل کی طرح چلتی..... اوائل عمر اور تھکن۔ وہ رات کو بستر میں گر کر اتنی گہری نیند سوتی کہ کوئی فکر یا جذباتی الجھن دامن گیر نہ ہو پاتی۔

ماموں کے ٹکڑوں پر پلی صفیہ اتنی جلدی جوان ہوگئی جیسے شور زمین میں کنوار گندل ترو تازہ اور رس بھری۔

ماموں جان کو اپنی فکروں سے فرصت نہ ملتی تھی لیکن جب رات کو رابعہ پیار سے اُسے تھپتھپاتی تو صفیہ کے بدن کے گداز پر سے اس کا ہاتھ پھسل جاتا۔ صفیہ کھچ جاتی۔ ماں ٹھٹھک جاتی۔

انسان اپنی ذات کے شعور سے پہلے ماحول کا ادراک کرتا ہے۔ صفیہ کو ماں کے رویے سے چڑ پیدا ہوتی گئی۔ اسے نک چڑھی ممانی اور بے نیاز ماموں اچھے نہ لگتے تھے۔ اس کا جی چاہتا ان سب کو بھیڑ بکریوں کی طرح اپنے آگے ہانکے اور من مانی کرے۔

صبح اٹھ کر نماز اور تلاوت کی حد تک وہ گھر والوں کا پورا ساتھ دیتی۔ اس کے بعد ماں کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹایا پھر میاں مٹھو اور پالتو بلی سے جب تک جی چاہا باتیں کیں۔ ماں چھوڑ ممانی بی کو سیں، اس کی بلا سے..... وہ اتنی بلند آواز سے باتیں کرتی اور چیختی گویا اپنی ذات کی موجودگی اور بے بسی کا

اعلان کر رہی ہو۔

گھر کے گھٹے ہوئے ماحول میں قید صفیہ نو عمر غزال تھی اور اس کی چیخ پکار غزل۔ عزیز نے یہ پکار سنی اور اس کے دل میں ارمان جاگ اٹھے۔

پھر ہمسائے میں پکوان پک رہا ہو اور بھوک بھی لگی ہو تو ناک اپنے آپ پھڑ پھڑانے لگتی ہے۔

حال دل صفیہ تک پہنچانے کے مختلف وسائل پر غور کیا مگر وہ الہڑ چھوکری جو کہیں کوٹھے پر آئی تو ادھر ایک ہمسائی خالہ کو پکارا، ادھر دوسری ہوا کو للکارا۔ دھڑ دھڑ کرتی سیڑھیاں اتر گئی..... ہر گام ایک ہنگامہ عزیز بے چین رہتا۔

ادھر ہر روز نئی نئی خبریں آنے لگیں۔ کلکتے میں گولی چل گئی۔ بہار میں کئی دکانوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ ملک کے طول و عرض میں ہندو مسلم فساد شروع ہوئے۔ لوگ دبی زبان کے بجائے اب کھلے بندوں ایک دوسرے کی برائی کرتے تھے۔ کون کس کے ساتھ ہے؟ کون کس کا ہے؟

ہندوستان کے باسیوں نے اپنے آپ کو تقسیم کر لیا تھا۔ نوجوان لڑکوں کو جوش اور جواں مردی دکھانے کے مواقع خوب میسر تھے۔ ہر روز شام کے وقت عزیز کا خاموش طبع بھائی چوک کے بیچ کھڑا ہو جاتا اور چھوٹی موٹی تقریر کرتا اور لڑکے ''لے کے رہیں گے پاکستان''، ''مسلم لیگ زندہ باد'' کے نعرے لگاتے، عورتیں بالکونی اور چھتوں سے جھک جھک کر دیکھتیں۔ نوجوان سنا سنا کر دوسری پارٹیوں کو کوستے اور اپنے دلوں میں مسرور رہتے کہ وہ ایک پتہ دو کاج کر رہے ہیں..... ان کی آواز میں ان کی محبوباؤں کے کانوں تک پیغام محبت بن کر پہنچ رہی ہیں اور قومی خدمت بھی ہو رہی ہے۔

عزیز اپنے مکان کے چبوترے پر کھڑا چپ چاپ دیکھا کرتا۔ وہ انگریز کا صرف غلام ہی نہ تھا، ملازم بھی تھا۔ وہ آزادی کا نعرہ لگانے کا مجاز نہیں تھا، مگر وہ گلا پھاڑ کر کہنا چاہتا تھا۔ میری محبوبہ مجھے قید کر لے..... صفیہ کی چلمن کی ہر جنبش کا اسے احساس تھا۔

صفیہ اور عزیز کے مکانوں کے درمیان صرف ایک دیوار تھی جو چھتوں پر جا کر جالی دار رہ گئی تھی۔ ویسے دل کی راہ میں نہ تو چناب حائل ہے نہ جنگل نہ بیلا۔

صفیہ کو گرما کی وہ سہ پہر اب بھی نہیں بھولی..... جب کبھی ہمسائے کی دیوار کا سایہ ڈھلتا ہوا ان کے صحن میں پھیلتا ہے، اس کے ذہن میں اندھیرے اجالے کا کھیل ابھر آتا ہے۔

اماں بیٹھی مسالا پیس رہی تھی، ممانی جان قرآن پر جھکی تلاوت کر رہی تھیں اور وہ بیکار بیٹھی سائے کو صحن میں رینگتے دیکھ رہی تھی کہ مانو مٹکتی جھٹکتی چھت سے نیچے اتری۔ اس کے گلے میں گھنٹی ٹنٹنا رہی تھی..... ممانی دیکھتے ہی چیخیں۔

''دیکھو، صفیہ! اس کے گلے میں کس نے پھندا ڈال دیا؟''

صفیہ پیچھے لپکی تو مانو دوڑ کر دالان میں جا چھپی۔ مانو کے گلے میں پیتل کی نئی گھنٹی ربن سے بندھی تھی۔ گھنٹی کے اندر ایک رقعہ ٹھنسا ہوا تھا۔ صفیہ نے پکڑے ہی کھولا، لکھا تھا:

''ہم نے تو ہمت کر کے بلی کے گلے میں گھنٹی باندھ دی..... تم؟ ہم سب چوہے ہیں ایمان سے..... تمھارا عزیز''

صفیہ رقعہ پڑھ کر جہاں کھڑی تھی کھڑی رہی۔ اماں آوازیں دے رہی تھیں، کیا ہے، کیا ہے صفو؟ وہ تھر تھر کانپتی ماں کے پاس پہنچی اور گھنٹی ان کے سامنے رکھ دی۔ خاموش، سانس اکھڑی ہوئی چوروں کی طرح آنکھیں جھکی تھیں۔ ماں نے گھنٹی پر ایک نظر ڈال کر بھاوج کو اطلاع دی۔

''ہائے ہائے! میری مانو پر کسی کو پیار آ گیا۔''

ممانی قرآن مجید پر جھولتے مڑیں اور صفیہ نہایت سعادت مند ملازمہ کی طرح گھنٹی اٹھا کر ان کے پاس لے گئی اور اپنی نظروں کا سچ قرآن کی سطروں میں چھپا لیا حالانکہ وہ کچھ بھی نہ پڑھ رہی تھی..... ممانی نے کس کس طرح اپنی رائے کا اظہار کیا۔ صفیہ کو کچھ معلوم نہ تھا۔ اس کے کانوں میں گھنٹیاں ٹھنک رہی تھیں۔ کوئی دوسری اسے آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

وہ رات بے خوابی میں گزری اور اس نے زندگی میں پہلی بار صبح کاذب کو صبح صادق میں بدلتے دیکھا..... فضا کے خاموش سینے سے اٹھتی ہوئی ہوکیں۔ مرغوں کی اذانیں، ایک ایک کر کے ڈوبتے تارے اور مشرقی افق سے ابھرتا سویرا..... رات کیا گزری، صفیہ پر ایک زمانہ گزر گیا.....

صبح اٹھی تو اسے ایسا لگا گویا وہ بڑی سیانی ہو گئی ہے اور اس نے دنیا میں قدم رکھ دیا ہے۔

اس کا سر بھاری تھا، جسم تھکا ہوا۔ وہ تازہ ہوا کھانے کے لیے چھت پر چلی گئی..... لوگ ابھی سو کر نہ اٹھے تھے۔ اکا دُکا مرد کھیتوں کی طرف جاتے دھندلے دھندلے دکھائی دیتے تھے۔ دودھ بلونے کی آواز جیسے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ۔ پورا گاؤں گنگنا رہا تھا۔ ایک میٹھا سر۔

''صفیہ.....!''

''سُر لفظ کے سانچے میں ڈھل گیا۔ وہ سیڑھی کی طرف لپکی، ٹھٹکی، مڑ کر دیکھا۔ جھلملیوں کے پیچھے ایک سایہ لرزا اور ایک کنکری اس کے پاؤں میں آ کر گری۔ کنکری کے ساتھ کاغذ کا پرزہ بندھا تھا۔ وہ بہ عجلت سیڑھیاں اتر گئی..... عزیز نے لکھا تھا۔

''صفیہ، صفیہ میں تمھارا ہوں۔''

صفیہ نے بھاگ کر طاقچے میں پڑے ہوئے قرآن مجید کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''اوخدا! میں پاگل ہو جاؤں گی..... میں کیا کروں؟ میں کیا کروں، میرے خدا!'' وہ سوچنے سے زیادہ ہانپتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

محرومیاں محبت کو لازوال بنا دیتی ہیں لیکن اتنا بڑا جگرا سب کا نہیں ہوتا کہ محرومیوں کے مدار پر زندگی گزارے، محبت کا احساس ہوا تو ملاقاتیں بھی شروع ہو گئیں..... جب کبھی موقع ملا، بیچ کی دیوار کے ساتھ کھڑے سرگوشیاں ہوتیں۔ نیند اڑ گئی تھی۔

عزیز پڑھا لکھا تھا۔ فوج کی ملازمت نے اسے آزاد خیال، خودسر اور نڈر بنا دیا۔ وہ ہمیشہ صفیہ سے کہتا ''تم ڈرپوک ہو۔ نری گاؤدی''

صفیہ اس کی برادری کی لڑکی تھی۔ کسی رشتے سے بہن، کسی سے بھانجی یا بھتیجی ہوتی تھی..... عزیز کے لیے اسے حاصل کرنا قطعی مشکل نہ تھا۔

ماں نے صفیہ کے نام کے ساتھ بیٹے کی آنکھ کو گلابی ہوتے دیکھا تو بھانپ گئی۔ دو چار عورتوں نے سر جوڑے۔ پیغام گیا، صفیہ کے ماموں اور ممانی اپنی پڑھی لکھی بیٹی کے لیے آس لگائے بیٹھے تھے۔ سیخ پا تو

ہوئے مگر لڑکے کی پسند کے سامنے ٹھنڈا ہونا پڑا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد دودھ پلا دیا..... بات طے ہوگئی۔

رابعہ کا خیال تھا کہ عقد کر دیا جائے مگر ممانی کہتی تھیں کہ گڈے گڑیا کا کھیل تو نہیں..... ناک کٹ جائے گی۔ سب بچوں کو اسکولوں کالجوں سے فارغ ہو کر آجانے دو۔ تب تک حالات بھی معمول پر آجائیں گے۔

ہنگامی حالات کے تحت عزیز کو فوری طور پر واپس بلا لیا گیا۔ گاؤں میں آج اس کی آخری رات تھی۔ صفیہ سرِ شام چھت پر گئی۔ شفق کے رنگوں نے اس کے دل کو خون کر دیا۔ وہ اداس تھی..... آگ کا سمندر، آسمان، بادلوں کے ٹکڑے، دہکتے انگارے..... پنچھیوں کا آخری جوڑا تھکا ہارا، پرمارتا، خون آشام شام میں گم ہو گیا..... وہ گوش برآواز تھی۔

''یاروں دوستوں سے ملنے چلا گیا ہوگا۔ اک بات پکی ہو جانے سے اتنے بدل گئے۔ اونہہ!''

کئی آنسو منڈیر کی مٹی میں جذب ہو گئے۔ ماں کی آواز پر اسے نیچے جانا پڑا۔ جب چوکیدار کی صدا کے سوا گاؤں کی ساری آوازیں سو گئیں تو وہ ایک بار پھر اوپر گئی۔

''صفیہ.....!''

سرگوشی ہوئی۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد وہ عزیز کی چھت پر کود گئی۔

نیند سے چونک کر بیدار ہوئی تو دن کے چھ بج چکے تھے۔ صفیہ کو پچھتاوا تھا کہ اس نے عزیز کو رخصت ہوتے ہوئے کیوں نہ دیکھا..... وہ جو اتنی دور چلا گیا ہے..... بہت دور..... گاڑی کو چھوٹے ایک گھنٹہ..... ایک صدی بیت چکی ہے۔ اس ایک صدی کے اس طرف ایک اور زمانہ شروع ہو چکا ہے۔

دن اگرچہ ہجر کے تھے مگر گزر رہے تھے۔ صفیہ کا جی چاہتا، ان بھاگتے دنوں کو پکڑ کر باندھ دے..... عزیز کی ماں کہتی تھی اس کا کوئی اتا پتا نہیں ملتا۔ نامعلوم وہ ہندوستان میں تھا یا اس کی رجمنٹ کو باہر بھیج دیا گیا تھا۔ ایک ماہ دو..... تیسرا بھی گزر گیا۔ صفیہ کا جی ماندہ ماندہ رہنے لگا..... ماموں کی بیٹیاں چھٹیوں میں گھر آگئی تھیں۔ رونق تھی مگر اس کا جی نہ لگتا۔

آخر ڈرتے ڈرتے صفیہ نے رابعہ سے ایک بات پوچھی..... تو یہ ایک بات ہی ماں کے پندار کے خرمن کو سلگانے کے لیے کافی تھی..... وہ جو صرف ذہنی مریض تھی، جسمانی مریض بھی ہو گئی..... وہ بھاوج سے کیسے کہہ دے کہ اس کا ایک ہی علاج ہے۔ عزیز کو بلاؤ اور صفیہ کو چلتا کرو۔ حالات مخدوش ہیں۔ دنیا کیا کہے گی۔ برادری کیا کہے گی۔ رابعہ ہر وقت صفیہ سے کہتی رہتی۔

''تجھے نفس نے مار دیا، تو ڈائن ہے۔ ڈائن کا نفس آگ سے بھرتا ہے۔'' کئی روز تک ماں بیٹی کی بول چال بند رہی..... رابعہ کے من میں جو شے بھوت بن کر بیٹھی تھی، وہ صفیہ کے بطن میں جان بن کر خون چوس رہی تھی۔

صفیہ بلک بلک کر روتی۔ اوپر سے ملک کے حالات ناگفتہ بہ ہوتے جاتے تھے۔

انہی دنوں عزیز کا خط آیا تو ماں بیٹی کو تسلی ہوئی۔

رابعہ نے جواباً پوری حقیقت لکھ بھیجی اور کئی روز تک جواب کا انتظار کیا۔ وہ ایک اور خط ارسال کرنے کا سوچ رہی تھی کہ عزیز کی ماں آ کر کہہ گئی کہ لڑکی کا کہیں اور بندوبست کرلو۔ میرے لڑکے نے جواب دے دیا ہے۔

اس روز نند بھاوج کی خوب جنگ ہوئی۔ رابعہ نے اپنا سارا غصہ صفیہ پر ٹھنڈا کیا۔ صفیہ کو اپنی ذات سے نفرت ہوگئی..... اور عزیز؟..... وہ اتنی سیدھی کیوں بن گئی۔ آخر وہ عزیز کی چھت پر گئی ہی کیوں؟

اتنے دکھوں کے سامنے مرنے کی جسارت صفیہ میں نہ تھی کہ کچھ کھا کر سو رہے وہ مرنا چاہتی تھی مگر مر نہ سکی، موت کے منہ سے لوٹ آئی۔

عزیز کی ماں ساری برادری میں کہتی پھرتی کہ چڑیل میرے بیٹے کا نام دھرتی ہے اور اس کا بیٹا۔ گندی نالی میں گرتے گرتے بچا ہے..... اور یہ ماں بیٹی حرافہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔

رابعہ کی اندھیری زندگی میں روشنی کی وہ کرن بھی بجھ گئی جو صفیہ کی صورت میں زندہ تھی۔ اپنے حال اور مستقبل کو ماضی کی جھولی میں ڈال کر وہ اس طرح بے فکر ہوگئی گویا صفیہ اس کی ذمہ داری نہیں، دنیا کی تھی..... جیسے چاہے رکھے۔ شکست سے زیادہ شکست خوردگی کا احساس تباہ کن ہے۔

رابعہ تو جی ہی چھوڑ بیٹھی اور صفیہ کے ہر دے کا داغ نہ آنسوؤں سے دھلتا تھا نہ گھر بھر کی چاکری کرنے سے۔

نئی شخصیت بننے کے لیے ایک تلخ تجربہ یا حادثہ کافی ہے جو پہلی عمارت کی بنیاد کو اکھاڑ کر رکھ دے۔ صفیہ غیر معمولی سنجیدہ ہوگئی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آتے آتے رک جاتی۔ آنکھیں اٹھتے جھک جاتیں..... اس نے اپنے طور بیراگ لے لیا مگر اس کا گناہ معاف کرنے کو کوئی بھی تیار نہ تھا کہ حتیٰ کہ اس کی ماں بھی۔ اس کا جی اکثر چاہتا کہ ماں سے کہے۔

''ماں اب میں نے نفس کو مار دیا ہے..... مجھ کو شاباش دو، ماں.....''

لیکن اتنا کہنے کا یارا کہاں؟ گناہ کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ صفیہ کی سانسیں ہی اکھڑی رہیں اور ہر خواہش دم توڑ گئی۔

ادھر رابعہ مری اور ادھر ملک تقسیم ہوگیا۔ افراتفری کا زمانہ تھا۔ ماموں میاں نوکری چھوڑ سیاست دان بن گئے اور خوب خوب ہاتھ رنگے۔

بیٹیوں کی شادیاں بڑے بڑے اہلکاروں کے ساتھ ہوگئیں۔ بیٹے کا بیوپار، پاکستان میں شرق تا غرب پھیلا تھا۔ اب ممانی جان کو گھریلو زندگی نہ بھاتی تھی۔ وہ کبھی ایک جگہ ٹک کر نہ رہیں۔ آج ایک بیٹی کی مہمان تو کل دوسری کی۔ ماموں اپنی سیاست کے کاموں میں لگے رہتے۔ اب صفیہ اپنے آپ کو بیکار سمجھتی تھی۔ ایک ماموں کی روٹی پکانا بھی بھلا کوئی کام تھا۔ گھر میں جی نہ لگتا تو برقعہ اوڑھ کبھی اس رشتہ دار کی طرف چلی گئی کبھی اس واقف کار کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ دنیا بدل گئی مگر صفیہ کی تقدیر نہ بدلی وہ اسی طرح لوگوں کے در سے سکون کی بھیک مانگ رہی تھی۔

عزیز کی شادی مالدار گھرانے میں ہوئی اور وہ بیوی بچوں کے ساتھ سسرال میں خوش و خرم زندگی بسر کر رہا تھا۔ عزیز کی ماں کا اجداد کے گھر میں نہ

معلوم کیا گزارہ گیا تھا کہ وہ رو رو کر اندھی ہوگئی۔ اسے عزیز کی نئی زندگی سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صوفی جی کے پاس رہنا پسند کرتی تھی۔ صوفی جی شروع سے نکھٹو اور گھر گھسو تھے اور زیادہ تنہائی پسند ہو گئے۔ انھیں اپنے بھائی سے توقعات تھیں کہ وہ نان نفقے کے سلسلے میں ان کی پوری مدد کرے گا مگر کہاں؟ گزر اوقات مشکل سے ہوتی تھی۔

صوفی جی کا دل دنیا سے ایسا اچاٹ ہوا کہ وہ اکثر بیٹھے بیٹھے کھو جاتے اور کبھی کیف و مستی کے دور آتے۔ ہنستے ہنستے روتے اور روتے روتے قہقہے لگانے لگتے۔

کہتے ہیں کہ جس نے چونچ کا روگ دیا وہ چارہ بھی ہے۔ صوفی جی نے اپنے نئے رویے سے کئی دل جیت لیے ان کی اقلیم میں روز بروز اضافہ ہونے لگا اور کسی چیز کی کمی نہ رہی۔

صوفی جی کو ماں کے سوا سب عورتوں سے نفرت تھی۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ زیادہ عورتیں ہی ان کی معتقد تھیں۔ وہ بہت کہتے میرے پاس مت آؤ۔ پر مرادوں والیا جوگی کے جوگ سے مایوس نہیں لوٹتا چاہے وہ لاکھ کوسے اور بُرا کہے۔

ان کی شہرت صفیہ کو بھی کھینچ لائی..... وہ اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ اپنے بھائی کی زیادتی کی معافی مانگی۔ سر پر ہاتھ پھیرتے اور روتے رہے۔ صفیہ ان کے ساتھ میں کھڑی آنسو بہاتی رہی اور ان کے آنسوؤں کے ساتھ گزشتہ زندگی کی ساری صعوبتیں جو اس نے عزیز کی وجہ سے سہی تھیں ہولے ہولے بہہ گئیں اور صفیہ کا جی ایسا ہلکا ہوگیا جیسے اس نے سب کو ایک بارگی معاف کر دیا ہو۔ اسے اس وقت شرم تھی نہ گھبراہٹ بلکہ وہ سوالیہ نگاہوں سے صوفی جی کو دیکھ رہی تھی۔

دیکھ! میں نے زندگی کی بازی ہار دی اور تیرے بھائی کو معاف کر دیا۔ اب میرے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی ہے..... تو جذب کی کیفیت سے ابھر اور میرے دل کی وسعت کو دیکھ کر بتا کہ میرے خدا نے مجھے معاف کیا یا نہیں.....؟

''بتاؤں گا..... بتاؤں گا۔''

وہ ہمیشہ یہی مختصر سا جواب دیتے اور صفیہ اپنے سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ان کی خدمت میں رہنے لگی۔ شاید..... شاید گم شدہ سکون کا سراغ مل جائے۔ اس طرح مرید عورتوں کا مسئلہ بھی حل ہوگیا۔

عزیز ایک بار ماں اور بھائی سے ملنے کے لیے آیا تو صفیہ کا دل ایک عجیب تڑپ کے ساتھ مچلا..... اس کے چہرے پر وہ چڑھتی جوانی کی چمک نہ تھی۔ وہ پہلا سا منچلا عزیز کہاں تھا؟ اور وہ پہلی سی ڈرپوک صفیہ؟

اس نے دلیرانہ سلام کیا۔ عزیز اچٹتی نظر ڈال کر نکل گیا۔ جرم و سزا کے مخمصے میں پڑی صفیہ نے رات کو اٹھ کر صوفی جی سے پوچھا کہ ''کیا جرم اور جنم کا ساتھ ازل سے ابد تک ہے؟ کیا جرم سب کچھ ہے صوفی جی، جینا کچھ بھی نہیں؟ کیا ہم جرم و سزا کے لیے پیدا کیے گئے اور مارے گئے؟''

پھر پیدا ہوں گے اور مارے جائیں گے؟ پھر پیدا ہوں گے..... اور.....

عزیز کے لیے اس کے دل میں نفرت تھی۔ اس یاد میں گندھی جب اس نے پہلی بار محبت کی فضا میں

سانس لیا تھا، مسرت کا دھارا ہر سرمو سے بہہ نکلا تھا۔ اب ہر رواں ایک گھاؤ تھا۔ ہر ٹیس پر خدا یاد آتا تھا..... یہ کیسی نفرت تھی..... ''عزیز مجھے معاف کر دو۔'' لیکن وہ تو خود اس کا مجرم تھا۔

عزیز کے رویے کا ذکر صفیہ نے صوفی جی سے کیا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنسے اور ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ پھر جذب کی کیفیت طاری ہوئی۔ یہ کیفیت تسلسل اور طوالت اختیار کر گئی۔ وہ ایک کمرے میں بند ہو گئے۔ معتقدین جوق در جوق آتے مگر وہ کسی سے بھی گفتگو کرنا پسند نہ کرتے تھے بعض اوقات ان کی ضروریات کی چیزوں کے لیے بھی ان سے کئی کئی دن تقاضے کرنے پڑتے۔

صفیہ کچھ کھلاتی تو کھا لیتے۔ کچھ کہنا ہوتا تو اسی سے کہتے۔ ذرا کسی اور کام میں لگی یا نظروں سے اوجھل ہوئی، بے چین ہو کر آوازیں دیتے۔ وہ ان کے اس رویے سے بڑی خوش تھی کہ وہ بھائی کے ظلم کا بدلہ چکا رہے ہیں اور اس کے دل سے اس داغ کو دھو دینا چاہتے ہیں۔

صفیہ، جسے سب نے روند دیا، وہ اسے سب سے افضل سمجھتے ہیں یہ سلوک ان کی بزرگی اور عظمت کی دلیل ہے۔ پھر اس خیال سے مطمئن کہ خدا نے اسے جس کام اور مقام کے لیے چنا تھا۔ اس کے لیے مشکلات اور آزمائشیں لازمی تھیں جو اس نے سہہ لی ہیں۔

صفیہ کے ساتھ عزیز کی نئی بے رخی کا واقعہ تو محض بہانہ بن گیا..... صوفی کی طبیعت سنبھلتی ہی نہ تھی۔ دن کچھ، رات کچھ، عقیدت مندوں کا میلہ لگا رہتا مگر کیا مجال کوئی کھڑکی میں جھانک بھی جائے۔ سارے پیغامات صفیہ کی وساطت سے آتے جاتے۔ اس کے دل میں عقیدت، انس اور رفاقت سب یکجا کیے ہوئے تھے۔ اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ خدانخواستہ جو کہیں صوفی جی کو کچھ ہو گیا تو اس کا کیا بنے گا۔ صفیہ کو اتنا اہم مرتبہ پہلے کب نصیب ہوا تھا۔

سرما کی رات کا پچھلا پہر، کڑاکے کی سردی، صوفی جی کے کمرے کی کھلی کھڑکی میں روشنی کانپ رہی تھی، جیسے کوئی دیا لے کر چل رہا ہو..... صفیہ کی نظر پڑی تو وہ چونک کر اٹھی اور ان کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

وہ زمین پر پڑے خراٹے لے رہے تھے۔ پاؤں کی آہٹ سن کر آنکھیں کھولیں۔ صفیہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''صفیہ.....!''

''جی.....''

''میرے پاس آؤ.....''

وہ جھکی، ان کی سانسیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ صفیہ نے ان کا ٹھنڈا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا۔ وہ کراہے۔

''صفیہ! تم نے عزیز کو معاف کر دیا؟''

''جی.....''

''اس رات..... وہ عزیز نہ تھا، میں تھا، صفو۔''

صفیہ چیختی چلاتی باہر نکل گئی..... صوفی جی نے جانے کب آخری سانس لی۔ پاگل صفیہ کو دیکھ کر لوگوں کو پکا یقین ہے کہ صوفی جی اس کا بیڑا پار کر گئے۔

.....

(فرخندہ لودھی، اُردو کی ممتاز کہانی کار اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ایک ہی چونکا دینے والی تحریروں سے سجے ہیں)

جب بھری برسات میں دونوں میاں بیوی ''چک لدھا'' سے روانہ ہوئے تو دوپہر ڈھل چکی تھی اور کالے سیاہ بادلوں نے آسمان پہ تنبو تان کے پانیوں سے بھرے سمندر کے آگے پرنالا باندھ دیا تھا۔ دونوں نے لانگڑ کھینچ کے تہبند پنڈلیوں سے اوپر تک اُڑسے اور ایڑیوں کی پھٹی بوائیاں کمائے چمڑے کی گہری براؤن گرگابیوں میں یوں پھنسا لیں۔ جیسے بدصورت دلہن گھونگھٹ کی اوٹ میں وقتی طور پر اپنا چہرہ چھپا لیتی ہے۔

جب وہ پنڈ سے باہر نکلے والے موڑ پہ پہنچے تو کچی پکی اینٹوں کے سولنگ سے ٹخنوں برابر پانی شڑاپ شڑاپ گزر رہا تھا اور اس کے کیچڑ زدہ گدلے رنگ میں کسی اینٹوں کی رہند کھوند بھی نظر نہ آتی تھی۔

سرداراں اور غلام علی پچھلے تیس سال سے میاں بیوی تھے۔ دونوں ساتھ ساتھ اُگے درختوں کی طرح دھوپ چھاؤں، سردی، گرمی اور نیکی بدی میں ایک دوجے کے حصہ دار تھے۔ ان کی خوشی غمی، دکھ سکھ اولاد کی طرح سانجھے تھے۔ اتنے عرصے کے ساتھ کا اعجاز تھا کہ تو اُم بچوں کی طرح دونوں کی عادتیں بھی ملنے جلنے لگی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کے دل کی بات بن کہے یوں سمجھ جاتے تھے۔ جیسے شیشے کے جگ میں پانی ڈالو تو دونوں اک مک ہو جاتے ہیں۔ پر رہتے الگ الگ ہیں۔

ہاں تو دونوں جب پنڈ سے باہر نکلے والے موڑ پہ پہنچے تو پانی سڑک کے اوپر سے شڑاپ شڑاپ گزر رہا تھا اور یوں آس پاس کھڑی فصلوں والے کھیتوں میں ننھے منے پودے کلر کے ناگوں کی طرح جھوم رہے تھے۔

کھیتوں کے مشرقی سرے پر صدیق کا خچر آنکھوں پہ پوپٹ جمائے کھڑا تھا اور اس کے صحت مند جثے کے پیچھے جتے تانگے کی پلاسٹک مڑھی پھسلواں سیٹ کے کونے میں دبکا صدیق کھل بنولے کی مُڑی تڑی بوری کی طرح دھرا تھا۔ اس نے خاکستری چادر سے

مورکھا

ایک اتھرے بھائی کا ماجرا
اسے معاملہ نمٹانے کی بہت جلدی تھی

نجمہ ثاقب

اپنا وجود لپیٹ رکھا تھا۔ اوپر کے دھڑ کو سر سمیت گھٹنوں میں میخا ہوا تھا۔

غلام علی نے اللہ کا نام لے کر پائیدان پہ قدم رکھا اور سرداراں سے مخاطب ہو کے بولا، ''میں نہ کہتا تھا! کوئی نہ کوئی سفر کا آسرا ملے گا ضرور۔ گھر سے نکل پڑو تو اللہ راستے کھول دیتا ہے۔''

سرداراں نے دونوں ہاتھوں سے فاختہ کے پروں جیسی سلیٹی چادر کی بکل سمیٹی اور تانگے کے پچھلے حصے پر چڑھتے ہوئے بولی، ''اس صدیقے نمانے کو دیکھو! وے نکڑ میاں اس کالی گھور رُت میں ٹپ ٹپ تلے بیٹھے ہو؟ پانی نے پنڈا پکڑ لیا تو چار دن چارپائی سے نہ اٹھ سکو گے۔''

صدیق نے کندھوں سے چادر پرے سرکائی اور چابک سیدھی کرتے ہوئے خچر کی باچھوں میں گڑے فولادی چھلّوں میں پروئی چرمی باگ کو کھینچا۔ مالک کی حرکت سے اس کے جھوٹے پڑتے وجود نے بجلی کی سی پھریری لی۔ اس نے ایک جھٹکے سے قدم اٹھائے اور پانی میں رہوار چلنے لگی۔

صدیق نے اپنے جھکورے کھاتے جسم کو سیٹ پر ٹکایا اور بولا، ''میں یہاں نہ بیٹھا ہوتا تو تُو سفر کیسے کرتی ماسی؟ اور میں اپنے پیسے کیسے کھرے کرتا؟ سب روزی روٹی کے وسیلے ہیں۔''

غلام علی سڑک کے دائیں بائیں دور دور تک پھیلے کھیتوں کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں بارانی پانیوں نے کھیتوں کو بھر دیا تھا اور تواتر سے اترتی بوندوں نے نظروں کے سامنے جالا سا باندھ دیا تھا۔

بڑی ظالم بارش ہے۔ آگے ایک دو پہر تک نہ رکی تو فصلیں لیٹ جائیں گی۔

غلام علی نے کہا، جمعرات کی جھڑی ہے چودھریا!

صدیق نے ایک ہاتھ سے باگ کھینچتے اور دوسرے سے منہ سر لپیٹتے ہوئے کہا۔ ہفتہ دس دن سے پہلے نہیں رکنے والی۔ اللہ بخشے میری بے بے کہا کرتی تھی، جمعرات کی جھڑی ہو یا قتل کی آندھی، دونوں آسمان کو اوندھا دیتی ہیں او تیری خیر ہو۔ خچر کا پاؤں پانی میں چھپے کسی اجنبی گڑھے میں پڑا تھا۔ تانگہ ایک ٹانپے کے لیے ڈگمگایا۔ پھر اپنی گزشتہ پوزیشن میں آ گیا۔ تانگے کی ڈگمگاہٹ سے نیچے سرکتے وجود کو نشست پر جماتے ہوئے سرداراں بولی:

تمہاری بے بے بھی حقی سچی ہے۔ تقسیم کا بلوہ اس نے دیکھا ہے۔ پنڈاروں کے منڈوے پہ ہونے والے فسادوں کی وہ گواہ ہے اور منڈی کٹے افضل کے ہاتھوں نمبر داروں کی عورت کا قتل تو اس کے سامنے ہوا تھا۔

غلام علی نے خچر کی کمانچہ بنی گردن کی سیدھ میں دیکھتے صدیق کے کندھے پہ ہاتھ مارا اور کہا:

افضل کے سے جی دار بھی ماؤں نے کم کم جنے ہیں۔ تقسیم کی رات جب جتھہ داروں نے افضل کے پردے میں برچھا مارا تو اس کی منڈی کٹ کر اس کے کندھے پہ لٹک گئی اور لہو نے اُبل اُبل کر اس کے کپڑے اور زمین ایک رنگ کے کر دیئے۔

صدیق نے اپنے منہ پر ہاکا سا چانٹا رسید کرتے ہوئے کہا:

اللہ نے اس کی سانسیں رکھی تھیں۔ ورنہ پریوں نے اسے مارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

غلام علی نے افضل پہ گزری خونی رات کے تصور کو جرعہ جرعہ پیتے ہوئے کہا: جب سکھ مردہ جان کر چھوڑ گئے تو اس نے ہمت پکڑی اور قطرہ قطرہ موت ٹپکاتی گردن کو سپید پڑتے ہاتھوں سے تھام کر کندھے پہ رکھا

اور لہو رنگی چادر سے کس کے باندھ دیا۔ پھر وہ ڈگ مگ کرتے قدموں پہ چلتا جوگندر سنگھ کی چوکھٹ پہ جا کے گرا تو جوگندر سیاں نے اسے بھڑولے میں ڈال کر دروازہ بھیڑ دیا۔ خود لہو میں ڈوبی کرپان لے کر دروازے پہ بیٹھ کے بڑھکیں مارنے لگا۔

تانگہ اب پانی کے تالاب سے نکل کر گیلی سڑک پہ آ گیا تھا۔ تیز بارش معمولی رم جھم میں بدل گئی تھی۔

غلام علی بولا: ''پورا ایک مہینا افضل نے اپنے بیلی کے گھر چکنی مرہم لگواتے کڑوی پھکی معجونیں چاٹتے اور چینی ہر دل کی دھونیاں لیتے گزارا۔ جب ملٹری کے ٹرک پہ عورتوں، بچوں اور زخمیوں کے جمگھٹے میں سوار ہو کے وہ والٹن کیمپ اُترا تو اس کی موڈھی صحیح سلامت کندھے پہ دھری تھی۔ اس کی موٹی گردن پہ ہاتھ برابر زخم کا نشان ابھی کچا پکا تھا۔

صدیق نے بے اختیار ہو کر جھرجھری لی اور خچر کے جانگھوں پہ چابک رسید کرتے ہوئے بولا: ''اللہ بخشے میری بے بے کہا کرتی تھی۔ گردن کا نشان ساری زندگی افضل کی شناخت بنا رہا۔ جب اس نے نمبرداروں کی عورت پہ ہاتھ ڈالا تو اسی نشان کو دیکھ کر اس نے دہائی دی۔ جب افضل نے طیش میں آ کر اس کا گلا گھونٹ ڈالا۔''

سرداراں بولی: ''نمبر داروں کی اس عورت کا نام سلمٰی تھا۔''

غلام علی نے کہا: ''ایسی ہی برسات تھی۔ ایسے ہی پانی نے زمین آسمان ایک کر رکھا تھا۔ دن کی روشنی کو اندھیرے نے نگل لیا تھا۔ جب سلمٰی اپنے ڈیرے سے نکلی۔ اس کا معذور باپ آخری دموں پہ تھا۔ اس کے بال سلمٰی کی ضعیف ماں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ اس نے کمر کسی اور بن پہ بن پھلانگتی وہاں پہنچ گئی۔ جہاں بانس کے درختوں نے جنگل سا بنا دیا ہے۔ اُدھر افضل اپنے جانوروں کے لیے بھوسہ لاد کے لے جا رہا تھا۔ اس نے سلمٰی کا پیچھا کیا اور اسے بیچ کھیت کے دھر لیا۔

توبہ! توبہ!..... پچھلی سیٹ پر سرداراں نے اپنے کلّے پیٹ ڈالے۔

غلام علی پھر بولا: ''خیر سلمٰی بھی اُکل کھری زنانی تھی۔ مکّہ مار کے اگلے کا جبڑا توڑ دیتی تھی۔ اس نے افضل کی گردن پہ اپنے دانت گاڑ دیے۔ جب وہ بلبلا کر پیچھے ہٹا تو سلمٰی نے جھپٹ مار کر اس کا ڈھاٹا ہٹا دیا۔ اللہ جانے اب اُدھر سے کوئی گزر رہا تھا۔ یا سلمٰی کی دہائیاں سن کر آسے پاسے سے لوگ جمع ہوئے۔ ان کے آتے ہی افضل بھاگ گیا اور سلمٰی نے دو چار منٹوں میں جان دے دی۔

ماحول پہ عجیب دم گھونٹتی افسردگی چھا گئی اور سڑک خچر کے سموں کی ٹخ ٹخ سے گونجنے لگی۔

خیر افضل پکڑا تو گیا تھا۔ صدیق نے خاموشی کو توڑا۔

غلام علی نے کہا، ''پکڑا بھی گیا تھا اور اسے سزا بھی ہو گئی۔ مگر پھر دونوں پارٹیوں نے صلح کر لی۔ افضل کے چچا نے اپنی دو بیٹیاں مخالف پارٹی کو بیاہ دیں۔ افضل چھوٹ کے گھر آ گیا اور ٹھیک پانچ سال بعد ایک روز اپنی ہی چارپائی پہ لیٹا لیٹا مر گیا۔

تانگہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔

سرداراں نے اللہ کا نام لے کر پائیدان پہ پاؤں رکھا اور بولی: ''اگر دیکھو تو یہ بھی ایک زیادتی تھی۔ افضل کی دونوں چچا زاد بہنیں ایک مدت تک دشمنوں کے گھر میں پستی رہیں۔ ان کی زندگی مُردوں سے بھی بدتر تھی۔ ان کی ماں اکثر ان کے غم میں روتی ملتی تھی۔ مگر اسے

ان کی ماں اکثر ان کے غم میں روتی ملتی تھی۔ مگر اسے ان سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔

غلام علی نے چادر کے اندر ہاتھ ڈال کے داہنے پہلو میں بنی جیب سے کرایہ نکال کر صدیق کو تھمایا اور بولا، ''زیادتی خیر ہوئی تھی۔ مگر یہ ہمارے وڈکوں، پرکھوں سے ہوتا آیا ہے۔ بھائیوں کی گرتی پگڑیوں کو بہنیں ہی سہارتی ہیں۔''

یہ تو ہے..... یہ تو ہے..... صدیق نے سر ہلا کر مانی ہوئی حقیقت کی طرح اسے قبول کیا اور تانگہ واپس اسی سڑک پہ موڑ لیا۔ جدھر سے آیا تھا۔ غلام علی اور سرداراں دس، پندرہ منٹ تک آگے پیچھے پیدل چلے۔ پھر کتھئی روغن اور روپہلے کوکوں والے لکڑی کے اونچی چوکھٹ والے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ اندر لمبوترے صحن میں پانی کا خود کار نل کھلا تھا اور گدلا گدلا پانی تیل وانس جیسی تنگ موری سے بہہ بہہ کر صحن میں کیچڑ بنا رہا تھا۔ اسی کیچڑ کے بیچوں بیچ بچھی الانی چارپائی پہ سرداراں کی اماں دونوں پاؤں اوپر دھر کے بیٹھی تھی۔ سراہندی پوائدی مٹر کے دانوں کی طرح بکھری مرغیوں کو ہشت ہشت بھگا رہی تھی۔

بیٹی اور اس کے پیچھے داماد کو دیکھ کر اس کا دل بھیگی روئی کی طرح بوجھل ہو گیا۔

مگر اندر مچتی کھڑ دنبی پہ مسکراہٹ کا جھانپڑ مار کے بولی، ''جی آیانوں! خیر نال آئے ہو؟''

پھر ٹھنڈے ٹھار لہجے میں دانستہ بھپارہ دیتی چائے کی سی گرمی پیدا کرتے ہوئے بولی، مینہ اور ہوا نے اتھری سے اتھری مخلوق کو اندر باندھ رکھا ہے۔ تم دونوں کیسے نکل آئے؟

سرداراں نے غلام علی کو دیکھا۔ دونوں کی نگاہوں نے چقماق رگڑا اور غلام علی کے لہجے کو چنگاری چنگاری کر ڈالا۔

میں نے بھاانور کو بتایا تھا کہ ہم جمعرات کو آئیں گے اور اس پھیرے میں مُک مُکا کر کے ہی جائیں گے۔

سرداراں کی ماں کے اندر پریشر ککر کی سیٹی بجنے لگی۔ وہ خوف اور اندیشوں کے درمیان یوں گھر گئی، جیسے جنگلی چوپایہ شکاری کتوں کے نرغے میں پھنس جاتا ہے۔

پسند ناپسند

محمد بن عبداللہ العتبی جو اخبار و روایات زیادہ بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ''میں نے ایک عورت دیکھی جس کی صورت مجھے پسند آئی ہے۔ میں نے اس سے کہا: ''کیا تیرا شوہر ہے؟'' عورت نے کہا ''نہیں۔'' میں نے پوچھا ''مجھ سے شادی کرو گی؟'' عورت بولی ''ہاں، مگر مجھ میں ایک ایسی چیز ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ اسے پسند نہیں کریں گے۔'' میں نے دریافت کیا ''وہ کیا ہے؟'' عورت نے جواب دیا ''میرے سر کے بال سفید ہیں۔'' میں نے گھوڑے کی لگام موڑی اور تھوڑا سا چلا تھا کہ پیچھے سے اس نے آواز دی اور کہا ''میں تجھے قسم دے کر کہتی ہوں رک جاؤ! پھر وہ ویرانے پر آئی اور سر سے کپڑا اتار کر بال ہوا میں لہرائے تو وہ انگور کے کالے گچھے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ کہنے لگی ''بہ خدا! میری عمر بیس برس بھی نہیں ہوئی لیکن میں تجھے بتانا چاہتی ہوں کہ تمھیں ہماری جو چیز ناپسند ہے وہ ہمیں بھی ناپسند ہے۔''

عتبی کہتے ہیں ''مجھے بڑی شرمندگی ہوئی چنانچہ میں چلتا رہا اور کہتا رہا ''میں چاپلوسی کر کے محبوبہ کے وصال کا طلب گار تھا مگر میرا بڑھاپا مجھے اشارہ دیتا رہا کہ ایسا نہ کرنا۔''

(متعۃ الادیب، از الخطیب)

غلام علی پتر! اس نے بھپ بھپ کرتی بھاپ کو دھیرے دھیرے نکلنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا، کیوں آگ کے شعلوں کو ہوا دیتے ہو؟ اچھا یہی ہے کہ بھڑکنے سے پہلے اس پہ پانی ڈال دو۔ ورنہ سب سواہ ہو جائے گا۔

تو ٹھیک ہے اماں! آپ انور سے کہیں سرداراں کا حصہ سیدھے ہاتھ میرے حوالے کر دے۔ ہمارا اس کا جھگڑا ختم.....

سامنے پلیٹ فارم کی طرح لمبے اور صحن کی سطح سے اونچے برآمدے میں تازہ وارنش پھرے دروازے سے انور شرمن ٹینک کی طرح نمودار ہوا۔ سالے کے تیور دیکھ کے غلام علی نے اٹھتے اشتعال کا گھونٹ ایک ہی ڈیک میں اندر اتارا اور سواگت کو آگے بڑھا۔

انور نے جھٹک کر اس کا ہاتھ پرے کیا۔ پیر سے باہر کو ڈھلکاتے ہوئے بولا، ''میں نے تمھیں کہا تھا لالہ! سو بار آؤ! جم جم آؤ! پر اس واسطے دوبارہ نہ آنا۔''

واجی واہ! غلام علی بولا، ''اس واسطے کیسے نہ آؤں؟ اپنا حق چھوڑ دوں؟ ہاں!

دونوں کی تُو تُو میں میں گرم ہوئی۔

تو اماں کا وجود بیٹھے بیٹھے بے جڑ کے پودے کی طرح ڈولا۔ وہ سینے پر دو ہتڑ جما کے بولی: ''ہائے میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ شیر علی کی اولاد انچ انچ زمین پیچھے مر رہی ہے۔ اے سرداراں تم ہی کچھ بولو، کھڑی کیا تک رہی ہو۔''

سرداراں کے وجود میں خفیف سی حرکت ہوئی۔ مگر وہ منہ میٹی کھڑی رہی۔

انور نے ماں کا واویلا نظر انداز کر دیا اور بولا: ''کونسا حق اور کیسا حق؟ بہن کا حق بیاہتے وقت جہیز کی صورت میں بیاج سمیت دے دیا تھا۔ اب کس حق کی بات کرتے ہو؟''

تت تت! غلام علی چمک کے بولے، ''وہی حق جو سرداراں کا باپ کی وراثت میں بنتا ہے۔''

انور ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا۔ اس نے غور سے سرداراں کو دیکھا۔ مڑا اور نپے تلے قدموں پر چلتا اندر کمرے میں چلا گیا۔ یک ثانیے بعد اسی رفتار سے واپس آیا تو اس کا چہرہ چٹان بنا ہوا تھا اور دانت آپس میں لپٹی دو سانگیوں کی طرح بھینچے ہوئے تھے۔

حق اس کے ہونے سے ہے ناں؟ اس نے بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی سرداراں کی طرف اٹھائی۔ اور دائیں ہاتھ میں پکڑے پسٹل سے ٹھائیں ٹھائیں فائر کھول دیا۔

سرداراں شکستہ برتن کی طرح چیخی اور کھڑے پیر سیدھی نیچے جا گری۔ مرغیاں پھڑ پھڑ دروازے سے باہر بھاگیں۔ نیچے بکھرا گدلا پانی کچ لہو بن کے کیچڑ میں پھیل گیا۔ فضا میں عاشورہ محرم کی سوگواریت چھا گئی اور سرداراں کا ٹھنڈا پڑتا وجود ایک دم ساکت ہو گیا۔

کسی انہونی کے وہم میں گم صم غلام علی ڈراؤنے خواب سے جاگے بچے کی طرح اس کی طرف بڑھا، بے بے نے پچھاڑ کھا کر ایک نظر پیلے پڑتے انور کو دیکھا اور دوسری نگاہ غلام علی پر ڈال کے بولی!

''مورکھا! کبھی بہنوں نے بھی حصے مانگے ہیں۔''

انسان کی موت

کچھ لوگ زندگی گزارتے ہیں مگر کچھ لوگوں کو خود زندگی گزارتی ہے، دونوں کے لیے اذیتیں کم نہیں ہوتیں

فکر تونسوی

شہر کے
سب سے بڑے اور بارونق پُل پر
ایک انسان کی لاش پڑی ہے۔ وہ ابھی
دس منٹ پہلے مرا ہے۔ اُس نے دانائی یہ برتی کہ پُل کے فٹ پاتھ پر مرا ہے۔ اگر وہ پل کے عین درمیان مرتا تو ٹریفک رُک جاتی اور آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی..... مرنے والے زندہ رہنے والوں سے زیادہ ذمّے دار انسان ہوتے ہیں۔

''ارے!.... یہ تو شمبھو فقیر ہے!'' شمبھو فقیر کے ایک 'کامریڈ'، نندو فقیر نے آکے اعلان کیا..... نندو فقیر، شمبھو فقیر سے تین گز کے فاصلے پر بیٹھ کے بھیک مانگا کرتا تھا۔ پڑوسی ہونے کے ناتے اُس کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ اُٹھ کے آئے اور لوگوں کو بتائے کہ میرے مرحوم پڑوسی کا نام کیا ہے.... چناں چہ وہ لنگڑاتا ہوا آیا۔ لاش پر جھکا اور چوری فاتحانہ نگاہ شمبھو پر ڈالی، جیسے وہ نگاہ کہہ رہی ہو... ''میں نہ کہتا تھا شمبھو! آخر تم مرجاؤ گے اور تمھاری اس جگہ پر مجھے ہی بیٹھ کے بھیک مانگنی پڑے گی؟''

شمبھو قسمت کا دھنی تھا۔ کیوں کہ وہ عین اُس نادر موقع پر بیٹھا کرتا تھا، جہاں سے پُل کے پہلو سے اُترنے چڑھنے والی سیڑھیاں شروع ہوتی تھیں اور اُس کے 'کامریڈ' نندو فقیر نے اُس نادر جگہ کو حاصل کرنے کے لیے لاکھوں بار دُعا کی تھی، تب جا کے شمبھو مرا۔

نندو نے اپنے کان پر سے اَدھ جلی بیڑی اُتاری اور شمبھو کی لاش کی جیب میں ہاتھ ڈال کے ماچس نکالی اور بیڑی سلگا کے، ماچس جیب میں رکھتے ہوئے کہا، ''میرا اور شمبھو کا دس سال کا ساتھ تھا۔ ہم بالکل جگری دوستوں کی طرح بھیک مانگا کرتے تھے۔ آہ! بھگوان نے اُسے مجھ سے پہلے بُلا لیا...''

ایک ٹھنڈا سانس بھر کے بڑی حد تک وہ رونے لگا ہے اور روتے روتے قریب سے گزرتی ہوئی ایک پُوڈیٹ اور خوش حال حسینہ کے سامنے ہاتھ پھیلا کے کہنے لگا ہے... ''بی بی! بھگوان کے نام پر ایک پیسا، بھگوان تجھے امیر بنائے رکھے۔''

شمبھو کا مُنہ کھلا ہوا ہے۔ کھلے ہوئے مُنہ سے بھیک مانگنا غیر ضروری ہے۔ اُس کے دانت سختی سے بھنچے ہوئے ہیں۔ اُس کا چہرہ خشک، زرد اور پھیکا پھیکا سا ہوگیا ہے۔ کلائی کی ہڈیاں اور نیلی نیلی رگیں پوری آب و تاب سے اُبھر آئی ہیں...

غرض کوئی چیز ایسی نہیں، جس کی بنیاد پر لاش کو خوب صورت کہا جا سکے۔ لباس دریدہ، میلا اور پرانا ہے۔ دو تین جگہوں پر جو پیوند لگے ہوئے ہیں، وہ اصل لباس سے زیادہ صاف اور چمکیلے ہیں جنھیں دیکھ کے یہ عزت ہوتی ہے کہ شمبھو کا پیوند لگانے کا طریقہ کافی جدید اور ترقی یافتہ تھا۔

شمبھو کی لاش سے ڈیڑھ گز کے فاصلے پر پرانے بوٹوں کا سوداگر بوٹا رام بیٹھا تھا۔ وہ پالش سے چمکائے ہوئے بوٹوں کو فٹ پاتھ پر نہایت نفاست اور ترتیب سے سجائے بیٹھا ہے اور اپنے ایک گاہک کے ساتھ سودا نمٹانے میں مصروف ہے۔ وہ شمبھو فقیر کی گداگری سے پوری طرح آگاہ نہیں، کیونکہ شمبھو نے کبھی اُس سے پرانا بوٹ نہیں خریدا تھا، اسی لیے اُسے یہ بھی معلوم نہیں ہُوا کہ شمبھو فقیر مرگیا ہے۔ وہ اپنے گاہک سے کہہ رہا ہے...

''جناب! میں نے یہ بوٹ امریکا کے ایک خاص فوجی افسر سے حاصل کیا ہے۔ آپ بھی اسے پہن کے فوجی افسر معلوم ہوں گے۔''

شمبھو مرا پڑا ہے اور ڈیڑھ گز کے فاصلہ پر، جو شخص ابھی مرا نہیں، فوجی افسر بننے میں مصروف ہے... اُس سے پرے ایک جوتشی پانسے پھینک رہا ہے اور غیب کے خزانے ڈھونڈنے میں جُتا ہوا ہے۔ ایک بھدی سی بھاری بھرکم اَدھیڑ عمر عورت اپنے میلے دانت کھول کے ہنس رہی ہے اور مَردوں کے ہاتھ سانڈے کا تیل بیچ رہی ہے۔ اٹھارہ سال کی ایک شوخ و شنگ کنواری لڑکی اپنے ایک کنوارے عاشق کے ساتھ آئس کریم کھا رہی ہے اور کنوارا عاشق کہہ رہا ہے کہ یہ آئس کریم تمھارے ہونٹوں کی طرح شیریں اور لذیذ ہے۔ ایک 'رُیفیو جی' چھوکرا اپنے گلے سڑے کیلوں کی ٹوکری اٹھائے اُس حسین کنواری کی منت خوشامد کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میرے کیلے آئس کریم سے زیادہ میٹھے اور لذیذ ہیں۔ اس کے باوجود وہ یہ ساری ٹوکری دو آنے میں دینے کو تیار ہے۔ سارا فٹ پاتھ زندہ رہنے میں مصروف ہے۔ شمبھو کے بارے میں ہر ایک کو صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ مرگیا ہے، یہی اطلاع کافی ہے، اس سے زیادہ اطلاع کے لیے اُن کے ذہن میں جگہ نہیں ہے۔ کیوں کہ اُن کے ذہن کی بیش تر جگہ پُرانے بوٹوں، آئس کریموں غیب کے خزانوں، سانڈے کے تیل اور گلے سڑے کیلوں سے گھری ہوئی ہے۔

''اسے کیا ہو گیا ہے؟'' لاش کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک معزز آدمی نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، یہ مرگیا ہے۔'' دوسرے معزز آدمی نے نہایت ایمان داری سے جواب دیا۔

''مر کیوں گیا ہے؟''

''سالا گٹھیا اور زیادہ بیڑیاں پیتا ہوگا۔ اس لیے اسے دمہ ہوگیا ہوگا۔''

''آپ بجا فرماتے ہیں، مجھے بھی دمے ہی کا کیس دکھائی دیتا ہے۔'' پہلے معزز آدمی نے نہایت مہذّبانہ لہجے میں تائید کی ہے، اور پھر یوں ہلکا پھلکا ہو کے چلا گیا جیسے اُس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اُتر گیا ہو۔ اگر اُسے یہ نہ بتایا جاتا کہ شمبھو دمے سے مرا ہے تو اُسے سخت جسمانی کرب رہتا، چنانچہ اپنے جسمانی کرب کا علاج کر کے وہ مطمئن ہو کے چلا گیا ہے۔

''میرے خیال میں کسی سپاہی کو بلانا چاہیے۔'' ایک اَور آدمی نے رائے دی ہے ... ہر آدمی کو کوئی نہ کوئی رائے دینی پڑتی ہے۔

''میرا خیال ہے، سپاہی کو نہیں بلانا چاہیے۔'' دوسرے آدمی نے پہلے آدمی کی رائے جڑ سے کاٹ دی ہے۔

پہلا آدمی ناراض ہو گیا ہے اور غصے میں آ کے جیب سے چلغوزے نکال کے چبانے لگا ہے۔ اُس کی رائے کی رتّی بھر قدر نہیں کی گئی ہے، لہٰذا! وہ شمبھو کی لاش سے سخت نا راض ہو کے چلا گیا ہے۔ اگر پولیس کے سپاہی کو بلا کے لاش اُس کے حوالے کر دی جاتی تو آخر کسی کا کیا بگڑ جاتا۔ لوگ نہ جانے پولیس سے اتنا بدکتے کیوں ہیں کہ اپنے مُردے بھی اُس کے حوالے کرنے سے گھبراتے ہیں۔

سڑک پر ٹریفک نہایت زور و شور سے جاری ہے، بسیں، لاریاں، کاریں، موٹر سائیکلیں، ٹرک، سائیکلیں... سبھی مشینیں نہایت تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔

ہر مشین کی رفتار کی سوئی اپنے توازن میں ہے اور اپنے مقررہ نشان پر ڈٹی ہوئی ہے۔ کسی کا پیٹرول ختم نہیں ہو رہا، کسی کے ٹائر میں نقص پیدا نہیں ہو رہا۔ کوئی

سود

ایک شخص امام ابوحنیفہؒ کا قرض دار تھا۔ ایک دفعہ اُس مقروض کے علاقے میں آدمی کا انتقال ہو گیا۔ جب امام ابوحنیفہؒ اس کی نمازِ جنازہ کے لئے وہاں پہنچے، تو ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور موسم بہت گرم تھا لیکن آپؒ کے مقروض کی دیوار کے پاس کچھ سایہ تھا۔ چنانچہ لوگوں نے کہا آپؒ یہاں تشریف لے آئیں تو آپؒ نے فرمایا ''صاحبِ خانہ میرا مقروض ہے اس لئے اس کے مکان کے سایہ سے استفادہ کرنا میرے لئے جائز نہیں۔ کیونکہ حدیثِ شریف میں ہے کہ قرض کی وجہ سے نفع بھی حاصل ہو وہ سود ہے۔ (احمد علی، A-8)

بہانہ ایسا پیدا نہیں ہو رہا ہے، جس کی وجہ سے وہ پل بھر کو رُک جائیں اور شمبھو کی لاش پر ایک نظر ڈال لیں۔ شاید شمبھو کی موت سے کسی کو دلچسپی نہیں ہے، کیوں کہ شمبھو انسان تھا اور انسان اور مشین میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ انسان جذبات کا مجموعہ ہوتا ہے، جب کہ مشین پرزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔

ایک کتا مٹر گشت کرتا ہُوا شمبھو کی لاش کے قریب سے گزرا ہے۔ ایک دو سیکنڈ کے لیے شمبھو کی لاش کے پاس ٹھٹکا ہے۔ وہ لاش کو پہچاننے لگا ہے۔ وہ لاش کو پہچان گیا ہے، کیوں کہ شمبھو اور وہ دونوں کئی بار اکٹھے سوتے رہے ہیں۔ کتّے نے لاش کو پہچان کر پیار سے دُم ہلائی ہے، مگر شمبھو کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اُس نے مزید توجہ دلانے کے لیے اور شمبھو کو چھیڑنے کے لیے اُس کے ساتھ رکھی ہوئی گٹھڑی سونگھی ہے، مگر شمبھو کی لاش بدستور بے حس پڑی ہوئی ہے۔ کتا مایوس ہو گیا ہے۔ اُس نے ایک آخری کوشش کی ہے اور ساتھ کھڑے آدمیوں پر بھونکا ہے۔ شاید

اُس کا خیال ہے کہ یہ لوگ شمبھو کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، یہ لوگ شمبھو کے دشمن ہیں۔ شک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ شمبھو کے پاؤں کے قریب بیٹھ گیا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ شمبھو کی موجودہ پوزیشن کیا ہے۔

لاش کے قریب آدمی آتے ہیں، ایک دو منٹ ٹھہرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ہر آدمی یہ تصدیق کر کے آگے بڑھتا ہے کہ واقعی ایک انسان ہی مرا ہے۔ یہ لاش ایک ایسے چوراہے کی طرح دکھائی دے رہی ہے، جہاں سے لوگ ایک دو منٹ میں 'کراس' کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ شمبھو کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے اسے 'کراس' کیا ہے۔ ورنہ زندگی بھر وہ بھیک کے لیے لوگوں کو بلاتا رہا، ہاتھ جوڑ جوڑ کے پکارتا رہا، مگر کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتا تھا..... موت نے اسے زندہ لوگوں کے بہت قریب کر دیا ہے۔

''اس کے اوپر کوئی کپڑا ڈال دینا چاہیے، لاش کا کھلا رہنا دھرم نہیں ہے.....'' ایک کھدّر پوش نے انسانیت کی بلندیوں سے پکارا ہے۔

''ہاں، ضرور ڈال دینا چاہیے۔ آخر انسان کی لاش ہے، لوگ تو جانوروں پر بھی بوری ڈال دیتے ہیں.....'' دوسرے نے انسان کو جانور سے بلند کرنے کا اعلان کیا ہے۔

معاملہ دھرم کا ہے، اس لیے کوئی بھی آدمی سچی بات منہ سے نکالنے کی ہمت نہیں کر رہا، بلکہ ایک شخص نے تو آگے بڑھ کے ایک میلا کچیلا کھیس شمبھو پر ڈال بھی دیا ہے۔ یہ کھیس خود شمبھو کا ہے اور اس کی گٹھڑی کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ اس کھیس نے زندگی بھر اس کا ساتھ دیا ہے اور اب موت کے وقت بھی دے رہا ہے۔ میلے کچیلے کھیس سے میلی کچیلی لاش ڈھانپ دی گئی ہے۔ رنگ سے رنگ میچ کر گیا ہے۔

''اس کے منہ پر کھیس مت ڈالو!'' کسی نے سختی سے احتجاج کیا ہے۔

''نہیں نہیں، ڈال دو!'' کسی نے ناک پر رومال رکھتے ہوئے کہا ہے۔

''نہیں نہیں، مت ڈالو! پتا کیسے چلے گا کہ کھیس کے نیچے مردہ پڑا ہے۔'' اس آدمی نے خطرے کی گھنٹی بجائی ہے۔

''یہ پتا لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

''ضرورت ہے۔''

''نہیں ہے۔''

''ہے!''

''نہیں ہے۔''

اُس آدمی نے ہیکڑی میں آ کے لاش کے منہ پر سے کھیس ہٹا دیا ہے۔ دوسرے نے غصے میں آ کے کھیس دوبارہ منہ پر ڈال دیا ہے۔ پہلے نے پھر ہٹایا ہے، دوسرے نے پھر ڈال دیا ہے اور پھر دونوں نے کھیس چھوڑ کے ایک دوسرے کے منہ پر گھونسہ مارا ہے اور حق اور صداقت کی لڑائی ہونے لگی ہے اور پھر اس لڑائی کو دو چار آدمیوں نے بیچ میں پڑ کر ختم کرا دیا ہے اور دونوں صداقت کی تلاش میں مختلف سمتوں کو چلے گئے ہیں..... ایک گھٹیا موضوع پر لڑنا بے کار ہے۔ جب زندہ شمبھو پر کوئی آپس میں نہیں لڑا تھا تو اب مردہ شمبھو پر لڑنے کا کیا فائدہ ہے اور پھر دھرم اور دیا کا زمانہ تو ویسے بھی ختم ہو گیا ہے۔

اب لاش اپنا منہ چھپائے پڑی ہے۔ اس کے قریب کوئی آدمی نہیں۔ جتنے آدمی آئے تھے، وہ اپنا اپنا

فرض ادا کر کے جا چکے ہیں۔ کسی نئے آدمی کو یہ پتا نہیں چل رہا کہ کھیس کے نیچے شمبھو سو رہا ہے یا مر گیا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے چند منٹ پہلے شمبھو کو جو موت آئی تھی، وہ کھیس ڈالتے ہی بھاگ گئی ہے، یعنی زندگی اور موت کے درمیان کھیس آ گیا ہے، جس نے زندگی اور موت کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی ہے۔

تین چار منٹ سے لاش کھیس کی اوٹ میں ہے اور پھر بارہ تیرہ سال کا ایک غلیظ سا بھک منگا لونڈا، گنگناتا ہوا آیا ہے۔ اس نے پہلے شمبھو کا کندھا جھنجھوڑا ہے اور پھر منہ سے کپڑا ہٹا دیا ہے۔ موت ایک بار پھر سورج کی روشنی میں چمک اٹھی ہے۔ روشنی کی اس حرکت سے لونڈا ڈر گیا ہے اور اس نے کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا ہے ''بابا! بابا!، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''ابے سالے! مر گیا ہے تیرا بابا!'' قریب کھڑے ایک گنڈیری فروش نے جیسے اسے شرم دلاتے ہوئے کہا ہے۔

''کیسے مرا؟''

''موت سے۔''

''ابھی ابھی تو میں اسے اچھا بھلا چھوڑ کے گیا تھا۔''

''ابے، تمہارا نوکر تو نہیں تھا کہ تم سے پوچھ کے مرتا۔ اس کا جی چاہا اور مر گیا..... ہاہاہا! گنڈیریاں ایک آنے کی پاؤ رے بھائیو، ایک آنے کی پاؤ۔''

لونڈے کی خوف زدہ آنکھیں یک دم سنجیدہ ہو گئی ہیں۔ اس نے کھیس کے اندر اپنا ہاتھ لے جا کے شمبھو کی ڈب؟؟ کھولی ہے۔ اس میں سے کچھ ریزگاری نکلی ہے۔ جسے اس نے احتیاط سے جیب میں ڈال لیا ہے۔ اسے شاید بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ اس لیے اس نے اپنے پھٹے پرانے کوٹ کی جیب میں سے دو روٹیاں

اے لڑکے! غور سے سُن

کہ ایک دن میں نبی کریم ﷺ کے پیچھے سواری پر بیٹھا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اے لڑکے! میں تجھے چند باتیں بتانا چاہتا ہوں، غور سے سُن۔ دیکھ تو خدا کو یاد رکھ، تو خُدا تجھ کو یاد رکھے گا۔ تو خدا کو یاد رکھ، تو خدا کو اپنے سامنے پائے گا۔ جب مانگے تو خدا سے مانگ۔ جب تو کسی مشکل میں مدد کا طالب ہو تو خدا سے مدد طلب کر، خدا کو اپنا مددگار بنا اور اس بات پر یقین کر کہ سب لوگ مل کر بھی تجھے کوئی نفع پہنچانا چاہیں، تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے مقدر میں کر دیا ہے۔ تو پھر اللہ ہی کو اپنا واحد سہارا بنانا چاہیے۔ (روایت حضرت ابن عباسؓ)

نکالی ہیں۔ گٹھڑی کھول کے اس میں سے سبزی کا سان نکالا ہے اور لاش کے قریب بیٹھ کے کھانے لگا ہے۔ روٹی کے دو چار ہی لقموں نے اس کے رخساروں پر لہو دوڑا دیا ہے۔ اس لہو میں طمانیت ہے، جو بھیک میں مانگی ہوئی روٹیوں سے نچوڑی گئی ہے اور شمبھو کا لونڈا چونکہ شمبھو کی طرح ابھی مرا نہیں ہے، اس لیے وہ طمانیت نچوڑ سکتا ہے۔

لونڈے نے کھانا ختم کیا ہے، بیڑی سلگائی ہے۔ شمبھو کی گٹھڑی میں سے اپنے کپڑے نکالے ہیں۔ ایک کٹورا، ایک گلاس اور ایک پرانی چپل نکالی ہے اور باقی گٹھڑی وہیں باندھ کے رکھ دی ہے اور اپنی اشیا کی ایک نئی گٹھڑی بنا کے گنگناتا ہوا چلا گیا ہے۔

جیون کے دن چار..... اے گوری
جیون کے دن چار.....
لُوٹ لے موجِ بہار..... اے گوری

جیون کے دن چار.....

اب لاش ایک بار پھر ننگے منہ پڑی ہے۔ نئے نئے راہ گیر آ جا رہے ہیں مگر وہ دہرائی ہوئی باتیں دہرا رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے شمبھو کی لاش پر کوئی اچھوتی بات نہیں کہی جا سکتی اور اب لاش ایک ایسے ریگستان کی طرح پڑی ہوئی ہے، جہاں سال میں ایک انچ سے زیادہ بارش نہیں ہوتی۔

''یہ لاش آخر کب تک یہاں پڑی رہے گی؟'' قریب کھڑے ہوئے گنڈیری فروش نے ایک جمائی لے کے کہا۔

''میں کیا جانوں، مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟''

''میرے خیال میں لاش کو یہاں سے اٹھوا دینا چاہیے۔ بُری لگ رہی ہے۔'' گنڈیری والے نے تجویز پیش کی۔

''ہاں بری تو لگ رہی ہے۔ زندہ انسانوں کے درمیان ایک مردے کا پڑا رہنا؟ چھی چھی چھی!'' بوٹا رام نے ایک میلے سے بوٹ کو میلے سے کپڑے سے جھاڑتے ہوئے کہا۔

''مگر اٹھوایا کیسے جائے۔ اس سالے کا کوئی ساتھی سنگھی تو ہوا ہو گا۔''

''تو پھر.....؟ میرا خیال ہے، پٹری والوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ سب مل کر اس کے کفن دفن کے لیے چندہ اکٹھا کریں۔''

''تجویز بری نہیں۔ مگر پٹری والے مانیں گے نہیں۔ سب حرامی ہیں۔ یہ انسان کی قدر کرنا کیا جانیں..... اچھا ذرا خیال رکھنا بھیا، میرے بوٹوں کا۔ میں ذرا سامنے دکان سے چائے پی آؤں۔

بوٹا رام چائے پینے چلا گیا ہے..... سارے پٹری والے حرامی ہیں۔ چائے کے بہت پیاسے ہیں۔ گنڈیری فروش شاید سوچ رہا ہے کہ بوٹا رام سچ کہتا ہے۔ پٹری والے انسان کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ ابھی تو آدھی گنڈیریاں بچنی باقی ہیں۔ لاش کے پاس کھڑے ہو کے گنڈیریاں بیچنا بہت برا لگتا ہے۔ گاہک لوگ لاش کے پاس کھڑے ہو کے گنڈیریاں خریدنے سے ہچکچاتے ہیں۔ گذشتہ آدھے گھنٹے سے ایک بھی گاہک قریب نہیں پھٹکا ہے۔

وہ اپنا خوانچہ اٹھا کے چل دیا ہے اور سامنے والے فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا ہے..... پٹری والے سب حرامی ہیں۔ انسان کی قدر نہیں کرتے، گنڈیریوں کی زیادہ قدر کرتے ہیں۔

لاش پر جو مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، وہ گنڈیریوں کی وجہ سے تھیں۔ اب وہ مکھیاں بھی شمبھو کو چھوڑ کے گنڈیریوں کے پیچھے پیچھے دوسرے فٹ پاتھ پر جا رہی ہیں..... ہر چیز شمبھو کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔

پانچ چھ منٹ اور گزر گئے ہیں۔

نندو فقیر پھر لنگڑاتا ہوا آیا ہے، وہ لاش کے گرد گدھ کی طرح منڈلانے لگا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی ہے، جس کا چہرہ نیک نیت قسم کا ہے۔ اس نے بازو پر ایک بلا لگا رکھا ہے جس پر ''جماعتِ خادمانِ قوم'' کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ اس نے جیسے لاش کو سونگھ کے پوچھا ہے، ''اچھا تو یہ لاش ہے۔''

''جی ہاں۔'' نندو فقیر نے خوشامدانہ لہجے میں کہا ہے۔ ''بھیک مانگا کرتا تھا، کئی دنوں سے بیمار تھا، آج مر گیا ہے بیچارا۔''

''کوئی ہرج نہیں، ہماری جماعت اس کے کریا کرم کا بندوبست کر دے گی۔ آہ! ملک میں

بھکاریوں کی کیا حالت ہورہی ہے۔"

نندوفقیر کو بھکاریوں کے فلسفے پر بحث میں حصہ لینے کا کوئی شعور نہیں ہے۔ اس لیے وہ مضطرب ہے اور کہہ رہا ہے، "اسے آپ کیسے اٹھوا کے لے جائیں گے؟"

"مزدوروں کے ذریعے رسے باندھ کے۔"

وہ شخص مردے اٹھوانے کا شاید تجربہ رکھتا ہے۔ اس نے دو مزدوروں کو اشارے سے بلا لیا ہے اور انھیں حکم دیا ہے کہ لاش کو رسے سے باندھ کے کندھے پر اٹھا کے ہمارے دفتر تک لے چلو۔"

نندوفقیر نے رسا باندھوانے میں نہایت پھرتی سے امداد دینی شروع کر دی ہے۔ راہ گیر ایک لاش کو رسا بندھتے دیکھ کے پھر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ رسا باندھنا ایک تماشے کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر تماشا ہر راہ گیر کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ کششِ ثقل کا اصول ہے۔

"یہ بہت بے رحمی ہے۔ انسان کی لاش کو رسے سے نہیں باندھنا چاہیے۔" ایک راہ گیر نے حقارت سے کہا۔

"تو پھر آپ اپنے گھر سے ایک چارپائی لا کے دے دیجیے۔"

"میں ہوٹل میں رہتا ہوں، میری اپنی کوئی چارپائی نہیں۔"

ہوٹل والا لطیفہ خوب صورت ہے، سب کو مزا دے گیا ہے اور سبھی بے ساختہ ہنس پڑے ہیں۔

مجمع دیکھ کے ایک کانسٹیبل فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے ڈنڈا لہرا کے دور ہی سے للکارا ہے۔ "ایک طرف ہٹ جاؤ، کیوں اکٹھے ہو رہے ہو، کیا بات ہے؟"

"یہ شمبھو فقیر ہے، جو مر گیا ہے۔" خادم قوم نے جیسے کو تیسا جواب دیا۔

'کیوں مر گیا ہے، کیسے مر گیا ہے؟ کس نے مارا ہے؟" کانسٹیبل نے آئینی سوالات کی بوچھاڑ کر دی ہے اور لاش کے سرہانے 'اٹن شن' ہو کے کھڑا ہو گیا ہے۔ مزدوروں نے رسا باندھنا بند کر دیا ہے۔ انھیں قانونی آرڈر کا انتظار ہے۔

'لاوارث لاش ہے اور ہماری جماعت اسے شمشان لے جا رہی ہے۔" خادمِ قوم نے فخریہ اعلان کیا ہے۔

"کون ہے تمہاری جماعت؟ ہوں! میں سب جانتا ہوں تم لوگوں کی بدمعاشیاں۔ تم اسے مار کے اب لاش چھپانا چاہتے ہو؟"

ڈنڈے کی آواز پھر ابھری ہے، جس سے سبھی لوگ سہم گئے ہیں، کئی کنی کترا کر نکل گئے ہیں۔ خادم قوم جوش و خروش سے ابل رہا اور کہہ رہا ہے "اس فقیر کے قاتل تم ہو، ہمارا سماج ہے، ہمارا نظام ہے، ہماری سرکار ہے۔ انسان سڑکوں پر یوں بھوکے پیاسے مر رہے ہیں اور تم ہتھکڑی ہاتھ میں لیے مردوں کو گرفتار کرنے کے لیے پھر رہے ہو..... شیم، شیم!"

سبھی لوگ اس تقریر سے متاثر ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں، "شیم، شیم۔"

"اپنا لیکچر جیب میں رکھ!" کانسٹیبل اپنا وقار مٹی میں ملتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ "میں تمھیں گرفتار کرتا ہوں کیونکہ تم قانونی کارروائی میں رکاوٹ ڈال رہے ہو۔"

سبھی لوگ کانسٹیبل کی مدلل بات سے متاثر ہوئے ہیں۔ "شیم، شیم۔"

نندوفقیر کی حالت دگرگوں ہے..... قانون کے باریک نکتے اس کی سمجھ میں نہیں آتے، اس لیے وہ گرفتاری کے ڈر سے کھسک کے اپنی پرانی جگہ پر جا بیٹھا ہے۔

"تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے، میں خادم قوم ہوں۔"

خادم قوم کا چہرہ غصے سے سرخ ہے۔

"چلو، چلو، بکواس بند کرو اور تھانے چلو۔"

"یہ لاوارث لاش ہے، اسی لیے قوم کی امانت ہے، اسے میں لے جاؤں گا۔"

"تم اس لاش کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتے۔"

"میں اسے لے جائے بغیر ٹلوں گا نہیں۔"

کانسٹیبل نے اس کی کلائی میں ہتھکڑی ڈال دی ہے۔ لوگ تذبذب میں ہیں کہ لاش کس کے ہاتھوں میں زیادہ محفوظ رہے گی، پولیس کے یا خادم قوم کے۔

"مجھے شک ہے کہ اس کی موت کے ذمے دار تم ہو۔"

کانسٹیبل نے خادم قوم پر آخری اور بھرپور وار کیا ہے۔ "اس لیے اب تمھارے خلاف مقدمہ چلے گا۔"

شمبھو کو کس نے مارا ہے؟ اس سلسلے میں شمبھو خاموش ہے۔ اپنی موت کے متعلق اس کی کیا رائے ہے، اپنے دفنانے کے بارے میں اس کا نقطہ نظر کیا ہے؟ اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا، کیونکہ شمبھو اپنی لاش کے مستقبل سے بے پروا ہو کے مرا پڑا ہے۔ خادم قوم ہتھکڑی پہن کے سپاہی کے ساتھ تھانے جا رہا ہے اور نہایت جوشیلے انداز میں کہتا جا رہا ہے، "عدالت میں بات کروں گا کہ اس موت کا اصل ذمے دار کون ہے..... میں حق اور صداقت۔"

وہ چلے گئے ہیں، لوگ بھی چلے گئے ہیں۔ شمبھو کی لاش پر سے اب مطلع پھر صاف ہو گیا ہے۔

اب شمبھو کی لاش پھر لوگوں سے کٹ گئی ہے۔

تین چار منٹ اور گزر گئے ہیں۔

تین چار منٹ اور۔

دس پندرہ منٹ اور۔

اور پھر لاش میں ایک خفیف سی حرکت پیدا ہوئی ہے۔ اس کے منہ سے ایک خفیف سی کراہ لرزی ہے، جیسے کوئی رک رک کے سانس لے رہا ہو۔ اس نے نہایت کرب اور اذیت سے ہولے ہولے اپنی آنکھیں کھولی ہیں اور پھر بند کر لی ہیں۔ پھر کھولی ہیں، پھر بند کر لی ہیں اور پھر جیسے ہڑ بڑا کے اٹھنے کی کوشش کی ہے، مگر نقاہت کے باعث اس سے اٹھا نہیں جا سکا۔ اس نے چند بے معنی الفاظ منہ سے نکالے ہیں۔ اس نے چلتی ہوئی سڑک کی طرف اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ پھیلا دیا ہے۔ نندوفقیر بھاگ کے لنگڑاتا ہوا اس کے پاس آ گیا ہے۔

"شمبھو!..... تم..... تمھیں..... مجھ!..... تم تو اٹھ بیٹھتے ہو۔"

شمبھو نے اٹھنے کی کوشش کی ہے، مگر اس کا سر اٹھ نہیں رہا ہے۔ نندو چوں کہ اس کا مرید ہے، اس لیے شمبھو کے سر کو سہارا دے کے اسے اٹھا رہا ہے۔ "تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں، میرا دل ڈوب رہا ہے۔ کہیں سے پانی لا دو۔"

نندوفقیر پانی لینے چلا گیا ہے۔ اس کے قدم من من کے بھاری ہو رہے ہیں۔

"گنڈیریاں ایک آنے کی پاؤ۔" سامنے کے فٹ پاتھ سے آواز ابھری ہے۔

"سانڈے کا تیل! سانڈے کا تیل!" ایک اور آواز ابھری ہے۔

"صاحب! بالکل امریکن بوٹ ہیں، خالص فوجی....." ایک اور مانوس آواز شمبھو کے کان میں پڑی ہے۔

شمبھو نے ایک ہاتھ اپنے ڈوبتے ہوئے دل پر رکھا ہے، اور دوسرا ہاتھ ایک حسین راہ گیر جوڑے کی طرف پھیلا دیا ہے۔

"جوڑی بنی رہے بابو جی! بھگوان کے نام پر ایک پیسا!"

■■■

آخری جلسہ

ایک بوڑھے کی پُر تاثر کہانی جو یوم مئی کی تقریب میں اپنا حصہ بٹانے کے لیے سال بھر انتظار کرتا تھا روسی قائم کار آندرے گروشینکو کی کہانی،

ترجمہ: ستار طاہر

بڈھے باشکوف نے اپنی بہو سے کہا، ''جانتی ہو، آج کیا دن ہے۔ دیکھو، دھوپ نکل آئی، میرے باہر بیٹھنے کا انتظام کر دیا؟''

بہو مسکرائی، وہ اچھے نین نقش کی تھی، لیکن اس کا وزن بڑھتا جا رہا تھا اور وہ خاصی بے ڈول ہو رہی تھی۔ بڈھے باشکوف نے اپنے آپ سے کہا ''مرد بڑا ظالم ہے، عورت کی خوب صورتی چھین لیتا ہے۔''

''ہاں! باہر کرسی بچھا دی ہے، کوئلے دہکا کر انگیٹھی گرم کر دی ہے..... اور کیا چاہیے بابا.....''

''بس تو پھر مجھے سہارا دے کر باہر لے چلو، آؤ، گھٹیا..... ششکا! تیرا گھر والا تو چلا گیا ہوگا۔''

''ہاں بابا! بچے بھی اس کے ساتھ ہی گئے ہیں۔''

بہو نے بڈھے کو سہارا دے کر بستر سے اٹھایا پھر اسے سہارا دیتی مکان کے باہر لے آئی، جہاں ایک بڑی کرسی بچھی تھی اور اس کے سامنے ایک انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے۔

''بابا بہت بوڑھا، لیکن بہت بھاری ہو گیا ہے۔'' بہو نے دل میں کہا اور پھر مسکراتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئی۔

باشکوف نے سامنے کھلے میدان کی طرف دیکھا۔ چند سو گز کے فاصلے پر لوگ جمع ہو رہے تھے۔ یوم مئی کا جلسہ ہونے والا تھا۔ اس جلسے میں شریک ہونے والے بہت سے مزدور اس کے جاننے والے تھے۔ چار سال پہلے تک وہ بھی اس جلسے میں شریک ہوا تھا، حالانکہ اسے فیکٹری سے ریٹائر ہوئے نو برس ہو چکے تھے۔ جوڑوں کے درد نے اسے کسی کام کا نہ چھوڑا تھا۔ وہی ہڈیاں اور جوڑ جو کبھی اس کی بے پناہ طاقت کے ضامن تھے، اب اس کا روگ بن چکے تھے۔ سارا دن وہ بستر پر لیٹا ادھر ادھر کی ہر طرح کی کتابیں پڑھتا رہتا، بیٹا فیکٹری چلا جاتا، پوتے اسکول، گھر میں وہ اور بہو رہ جاتے۔ بہو بہت خدمت گزار تھی۔ اس نے بڈھے باشکوف کی اپنی بیوی کی خدمت بھلا دی تھی۔ باہر نکلنا ختم ہو چکا تھا، ہاں ہر برس یوم مئی کا جلسہ سننے کے لیے وہ باہر آ کر بیٹھ جاتا۔ وہ جانتا تھا کہ یوں وہ اپنے ساتھیوں کی خوشیوں اور دکھوں میں شریک ہو جاتا ہے، پھر جلسے کے اختتام پر جلسہ کرنے والوں کو اس کی ضرورت بھی تو پڑ جاتی تھی..... وہ مسکرانے لگا.....

اس نے ہاتھ کو حرکت دی، اپنے بوسیدہ اوور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، جیب کے اندر ہی کوپک گننے لگا..... گیارہ کوپک..... اس نے گنتی ختم کی۔

''ہاں۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا، 'اس سے زیادہ انھیں کیا ضرورت پڑے گی۔''

وہ مسکرانے لگا، ہر سال ایسا ہی ہوتا تھا، جب جلسہ ختم ہو جاتا تو جلسے کا انتظام کرنے والی کمیٹی کو پتا چلتا کہ فرنیچر اور دریوں کے کرائے کے لیے ان کے پاس کچھ پیسے کم پڑ گئے ہیں، پھر وہ ایک دوسرے سے پیسے مانگتے، چندہ کرتے اور یوں ادائی کرتے تھے۔ یہی بات ہوئی تو اس نے سب کو روک کر کہا تھا ''میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں، ملازمت سے بھی چھٹی ہو چکی، اپنے ساتھیوں کی جدوجہد میں عملی حصہ نہیں لے سکتا۔ اس لیے اب میں اس جدوجہد میں اسی طرح حصہ لے سکتا ہوں کہ یوم مئی کے جلسے کے انتظامات تم کرو، جو رقم کم پڑے اس کی ادائی میں کیا کروں گا۔''

تب سے وہ پانچ، سات، آٹھ، دس کوپک دے کر یوم مئی کے جلسے کے انعقاد میں عملی حصہ لیا کرتا تھا۔

جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ سیکڑوں مزدور وہاں بیٹھے تھے۔ طرح طرح کی ٹوپیوں اور گنجے سروں کا ایک انسانی سمندر دکھائی دے رہا تھا۔

بڈھا باشکوف مسکرایا، اس کی مسکراہٹ میں کچھ تلخی بھی تھی۔ جنھوں نے ٹوپیاں پہن رکھی ہیں، ان میں سے بھی بیش تر کے سر گنجے ہیں، ہم مزدور اتنی جلدی گنجے کیوں ہو جاتے ہیں؟''

مزدور ترانہ گا رہے تھے۔ وہ توجہ سے سنتے ہوئے دل ہی دل میں ترانہ گنگنانے لگا..... وہ جذباتی سا ہو رہا تھا۔

ترانے کے بعد ایک نوجوان مزدور تقریر کرنے لگا۔

بڑا جوش ہے بھئی اس کی باتوں میں۔ بڈھے نے دل میں کہا، کون ہے یہ نیا لیڈر..... چلو..... یہ فیکٹری بھی تو دنیا کی طرح ہے۔ کوئی آتا ہے، کوئی جاتا ہے، لیکن اس کی باتوں میں جوش ہی ہے، اس طرح تو مسئلے حل نہیں ہوتے۔ خیر، جوانی کا جوش ہے..... اس بھٹی سے تپ کر نکلے گا تو کندن بن جائے گا۔ معقولیت..... وہ ہنسا تو اس کی سفید مونچھیں پھڑ پھڑائیں۔

'معقولیت..... کہاں ہے اس دنیا میں؟ جہاں بھوک ہو، غربت ہو، وہاں معقولیت کا گزر کیسے ہو سکتا ہے۔'

اسٹیج پر آخری مقرر آ گیا، یہ اناطولی تھا، سرخ لمبی ناک، جسے وہ بار بار چھونے اور سہلانے کا عادی تھا۔

اناطولی ہے مزدوروں کا لیڈر، بوڑھے نے اسے داد دی، کیا منجھا ہوا آدمی ہے، کبھی سمجھوتا نہیں کرتا، لچک تو ہے ہی نہیں، فولاد ہے فولاد! بڈھے باشکوف نے آنکھیں میچ لیں۔

'کیا حسین تھی اناطول کی بیوی..... مر گئی بے چاری..... کتنی چک پھیریاں میں نے اسے راغب کرنے کے لیے لی تھیں، مگر کیسی باوفا تھی، واہ..... کیا حسینہ تھی..... کیا وفا شعاری تھی۔

بڈھا پرانی یادوں کے نشے میں اونگھنے لگا۔

تالیوں اور نعروں کا شور سن کر وہ چونکا۔

جلسہ ختم ہو گیا، لوگ جانے لگے تھے، نعرہ لگاتے،

ناچتے، گاتے۔

بہت سے لوگ اس کے پاس آئے، اسے سلام کیا، اس کا بھاری بھرکم ہاتھ لے کر اپنے گرم ہاتھوں میں سہلایا۔ کسی نے اس کے گھٹنے چھوئے اور کوئی زمین پر پاس بیٹھ گیا۔ وہ مسکراتا رہا۔ حال احوال پوچھتا رہا اور انتظار کرتا رہا۔

وہ جانتا تھا، اب جلسہ کمیٹی والے حساب کتاب کر رہے ہوں گے، پھر ان میں سے کوئی ایک حسب روایت اس کے پاس آئے گا۔ بابا باشکوف صاحب..... چھ کوپک کم ہوگئے ہیں، سات روبل، آٹھ روبل، دس روبل کم پڑ گئے ہیں۔

وہ جیب میں ہاتھ ڈالے گا، کوپک نکال کر اسے گن کر دے دے گا۔ وہ شکریہ ادا کر کے سلام کر کے چلا جائے گا۔

بڈھے باشکوف نے اوور کوٹ کی جیب سے سارے کوپک نکال کر اپنی مٹھی میں لے لیے۔

جلسے کا میدان خالی ہو چکا تھا۔ اپنی بوڑھی آنکھیں میچ کے وہ ان چند لوگوں کو دیکھنے لگا جو اسٹیج کے نیچے سر جوڑے کھڑے تھے، وہ ان کی آواز سن نہیں سکتا تھا، اگر آواز اس تک پہنچ سکتی تو وہ سنتا کہ ایک کہہ رہا تھا ''پیسے تو پورے ہیں، بلکہ دو کوپک بچ گئے ہیں۔''

''چلو، اچھا ہوا۔'' دوسرا مزدور بولا ''ہر سال ہم بابا باشکوف کو تکلیف دیتے تھے۔''

''مجھے اس سے پیسے لینے میں بہت ندامت محسوس ہوتی تھی، بے کار ہے، بوڑھا ہے، بیمار ہے..... ہم اس کی مدد کرنے کے بجائے الٹا اس سے.....''

'بھئی وہ خود ایسا چاہتا تھا۔'' دوسرا بولا ''اپنی خوشی سے دیتا تھا۔''

''اچھا بھئی، فارغ کرو فرنیچر دریوں والے کو۔''

''ہاں ہاں۔ میں ابھی ادائی کر دیتا ہوں۔''

'بابا باشکوف بیٹھا ہے..... چلو، اس سے مل کر آئیں۔''

''نہیں! وہ سمجھے گا کہ ہم اس سے پیسے لینے آئے ہیں، شام کو مل لیں گے۔''

''ہاں، ٹھیک ہے، شام کو مل لیں گے۔''

بابا باشکوف دیکھتا رہا، وہ ایک ایک کر کے اس کے پاس آئے بغیر چلے گئے۔ اب اس کی نگاہوں کے سامنے خالی میدان پڑا تھا۔ کرسیاں، میزیں، اسٹیج کے تختے دریاں، سب لاد دی جا چکی تھیں اور اس کے سامنے گھوڑا گاڑی وہاں سے سامان اٹھا کر چلی گئی۔

اسے یوں لگا جیسے اس کا سارا خون اس کے سر کی طرف تیزی سے چڑھنے لگا ہے، جیسے وہ الٹا بیٹھا ہے، گھٹ رہا ہے..... انگیٹھی کے کوئلے ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔

'تو انھیں میری ضرورت نہیں رہی..... میں اپنے ساتھیوں کی جدوجہد میں کسی طرح بھی شریک نہیں ہو سکتا.....'

اس کا بیٹا اور پوتے، جلسے کے بعد جلوس کے ساتھ چلے گئے تھے، جب وہ واپس آئے تو بڈھے کا بھاری سر سینے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ بیٹے نے آواز دی۔

''بابا! چلو، اب اندر چلیں۔''

اس کا ایک پوتا چلایا ''دیکھو! کوپک زمین پر گرے ہیں۔'' کچھ کوپک اس کی مٹھی میں بھی موجود تھے۔

وہ مر چکا تھا.....

بہو، بیٹے اور پوتوں نے اسے مل کر اٹھایا..... ہر آنسو بہا رہی تھی اور دل میں کہہ رہی تھی ''بابا..... بوجھ ہو گیا ہے۔''

■■■

برسٹل انگلینڈ سے موصولہ خط کہانی

بہار

کیا بہار کی زندگی میں کبھی بہار آئے گی؟

ذکیہ علی بیگ

جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم! حسب وعدہ بہار کی کہانی لے کر حاضر ہوں۔ بہار کی کہانی تو آپ دیکھ رہے ہوں گے کیونکہ آج زمانہ ویژول (Visual) کا۔ اب تو دیکھنے والے ٹیلی فون آچکے ہیں اور آپ کے لاہور میں بھی بہار آچکی ہوگی۔ شگوفے کھل رہے ہوں گے، گل مہک رہے ہوں گے، اشجار پر سبزہ ابھر رہا ہوں گا۔ بہار کا موسم امید کا موسم ہے جب موسم سرما کی بے رونقی کے بعد زندگی پر نکھار آنا شروع ہو جاتا ہے۔ ایک ننھی امنگ دلوں اور ماحول پر چھا جاتی ہے۔ اسی لیے انگریز اپنے بچوں کے نام بھی بہار اور موسم گرما پر رکھتے ہیں کیونکہ بہار و موسم گرما ان کے لیے امید و خوشی کا پیغام لے کر آتے ہیں۔ آج کل ہم انگلستان میں برف کے طوفان کا سامنا کر رہے ہیں۔ تمام زمین سفید ہے اور زندگی تقریباً بے رنگ ہے۔ ہم سب بہار کا انتظار کر رہے ہیں لیکن اختر صاحب آپ اور آپ کے ہم وطن کتنے خوش قسمت ہیں کہ بہار وہاں کتنی جلد آجاتی ہے۔ لیکن اب یہ ایک قوم پر منحصر ہے کہ وہ بہار کا استقبال کس اُمید سے کرتی ہے اور امیدوں کو حقیقت میں کیسے تبدیل کرتی ہے؟

جناب اختر عباس صاحب! 2010ء میں جب میں برسٹل میں سوشل سروسز میں کام کر رہی تھی، ہر طرف بہار کا ہی غلغلہ تھا۔ بہار ایک سات سالہ انگریز بچی کا نام ہے۔ اس کا ذکر یوں تھا کہ وہ بہت شرارتی تھی اور ٹک کر بیٹھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ بہار کے متعلق شکایت تھی کہ وہ بچوں کے ساتھ عجیب کھیل کھیلتی تھی۔ مثلاً ان کو نیچے گرا کر ان کے اوپر لیٹ جاتی تھی یا ان کے نازک حصوں کو ہاتھ لگاتی تھی۔ اسے اسکول سے سوشل ورکر، ماں باپ سے ملانے لے کر جاتی تھی۔ اب یہ ڈیوٹی میرے سپرد کی گئی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اتنی شرارتی اور بے شرم لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کروں اور میں گھبرا رہی تھی۔ بہرحال ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہے۔ لہٰذا میں اسے اسکول لینے پہنچ گئی۔ انگلستان میں اسکول نو بجے لگتے ہیں اور چھٹی شام تین بجے ہوتی ہے۔ بچوں کو کھانا اسکول فراہم کرتے ہیں۔ انگریز شام کو کھانا جلدی کھا لیتے ہیں اور اسے 'ٹی' بولتے ہیں جب کہ رات کو ہلکا پھلکا

کھاتے ہیں۔ بہرحال میں اسکول پہنچی اور مجھے اپنا کارڈ دکھانا پڑا تا کہ اسکول والے اطمینان کر لیں کہ میرا تعلق ایک ذمہ دار عہدہ سے ہے کیونکہ بہار کی حفاظت ان کی ذمہ داری تھی۔ بہار نے مجھے دیکھا اور ٹھٹک گئی۔ میں نے بہار کو بتایا کہ میں اسے اس کی امی سے ملانے لے کر جا رہی ہوں تو وہ خوش ہو گئی اور میرے ساتھ چلنے لگی۔ بچوں کا یہ رویہ گھر پر کسی پریشانی کی نشاندہی کرتا ہے۔ کیونکہ بچے عموماً کسی اجنبی کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں اور روتے ہیں۔ یہ فطری عمل ہے تا کہ وہ اپنی حفاظت کر سکیں۔ دراصل بہار نے اس چھوٹی سی عمر میں اتنے اجنبی چہرے دیکھے تھے کہ وہ ان کی عادی ہو گئی تھی۔

بہار ایک خوبصورت انگریز بچی تھی، جس کو ماں اور باپ دونوں کا پیار نہ مل سکا۔ اس کی ماں عمر میں اس کے باپ سے آدھی تھی۔ وہ شراب کی عادی تھی اور بہار کا باپ ایک غنڈہ تھا۔ اس کا سارا خاندان اس علاقہ کا جانا پہچانا مجرمانہ گھرانہ تھا اور اُن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ شدید نسلی تعصّب رکھتے تھے۔ میرے کچھ کولیگز کا کہنا تھا کہ مجھے یہ کیس ملنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کیونکہ وہ مجھے نسلی تعصّب کا شکار بنا سکتے تھے۔ بہار کی ماں کی ملاقات اس کے باپ سے ہوئی اور ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ مغرب میں جوڑے بنا شادی کے رہتے ہیں۔

اس مکروہ فعل سے پورے معاشرے پر بُرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ نکاح ایک مقدس بندھن ہے جو ایک قانونی دستاویز ہے جو زن و مرد کو مخصوص حقوق و فرائض عطا کرتا ہے۔ ''نکاح محض اس چیز کا نام نہیں کہ مرد و عورت کا جنسی تعلق قانون کے دائرے میں آجائے۔ یہ ایک معاہدہ ہے جس سے خاندان کا ادارہ وجود میں آتا ہے۔ یہ ادارہ انسانیت کی ناگزیر ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسان کی حیاتی، نفسیاتی اور معاشرتی ضرورتیں کسی طرح پوری نہیں کی جاسکتیں۔'' (جاوید احمد غامدی)

مرد کے لیے بچہ ایک ذمہ داری بن جاتا ہے۔ جس سے معاشرہ بے راہ روی سے بچ جاتا ہے کیونکہ بچے کو ماں کی ہی نہیں بلکہ باپ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ شادی کے بغیر تعلق رکھنے کی وجہ سے قانونی طور پر مرد آزاد ہے کہ وہ اولاد سے تعلق رکھے یا نہیں۔ بچے نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور معاشرے میں بہت بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ نچلے طبقے میں پڑھے لکھے طبقہ کی نسبت شدید ہے۔ مغربی سسٹم بھی اس بگاڑ کو ہوا دے رہا ہے کیونکہ بچوں والی عورت کو پیسے ملتے ہیں کہ وہ بچوں کی دیکھ بھال کرے، اسے گھر بھی مفت ملتا ہے اور اس کے علاوہ بھی کئی سہولیات ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ بہت سارے لوگ شادی نہ کرنے میں عافیت محسوس کرتے ہیں کیونکہ شادی جہاں مرد پر اضافی ذمہ داری ڈالتی ہے وہاں عورت کو بھی باندھ دیتی ہے۔ وہ آزادی سے محروم ہو جاتی ہے اور پیسوں کے لیے مرد کی محتاج ہو جاتی ہے۔

بہار کا باپ مارٹن بھی اسی لیے اپنی فیملی کے ساتھ کہیں اور رہتا تھا۔ وہ کیٹی سے کیسے ملا اس کی تفصیلات تو مجھے یاد نہیں۔ لیکن اتنا پتا ہے کہ وہ اور کیٹی کچھ عرصہ ساتھ بھی رہے۔ غالباً ایسا اس وقت ہوا ہو گا جب کیٹی کو پتا لگا ہو گا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ کیٹی شراب کی عادی تھی اور اسے ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت کی کہ اسے شراب چھوڑنا ہو گی ورنہ بچے پر اس کے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ کیٹی نے اس بات پر کوئی دھیان نہ دھرا۔ دراصل شراب ایک بُرا نشہ ہے اگر اس کی زیادتی کے عادی ہو جائیں تو اس کو چھوڑنے کے لیے باقاعدہ بحالی (rehab) میں جانا پڑتا ہے جیسے کہ الزبتھ ٹیلر کے ساتھ ہوا تھا۔ بہرحال ہسپتال والوں کی ٹیم نے ہسپتال کے سوشل ورکر کو خط لکھا اور انھوں نے مارٹن اور کیٹی کی فیملی سے بات چیت شروع کی۔ مارٹن نے سب کو تسلی دی کہ وہ کیٹی کا خیال رکھے گا۔ لیکن سوشل ورکر کی تسلی نہ ہوئی۔

مغرب میں سوشل ورکر کے پاس بہت سارے اختیارات ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے تو کیٹی سے پیدائش کے بعد بچی لے کر کسی دیکھ بھال کرنے والے ادارے (foster care) کو دے سکتے تھے جو حکومت سے پیسے لے کر اس بچی کو پرورش کرتے۔ یہ سسٹم بے حد مربوط اور پیچیدہ ہے۔ عدالت کو مطمئن کرنا ہوتا ہے کہ یہ بچے کے حق میں واحد بہترین حل ہے۔ میں آہستہ آہستہ اس کے بارے میں آپ کو مزید بتاؤں گی۔ ہاں تو سوشل ورکر مطمئن نہ ہوئی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ مارٹن ایک مجرم صفت انسان ہے اور وہ ماضی میں اپنی بیوی کو مارتا رہا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کیٹی کی شراب نوشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ساتھ تعلقات رکھے ہوئے ہے۔ لیکن ناکافی ثبوت ہونے کے باعث انھوں نے کیٹی پر محض نظر رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ایسا کرنے کے لیے انھیں کیس کھلا رکھنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ دایہ (midwife) جو کہ کیٹی کا باقاعدگی سے معائنہ کرتی تھی، کے پاس اختیار ہے کہ وہ سوشل سروسز کو مطلع کر سکتی تھی کہ حالات کس نہج پر ہیں۔

بہار پیدا ہوئی اور ایک دردناک کہانی کا آغاز ہوا۔ سوشل سروسز کو ہمسایوں نے آگاہ کرنا شروع کیا کہ ایک گھر سے بچی کے چیخنے کی آواز آتی ہے اور ایک مرد عورت و بچی پر چلا رہا ہوتا ہے۔ سوشل ورکر نے گھر کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ مارٹن کو بچی کا رونا بُرا لگتا ہے اور وہ دونوں پر چلاتا ہے۔ سوشل ورکر خفا ہو گئی کہ مارٹن جوان بچوں کا باپ اور دادا بھی ہے اور اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ بچوں کا رونا فطری عمل ہے۔ اس نے اپنے مینیجر سے ''اسٹریجی'' بلانے کو کہا، یہ عمل سیکشن 37 کے تحت ہوتا ہے جو کہ دی چلڈرن ایکٹ 1989 کا حصہ ہے۔ اسٹریجی کا مطلب ہے کہ ایک بچہ کسی بھی قسم کے خطرہ کا شکار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا پولیس اور سوشل سروسز مل کر طے کرتے ہیں کہ کیا کرنا ہے؟ ایسا عموماً فون پر ہوتا ہے تا کہ قیمتی وقت بچایا جا سکے۔

اسٹریجی کے نتیجہ میں کانفرنس برائے حفاظت اطفال (child protection conference) بلائی گئی۔ کانفرنس کا سربراہ ایک تجزیہ کار لیکن آزاد سوشل ورکر ہوتا ہے اور شرکاء میں بچے کا ڈاکٹر، ہیلتھ وزیٹر، مڈوائف، پولیس، سوشل ورکر اور جو بھی اس بچے سے متعلقہ پیشہ ور افراد ہیں وہ شرکت کرتے ہیں۔ کانفرنس نے مارٹن کو گھر سے چلے جانے کو کہا کیونکہ مارٹن ماضی میں بھی تشدد سے کام لیتا تھا۔ ڈر تھا کہ وہ غصہ میں قابو نہیں رکھ پائے گا اور کیٹی اور بہار پر ہاتھ اٹھا لے گا۔

انھوں نے اسی کارروائی کی بیچ بینی ابھی سے کر

دی۔ لیکن کوئی بھی بہار کو باپ اور دادھیال کے پیار سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا فیصلہ ہوا کہ مارٹن مخصوص دنوں میں بہار سے چند گھنٹوں کے لیے مل سکتا ہے اور خاندانی تقریبات کے موقع پر بھی موجود ہو گی تا کہ اسے اپنے کزنز سے ملنے کا موقع ملے۔ کیٹی بھی شاید مارٹن کے رویہ سے تنگ تھی اور اس نے موقع کو غنیمت جانا اور پیش کش قبول کر لی۔

لیکن اختر عباس صاحب میرے تجربے نے سکھایا ہے کہ انسان کو عافیت کا لمحہ میسر آ جائے تو وہ پھر سے اپنے رویہ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ میں نے تبدیلی کے عمل کو بہت سست اور کم پایا۔ تبدیلی تبھی رونما ہوتی ہے جب انسان ادراک کی بھٹی سے گزرے۔ یہ بہت جان لیوا عمل ہے اور بہت کم لوگ اس عمل سے گزرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ لیکن اختر صاحب ایک دفعہ جب انسان اس عمل خود آگاہی سے خود کو گزار لے تو اس کے اندر تدبر کی ایسی لہر اٹھتی ہے جو اس کو عافیت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ لیکن افسوس! کیٹی اتنی باشعور نہ تھی کہ حالات کی نزاکت کو سمجھ سکتی اور اپنی زندگی کو سنوار سکتی۔ وہ دلدل میں دھنستی چلی گئی۔ ہمیں اطلاعات ملنی شروع ہوئیں کہ کیٹی کے گھر پر مردوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے اور ایک بچی کے رونے کی آوازیں آتی ہیں۔

ایک دفعہ پھر سوشل سروسز کا محکمہ سرگرم عمل ہو گیا اور ان کو 23 گھنٹوں کے اندر اندر تفتیش کرنی تھی کہ کیا بہار کو کوئی خطرہ تو درپیش نہیں۔ کوئی ثبوت نہ مل سکا سوائے اس کے کہ بہار کی پرورش میں کمی رہ گئی ہے۔ کیٹی کا گھر گندا تھا، وہ شراب کے نشہ میں دھت تھی، وہ ہیلتھ وزیٹر کے ساتھ تعاون نہیں کر رہی تھی۔ سوشل سروسز نے اس کو چائلڈ اینڈ سپورٹ سروسز کے پاس بھی بھیجا جو والدین کو بچوں کی پرورش میں مدد دیتے ہیں۔ انھوں نے کیٹی کو کیلنڈر لا کر دیا تا کہ بہار کی تمام اپائنٹمنٹ کا ریکارڈ رکھا جائے۔ انھوں نے کیٹی کو بتایا کہ وہ کیسے شیڈول بنا کر گھر کو صاف رکھ سکتی ہے؟ لیکن کیٹی کو شراب کے سوا کچھ پیارا نہ تھا۔ وہ ایک دلدل میں گر چکی تھی۔ ہم نے اس کو دلدل سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ہم نے اسے کہا کہ اسے بہار یا شراب میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔

آپ انسانی نفسیات کو جانتے ہیں۔ آپ کے خیال میں کیا ہوگا؟ کیٹی نے شراب کو چن لیا۔ اسے ری ہیب میں بھیجا گیا اور بہار کو فوسٹر والدین کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس سے پہلے سوشل ورکر نے انتہائی تن دہی سے بہار کے ننھیال اور ددھیال کی پڑتال کی شاید کوئی اسے رکھ سکے۔ لیکن وہ مجرم پیشہ لوگ تھے اور سوشل سروسز آنے والی نسل کو جرم سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ اس تمام عرصہ کے دوران بہار کی عمر چار سال ہو چکی تھی اور اسکول جاتی تھی۔ سوشل سروسز نے اس کے لیے برسٹل سے باہر گھر کا بندوبست کیا تا کہ اس کے خاندان والے فوسٹر والدین کو تنگ نہ کریں۔ تاہم بہار کا اسکول نہ بدلا گیا کیونکہ اس سے بہار کی تعلیم میں رخنہ پڑنے کا خطرہ تھا۔ ایک چار سالہ بچی ریاست کی ذمہ داری بن گئی، ریاست نے بھی اس ذمہ داری کو والدین سے زیادہ بڑھ کر نبھایا۔ ہم ہر روز بہار کو اسکول کے بعد اس کی ماں، باپ، دادا اور دادی سے ملانے لے کر جاتے۔ ہر روز کسی رشتہ دار کے لیے مخصوص ہوتا۔ بہار کے لیے یہ لمحے بہت مسرت انگیز ہوتے۔

دشل بہار بن جاتی، راستہ میں ہر اسٹانی، ہر بچے کو بتاتی جاتی کہ آج میں اپنی ماں یا باپ سے ملنے جا رہی ہوں۔ وہ ہنستی گاتی، تھرکتی تتلی تھی۔ بے حد حسین لیکن بے حد پارہ صفت ایک لمحہ اس کے لیے بیٹھنا مشکل تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اسے ''الکوحل سینڈروم'' ہے۔ ایسے بچوں کو ماں کے پیٹ میں شراب کی لت لگ جاتی ہے اور ان کا دماغ پارہ صفت ہو جاتا ہے۔

اس نے عجیب کھیل کھیلنا شروع کر دیئے۔ جنسی نوعیت کے کھیل، وہ بچوں کے منہ پر پیار کرتی، ان کے اوپر لیٹ جاتی، ان کے نازک حصوں کو چھوتی، اسکول میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ تعلیم یافتہ معاشرے میں ایسے معاملات کی انتہائی سمجھ داری سے تحقیق کی جاتی ہے تا کہ بچے کو کسی طرح کی شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اسکول نے مصلحت سے کام لیا اور بہار کی سوشل ورکرز کو مطلع کر دیا۔ غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ بہار کو کیٹی کے غیر جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ کیٹی یقیناً مارک کی غیر موجودگی میں شراب کا نشہ پورا کرنے کے لیے مردوں کو گھر پر بلاتی ہوگی اور کسی نے کیٹی کے دھت ہونے کا فائدہ اٹھا کر ننھی بہار کو ہوس کا نشانہ بنایا۔ جنسی استحصال میں محض بھرپور جنس شامل نہیں بلکہ کسی کو گندی نگاہ سے دیکھنا اور اس کے جسم کے حصوں کو محسوس کرنا بھی ہے۔ ننھی بہار کے ساتھ یہ کھیل کھیلا گیا اور قیاس ہے کہ اسے بتایا کہ یہ بھی ایک کھیل ہے جو انکل اس کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ بہار کے لیے یہ ایک کھیل بن گیا۔ بہار کو کسی بھی صورت میں قصور وار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس معصوم کو تو معلوم ہی نہیں کہ کیا صحیح ہے کیا غلط؟

اختر صاحب، کبھی کبھی قدرت ایک معصوم بچے کے ساتھ اتنا ظلم کیوں کرتی ہے؟ اسے اتنا حساس کیوں بنا دیتی ہے کہ وہ ہر جذبہ کو شدت سے کیوں محسوس کرتے ہیں؟ اگر کسی کو حالات کی سنگینی کا علم نہ ہو تو وہ اسے آرام سے کاٹ لیتا ہے۔ لیکن درد کا احساس ہو جائے تو تب زخم ناسور بن جاتا ہے۔ چار سالہ بہار کے ساتھ بھی یہی ظلم ہوا۔ اسے خدا نے بہت حساس اور پیار کرنے والا بنایا تھا۔ لیکن اس کو قدر کرنے والے والدین نہ ملے۔ میں جب اسے اس کے والدین سے ملانے لے کر جاتی تو میرا دل کٹ جاتا۔ وہ اپنی ماں کے چہرے کو بار بار ہاتھ لگا کر کہتی 'آئی لو یو ممی'۔ چار سال کی عمر میں وہ اتنی سمجھدار تھی کہ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے والدین کے پاس نہیں رہ سکتی۔ میں اسے کہتی، بہار تمھارا وقت ختم ہو گیا ہے تو وہ بغیر کچھ کہے اپنا بستہ اٹھاتی اور چل پڑتی۔ لیکن اس کی نگاہوں میں ایک گہرا درد ہوتا۔ وہ میرا ہاتھ تھام لیتی، لیکن اس وقت تک نہ قدم اٹھاتی جب تک اس کی ماں یا باپ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جاتے۔ ان کے جاتے ہی وہ ایک آہ بھرتی اور میرے ساتھ چل پڑتی۔ سارے رستے خاموش رہتی لیکن میرے بلانے پر بھی نہ بولتی۔ جب میں اس کی طرف دیکھتی تو وہ مسکرا دیتی۔ اختر صاحب کیا بتاؤں؟ اس بچی کی مسکراہٹ میں کتنا درد ہوتا۔ ایک کاٹ ہوتی، ایک سوال ہوتا کہ اس قصے میں کون دوشی ہے؟ میری ماں جو شراب نہیں چھوڑ سکتی یا میرا باپ جو مجرم ہے یا یہ سسٹم جس نے مجھے میری ماں سے جدا کر دیا ہے؟ یہ میرا بھلا چاہتے ہیں لیکن اس کی قیمت میری درد بھری مسکراہٹ ہے۔ میرا جواب

ہوتا، خدا تمھارا قصوروار ہے جس نے تمھیں حساس روح دے کر ان حالات کو تمھارے لیے ناقابل برداشت بنا دیا ہے۔

فوسٹر والدین کے ہاں پہنچتے ہی وہ بچی جن بن جاتی اور کسی کے قابو میں نہ آتی۔ کبھی پیڑوں پر چڑھ جاتی اور کبھی کھائے چلی جاتی۔ سب کو شکایت تھی کہ وہ اپنے درد کا اظہار کسی سے نہیں کرتی۔ اس سے لاکھ پوچھتے لیکن وہ کچھ نہ کہتی۔

ایک دن اسکول کے بعد میں اسے اس کی ماں سے ملانے لے کر گئی۔ اس کی ماں نے کافی ساری ملاقاتیں مس کر دی تھیں اور شک تھا کہ وہ شراب میں مگن ہے۔ بہار کے لیے یہ لمحے قیامت کے تھے کہ جب اسے بتایا جاتا کہ اس ماں نہیں آئی۔ وہ چپ کے ایک گہرے سمندر میں غرق ہو جاتی لیکن منہ سے کچھ نہ کہتی۔ آرام سے گاڑی میں بیٹھ کر فوسٹر والدین کے ہاں جا کر دھمال مچاتی۔ بس ایک دفعہ اس نے دھیرے سے کہا، ''یو نو آئی مس مائی ممی'' (معلوم ہے مجھے ماں یاد آتی ہے) میں نے اسے کریدنا چاہا تو ایک دم خاموش ہو گئی جیسے اس سے کوئی غلطی ہوئی ہو۔

اس کی خاموشی میں ایک شدت تھی جیسے وہ آنے والے وقت کو دیکھ سکتی ہو اور ہوا بھی ایسا۔ اس کی ماں نے ملاقاتیں بند کر دیں۔ اس کے لیے جدائی شاید بہت اندوہناک تھی اور اس لیے اس نے شاید خود کو شراب کے نشے میں ڈبو لیا۔ لیکن ہماری نظر میں وہ ایک خودغرض ماں تھی جس کے لیے بہار کے جذبات سے زیادہ خود کے جذبات کی اہمیت تھی۔ اس کے لیے شراب اہم تھی۔ دراصل نشہ کسی بھی انسان کو انسانیت کے درجے سے گرا دیتا ہے۔ لہٰذا ہر قسم کے نشہ سے دور رہنا ضروری ہے۔ اپنی اولاد سے تو کیٹی کو ضروری پیار ہو گا لیکن احساس ندامت کہ اس نے بہار کے ساتھ زیادتی کی ہے نے اس کو مزید دلدل میں گرا دیا۔ وہ اتنی بہادر نہ تھی کہ خود احتسابی کر کے اپنی اور بہار کی زندگی بچا لیتی۔ آخری اطلاع تک وہ برمنگھم جا چکی تھی اور جسم فروشی میں ملوث تھی۔ اس نے ایک دفعہ سوشل ورکر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی اور فون پر بہت رو رہی تھی لیکن اس کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

بہار تیزی سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہونا شروع ہو گئی، یہاں تک کہ اس کے فوسٹر والدین کے لیے اسے سنبھالنا کٹھن ثابت ہونے لگا۔ بہار کو شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ وہ اس کے اصلی والدین نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ بھی ان سے بدتمیزی کرتی۔ جب وہ تھک جاتے تو سوشل سروسز کو فون کر کے کہتے کہ بہار کو کچھ عرصے کے لیے ''ریسپیاٹ'' پر بھیج دیا جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی اور فوسٹر والدین کے پاس رہ لے۔ اس سے بھی بہار کی نفسیات پر اثر ہوا کہ مجھے کوئی بھی نہیں چاہتا۔ میری فیملی نہیں ہے، میں بھری دنیا میں تنہا ہوں۔ اسی دوران اس کا بازو ٹوٹ گیا اور وہ بار بار اپنی فوسٹر ماں سے پوچھتی، ''میری ماں نہیں ہے، میرا کون خیال رکھے گا۔ کیا آپ میرا خیال رکھیں گی۔'' وہ بار بار ہر کسی سے سننا چاہتی کہ وہ اسے پیار کرتے ہیں، وہ بہت پیاری بچی ہے۔ اس کا عدم تحفظ ڈھیر سارے مسائل کا پیغام بن گیا۔ وہ اپنے کپڑوں میں بول و براز کرنے لگی۔ وہ اپنے گندے زیر جامہ چھپا دیتی۔ فوسٹر والدین بو سونگھتے سونگھتے

اس کے کمرے تک جاتے اور اسے صاف کرتے۔ وہ روتی تو روتی چلی جاتی، کھیلنے پر آتی تو رکتی ہی نہ تھی۔

بہار نے حالات کی سنگینی سے بچنے کے لیے ایک خیالی دنیا تراش لی۔ وہ اکثر اسکول میں بتاتی کہ کیسے اس کا باپ اسے گھڑ سواری سکھا رہا ہے، اس کے گھوڑے کا نام ٹام ہے۔ رات کو ایک پری اس سے ملنے آتی ہے وغیرہ۔

سوشل ورکر اس کے بارے میں بہت فکر مند رہنے لگی اور اسے ایک ادارہ ''کیمپز'' کے پاس بھیجا گیا جس میں نفسیات دان ایسے بچوں کی الجھنیں دور کرتے ہیں۔ اسی دوران بہار کا رابطہ اپنے باپ اور نانا نانی سے بھی منقطع ہو گیا۔ وہ اپنی دنیا میں مگن تھے۔ اس کے نانا نانی ویسے بھی اچھے والدین ہوتے تو اس کی ماں آج ان حالات کا شکار نہ ہوتی۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ بہار کو گود دے دیا جائے۔

یہ ایک بہت ہی لمبا اور دشوار طریقہ کار ہے۔ گود لینے کے آرزومند والدین کی ٹھیک طرح سے تفتیش ہوتی ہے، ذریعہ آمدنی معلوم کیا جاتا ہے، اکثر والدین نومولود بچہ لینے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ لہٰذا بہار کے لیے یہ راہ ناممکن تھی خصوصاً جب کہ اس کی عمر نو سال ہو چکی تھی اور وہ نفسیاتی مسائل کا بھی شکار تھی۔

مستقبل اس کے لیے کیا لے کر آئے گا؟ غیب کا علم صرف خدا کی صوابدید پر ہے۔ لیکن قیاس بتاتا ہے کہ ایسے بچے عموماً پڑھائی مکمل نہیں کر پاتے اور زندگی بھر مسائل کا شکار رہتے ہیں۔ جس میں عدم تحفظ سرفہرست ہے۔ اس کے علاوہ رشتوں پر عدم اعتماد، خود ترسی اور احساس کمتری بھی شامل ہیں۔ ایسے بچے جرم میں تحفظ محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہ معاشرے سے بدلالے رہے ہوتے ہیں اور بچیاں پُرتشدد مردوں سے رشتہ استوار کر لیتی ہیں کیونکہ وہ اس طرح سے ساری عمر خود ترسی کی فضا میں سانس لیتی ہیں۔

اس لیے قیاس ہے کہ بہار کو کوئی لڑکا اسکول میں توجہ دے گا اور وہ تنکے کو شہتیر جان کر اس کا سہارا لے گی اور جسمانی تعلقات جلد قائم کر لے گی اور نتیجتاً جلد ماں بن جائے گی۔ ایسے حالات میں ان افراد اور سوشل سروسز کا چولی دامن کا ساتھ بن جاتا ہے کیونکہ ان کے بچے کو جرم یا گھریلو حالات سے تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ انتہائی حالات میں ان کے بچے بھی چھین لیے جاتے ہیں جیسا کہ بہار کی ماں کے ساتھ ہوا۔ گویا زندگی ایک نہ ختم ہونے والے دکھ کا سفر بن جاتی ہے۔

یہاں ہم سب کے لیے ایک بہت اہم سوال ابھرتا ہے جو ازل سے انسان کو پریشان کرتا رہا ہے اور اپنی تمام تر ترقی کے باوجود بھی مغرب کے لیے ایک معمّہ ہے۔ وہ سوال ہے جبر و قدر کا، کتنا اختیار انسان کو اپنی تقدیر پر ہے؟ کیا یہ تمام واقعات بہار کی زندگی میں تقدیر نے لکھ دیے تھے یا محض اتفاقات کا مجموعہ ہیں۔ انسان کو اپنی تقدیر بنانے پر کتنا اختیار حاصل ہے؟ کیا کوئی بھی سسٹم انسان کی تقدیر کو بدل سکتا ہے؟ سوشل سروسز کی تمام محنت و کوشش کے باوجود بہار کی تقدیر کی سیاہی کو سفیدی میں کیوں نہیں تبدیل کیا جا سکا۔ کیا بہار کی زندگی میں کبھی بہار آئے گی؟ کون جانے!! ■■■

جرمن کہانی

ہوٹل کی رات

ایک باپ کی پریشانی کا ماجرا وہ اپنے ہی بیٹے کو دھوکا دینے والا تھا

زیگفرٹ لینس / محمد اسحاق میر

نائٹ لیڈی پورٹر نے پہلے اپنی انگلیوں کے نوتراشیدہ ناخن ایک کھلے ہوئے رجسٹر کے صفحے پر پھیرے، پھر معذرت کا اظہار کرنے کے لیے اپنے شانے اُچکائے اور کچھ اس طرح بائیں جانب مڑ کر دیکھا کہ اس کی بغل کے نیچے وردی کے کپڑے میں خطرناک حد تک کھچاؤ پیدا ہوگیا۔

''بس صرف یہی ایک کمرا ہے۔'' اس نے کہا، اتنی رات گئے آپ کو کسی بھی ہوٹل میں سنگل روم نہیں ملے گا۔ آپ شوق سے کسی اور جگہ قسمت آزمائی کر سکتے ہیں، لیکن یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ جب آپ ہر طرف سے مایوس ہو کر دوبارہ یہاں آئیں گے تو پھر ہم بھی آپ کی کوئی خدمت کرنے کے قابل نہ رہیں گے، اس ڈبل بیڈ روم کی خالی جگہ، جو خدا جانے آپ کیوں پسند نہیں کرتے، یقیناً آپ کی واپسی سے پہلے ہی پُر ہو چکی ہوگی اور اس پر آپ کی بجائے کوئی دوسرا تھکا ماندہ مسافر محوِ استراحت ہوگا۔''

''اچھا! تو پھر ٹھیک ہے۔'' شوام بولا ''یہ بستر آپ میرے نام پر بک کر دیں، لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اس کمرے میں دوسرا مسافر کون ہے؟ یہ بات میں کسی خوف یا شبہے کی بنا پر نہیں پوچھ رہا۔ حاشا! ایسی کوئی بات نہیں، میں صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میرا ساتھی اس وقت کمرے میں موجود ہے؟ دیکھیے نا، میں اسے ساتھی، کہنے میں بالکل حق بہ جانب ہوں، آخر مجھے آج کی ساری رات اسی کے ساتھ گزارنی ہے۔''

''جی ہاں۔'' پورٹر نے کہا ''آپ کا ساتھی کمرے میں موجود ہے اور غالباً سو رہا ہے۔''

''سو رہا ہے.....''

پورٹر نے الفاظ دہرائے، پھر اس نے ضروری فارم مانگے، انھیں پُر کیا اور پورٹر کے حوالے کر کے زینہ چڑھ کر بالائی منزل پر چلا گیا۔

اپنے کمرے کا نمبر دیکھتے ہی فوراً رک گیا۔ اس نے سانس روک کر دروازے سے کان لگا کر کچھ سننا چاہا، مگر اسے کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ اس نے جھک کر چابی کے سوراخ سے اندر جھانکنا چاہا، مگر وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ نیچے زینے میں پاؤں کی چاپ سنائی دی، کوئی شخص نیچے سے اوپر آرہا تھا۔ شوام نے سوچا، اس طرح یہاں بے کار کھڑے رہنا بڑی معیوب بات ہے، مجھے فوراً حرکت میں آنا چاہیے تاکہ جو شخص نیچے سے اوپر آرہا ہے وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اس راہ داری میں بھول کر چلا آیا ہوں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کے فوراً اندر چلا جاؤں۔ اس کمرے میں داخل ہونا اب میرا قانونی حق بن چکا ہے اور اس میں میرا ساتھی بھی سو رہا ہے۔ یہ سوچتے ہی اس نے سامنے کے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور کمرے میں داخل ہو کے دروازہ بند کر دیا۔ بجلی کا بٹن ڈھونڈنے کے لیے اس نے اپنے ہاتھ سے دیوار ٹٹولنی شروع کر دی، لیکن وہ اچانک رک گیا۔ کسی شخص نے اسے مدھم مگر پُر وقار آواز میں مخاطب کر کے کہا ''دیکھیے صاحب! بلب جلانے کی زحمت نہ فرمائیے۔ اگر آپ یہ کمرا تاریک ہی رہنے دیں تو یہ آپ کی نوازش ہوگی۔''

''شاید آپ میرا انتظار کر رہے ہیں۔'' شوام کھسیانا سا ہو کے بولا۔

اجنبی مسافر نے اس سوال کا جواب دینے کی بجائے اسے کہا ''بڑی احتیاط سے قدم اٹھائیے، ایسا نہ ہو کہ میری بیساکھی سے آپ کو ٹھوکر لگ جائے اور آپ دھڑام سے میرے سوٹ کیس پر گر پڑیں، یہ سوٹ کیس کمرے کے بالکل بیچوں بیچ رکھا ہوا ہے۔ خیر، میں آپ کی رہنمائی کیے دیتا ہوں، پہلے آپ دیوار کے ساتھ ساتھ تین قدم آگے بڑھیں، پھر بائیں جانب مڑ کر مزید دو قدم چلیں، اس کے بعد آپ بستر اپنے سامنے پائیں گے اور ہاتھ بڑھا کر اسے چھو بھی سکیں گے۔

شوام نے ایسا ہی کیا۔ بستر تک پہنچ کر اس نے اندھیرے میں کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر لیٹ کر رضائی اوڑھ لی۔ اب اسے اپنے ساتھی کے سانسوں کی آواز بالکل قریب سے سنائی دے رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ فوری طور پر سو جانا اس کے بس کی بات نہیں۔

''اور ہاں.....'' اس نے ہچکچاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا ''میرا نام شوام ہے۔''

''واقعی؟''

''جی ہاں۔''

''غالباً آپ کسی کانفرنس کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔''

ساتھی نے پوچھا۔

''جی نہیں۔ لیکن شاید آپ.....''

''نہیں۔''

''تو پھر کسی کاروبار کی خاطر؟''

''نہیں۔'' ساتھی نے جواب دیا۔

''بہرکیف۔'' شوام نے کہا ''میرے یہاں آنے کا مقصد بہت انوکھا ہے اور مجھے یقین نہیں آتا کہ کبھی کوئی اور شخص اس غرض سے یہاں آیا ہو۔''

قریبی ریلوے یارڈ میں شنٹنگ ہو رہی تھی اور جب مال گاڑی کے ڈبے ایک دوسرے سے ٹکراتے تو

ہوٹل کی دیواریں ہل جاتیں اور مسافروں کے بستر کانپ اٹھتے۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے آپ یہاں خودکشی کرنے آئے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" شوام نے جھٹ جواب دیا "کیا یہ اندازہ آپ نے میری صورت دیکھ کے لگایا ہے۔"

"آپ کی صورت؟ وہ تو میں نے ابھی تک نہیں دیکھی کیونکہ کمرا اس وقت تاریک ہے۔"

شوام نے مصنوعی طور پر اطمینان کا سانس لے کر کہا "خدا مجھے اس حماقت سے محفوظ رکھے، یقین مانیے میں ہرگز یہ نیت لے کر یہاں نہیں آیا، سنیے مسٹر..... (اس استفہامیہ وقفے کے باوجود ساتھی نے اپنا نام نہ بتایا) بات دراصل یہ ہے کہ میرا ایک ضدی سا لڑکا ہے اور میں آج محض اس کی خاطر یہاں آیا ہوں۔"

"کیا وہ یہاں کسی ہسپتال میں زیرِ علاج ہے؟"

"آخر کیوں؟" شوام حیران ہو کر بولا "وہ تو خیر سے بالکل تندرست ہے، ہاں البتہ اس کے چہرے کی رنگت قدرے زردی مائل ہے، وگرنہ وہ بالکل بھلا چنگا ہے، میں تو آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں آج اس شہر میں کیوں آیا ہوں اور اس کمرے میں میرے آنے کی کیا وجہ ہے؟ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میرے یہاں آنے کا باعث میرا لڑکا ہے، وہ ضرورت سے زیادہ حساس اور انتہائی نازک مزاج ہے اگر اس پر کسی چیز کا سایہ بھی پڑ جائے تو اس کی طبیعت مضمحل ہو جاتی ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر آپ اسے کسی ہسپتال میں کیوں داخل نہیں کرا دیتے؟"

"آخر کس لیے؟" شوام نے آواز بلند کر کے کہا "جناب! میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ میرا لڑکا بالکل تندرست ہے۔ ہاں، اسے صرف ایک خطرہ لاحق ہے اور وہ ہے اس کا شیشے سے بھی نازک دل..... بس یہی چیز اس کے لیے خطرے کا باعث بن گئی ہے۔"

"آخر وہ خودکشی کیوں نہیں کر لیتا؟" ساتھی نے پوچھا۔

"سنیے! پہلے آپ ایک مرتبہ میری بات پوری طرح سن لیجیے۔ میں بار بار کہتا جا رہا ہوں کہ میرا لڑکا بالکل معصوم اور کم سن ہے۔ آپ کا سوال مجھے بہت عجیب سا لگتا ہے۔ خیر، میں صرف یہی کہوں گا کہ آپ کا قیاس بالکل غلط ہے۔ جو خطرہ میرے بچے کو درپیش ہے، اس کی تفصیل کچھ یوں ہے: "وہ ہر روز ریل گاڑی کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ جب گاڑی قریب آتی ہے تو وہ اپنا ہاتھ ہلا ہلا کر ریل کے مسافروں کو سلام کرتا ہے اور اس کے بعد اس کی طبیعت مرجھا جاتی ہے۔"

"اچھا..... تو پھر؟"

"پھر....." شوام نے کہا "پھر وہ اپنے اسکول چلا جاتا ہے، لیکن جب وہ گھر واپس آتا ہے تو اس کا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ وہ بے حد مغموم اور کسی گہرے خیال میں مستغرق نظر آتا ہے، بعض اوقات وہ بلا وجہ رونے بھی لگتا ہے۔ اسکول کے کام میں وہ قطعاً دلچسپی نہیں لیتا، کھیلنا کودنا بھی اس نے ترک کر دیا ہے اور وہ کسی سے بات کرنے کا بھی روادار نہیں۔ کئی مہینوں سے اس کی یہی حالت ہے، ہر روز ہمارے گھر میں یہی تماشا ہوتا ہے۔ یاد رکھیے! میرے بچے کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"لیکن آخر وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟"

"یہ بھی سن لیجیے۔" شوام نے جواب دیا اس عجیب رویے کا باعث بھی بالکل انوکھا ہے، جب پھاٹک کے

پاس سے ٹرین گزرتی ہے تو میرا لڑکا اپنا ہاتھ ہلا ہلا کے مسافروں کو سلام کرتا ہے، مگر کوئی مسافر بھی اس کی بھلائی کی خاطر ہاتھ سے اشارہ کر کے اس کے سلام کا جواب نہیں دیتا، انسانوں کی یہ سرد مہری دیکھ کر بچے لڑکے کا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ مسافر اس کے سلام کا جواب دینے کے پابند نہیں۔ اگر کوئی اس قسم کا قانون بنایا بھی جائے تو وہ میرے نزدیک انتہائی مضحکہ خیز ہوگا۔"

ساتھی بولا، "غالباً آپ اپنے لڑکے کی یہ ذہنی الجھن دور کرنے کے لیے بہ نفسِ نفیس اسی گاڑی سے سفر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"لیکن مجھے تو ذاتی طور پر بچے اچھے نہیں لگتے بلکہ میں ان سے نفرت کرتا ہوں، ان سے کوسوں دور بھاگتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے محض ایک بچے کی وجہ سے اپنی بیوی کی جان گنوا دی ہے، وہ بے چاری پہلی زچگی کے دوران ہی خدا کو پیاری ہو چکی ہے۔"

"یہ سن کر مجھے سخت قلق ہوا ہے۔" شوام نے بے خانہ انداز میں کہا، پھر اس نے انگڑائی لی، اب اس کا دماغ اچھی طرح سے گرم ہو چکا تھا اور اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار آ گیا تھا۔

"میرا اندازہ ہے کل آپ صبح کی ٹرین سے کورس جائیں گے؟" ساتھی نے کہا۔

"آپ کا انداز بالکل درست ہے۔" شوام نے جواب دیا۔

"لیکن کیا آپ کو اس حرکت پر شرم نہ آئے گی؟ آپ کی بات تو یہ ہے کہ اپنے بچے کو اس طرح دھوکا دینا بہت ہی افسوس بات ہے، آپ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ سراسر فریب اور مکر ہے۔"

یہ سن کر شوام غصے میں آ گیا "دیکھیے صاحب! آپ حد سے بڑھنے کی جرأت نہ کریں، مجھے آپ کی دیدہ دلیری پر سخت تعجب ہے۔"

یہ کہہ کر شوام نے چپ سادھ لی، اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی، اپنا سر رضائی سے ڈھانپ لیا اور چند لمحے کچھ سوچنے کے بعد وہ سو گیا۔

صبح کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو اس کا ساتھی کمرے میں موجود نہ تھا۔ جب اس کی نگاہ گھڑی پر پڑی تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ ٹرین کی روانگی میں اب صرف 5 منٹ باقی تھے اور اتنے قلیل وقت میں اسٹیشن پہنچ کر گاڑی میں سوار ہونا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

شہر میں مزید ایک رات قیام اسے گوارا نہ ہوا اور وہ مایوس و ناکام ہو کے دوپہر کے وقت اپنے گھر پہنچا۔

اس کے لڑکے نے دروازہ کھولا، وہ آج غیر معمولی طور پر پُرجوش اور خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔ باپ کو دیکھتے ہی وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور اس کی رانوں پر لاڈ سے مکے مارتے ہوئے چلایا، "ابا! آج مجھے سلام کا جواب مل گیا ہے ایک مسافر دیر تک میری جانب اشارے کرتا رہا تھا۔"

"کیا اس کے ہاتھ میں بیساکھی تھی؟"

"ہاں تھی۔ اس نے بیساکھی ہلا ہلا کر میرے سلام کا جواب دیا اور اس بیساکھی کے سرے سے ایک سفید رومال بھی بندھا ہوا تھا۔ وہ بیساکھی کھڑکی سے باہر نکال کے مسلسل ہلاتا رہا تھا، یہاں تک کہ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔"

■■■

دوبوری اناج

ایک ساہوکار کی عبرت اثر کہانی، اسے اپنے سے بڑے ساہوکار سے واسطہ پڑ گیا تھا

آمنہ ابوالحسن

سوکھی ہوئی زمین کے سرے پر پھول پتوں سے خالی ننگ دھڑنگ درخت کے پرے شام کا سورج دھیرے دھیرے اوجھل ہو رہا تھا اور رام کے ستے ہوئے چہرے پر وحشت کے آثار شدید ہوتے جا رہے تھے۔ کم ہوتی ہوئی روشنی اور پھیلتے ہوئے سایوں میں اس کے سوکھے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں اور پھیلا ہوا منہ بے حد خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ کوٹھری کی ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے اس نے پانچویں بار آواز نکالی۔

''عنتر کی ماں..... عنتر تیار ہوگئی یا نہیں.....؟''

اور اندھیری کوٹھری سے ہر بار ایک منحنی نقاہت بھری آواز آئی: ''ہو رہی ہے تیار ہو رہی ہے۔'' اس آواز کے کرب سے قطع نظر خود ماحول میں ایک قسم کا کرب تھا۔ سوکھے کا، قحط کا، اناج کی عدم دستیابی کا کرب۔ حد نگاہ تک بے برگ و بار درخت ہو گئی ہوئی خشک زمین، مرجھائے ہوئے بے رونق چہرے، لٹکے ہوئے بے جان جسم، آہ و بکا اور ان سب کے پس منظر سے ایک ہی ابھرتی ہوئی آواز۔ ایک ہی مطالبہ..... روٹی..... روٹی..... روٹی.....؟

ہڈیوں کے پنجر جانور اور انسان جو بے حد متلاشی نظروں سے ایک دوسرے سے الجھ الجھ کر پوچھ رہے تھے۔ کچھ کھانے کو مل سکے گا۔ روکھا سوکھا۔ باسی تواسی۔ مگر کسی کے لبوں پر اثباتی جواب نہ تھا ہر آنکھ میں آنسو، ہر پیٹ میں بھوک اور ہر ماتھے پر فکر کی گہری شکنیں تھیں۔ ایسے میں بستی کے نام نہاد ساہوکار کا رام کے گھر آنا اور اس کی بیٹی کی قیمت لگانا کتنا خوش نصیبی کا موقع تھا۔ پچھلے کئی دن سے بھوک کے خلاف جہاد کرتے کرتے اب رام خود بے حد نڈھال ہو گیا تھا۔ اس کے مویشی مر چکے تھے اور اب بچوں کی باری تھی۔ اب تک وہ بھی دوسروں کی طرح درخت کی جڑیں اور ٹہنیاں ابال ابال کر اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا تھا مگر جب ہر آندی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں سرگرداں ہو جائے تو یہ بھی آخر کب تک ساتھ دیتیں چنانچہ رام نے اپنی آن بان اور عزت کا لحاظ نہ کرکے

ساہوکار کی مانگ قبول کر لی تھی۔ حالانکہ پہلے لمحے وہ اس بات کو سن کر بھوک پیاس کی شدت میں بھی بکھر گیا تھا اور اس نے ساہوکار کا گلا پکڑ لیا تھا مگر پھر اسے یاد آیا کہ بچوں کو موت کے منہ سے بچانے کا فی الحال یہی ایک طریقہ ہو سکتا ہے اور تب فوراً وہ شرمندہ ہو گیا اور اس نے اپنا ہاتھ ساہوکار کے گلے سے کھینچ لیا اور بولا..... ''بھوکا انسان جانور سے کم نہیں ہوتا ساہوکار..... مجھے معاف کرو.....''

ساہوکار نے معنی خیز ہنسی کے ساتھ رام کے کان میں کہا..... ''اس وقت ہر کوئی اپنی بیٹی مجھے سونپنا چاہتا ہے رام! مگر میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ تمہاری بیٹی کے لئے گودام کا منہ کھول سکتا ہوں اور سن لو کہ اس گودام کی تلاش میں پولیس پچھلے کئی دن سے حیران و پریشان ہے مگر..... نہ یہ گودام پولیس کے لئے ہے نہ لنگڑی لولی کالی کلوٹی لڑکیوں کے لیے..... سن لیا نا.....؟'' پھر وہ اٹھ کر رخصت ہو گیا اور رام نے سوچا۔ واقعی پہلے تو ساہوکار کی مہربانی ہے پھر اپنے اچھے نصیب ورنہ آج کل تو اناج سونے کے مول نہیں..... سونا دے کر بھی لوگ اناج نہیں پا رہے ہیں۔ تب خوش خوش وہ لپکتا ہوا اپنی عورت کے پاس گیا اور دھیرے سے بولا..... ''عنتر کی ماں..... عنتر کا بیاہ قبول کرو.....''

اپنا لٹکا ہوا چہرہ اور بجھی ہوئی ملگجی آنکھیں اوپر اٹھا کر عورت نے تلخی سے کہا: ''آگ لگے بیاہ کو۔ تن کو کپڑا پیٹ کو روٹی میسر نہیں اور چلے ہو بیاہ کی بات کرنے۔''

''ارے کپڑے کی بات چھوڑو جی۔ پیٹ کی روٹی کے لیے ہی تو یہ بیاہ کر رہا ہوں۔''

عورت نے زیادہ ناگواری کے انداز میں اپنے مرد کی جانب دیکھا اور زیادہ کڑوے لہجے میں بولی۔ ''تو صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ بیٹی کو بیچ دینا چاہتے ہو۔ مگر..... مول تول کا نام تو بیاہ نہیں ہو سکتا کبھی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آواز رندھ گئی اور اس نے اپنا سر ایک جھٹکے سے نیچے جھکا لیا۔

کھڑا ہوا رام اب یک لخت اس کے بازو میں بیٹھ گیا۔ اس کے گھومے ہوئے چہرے کو اپنی طرف پلٹاتے ہوئے بولا: ''تو تمہیں یہ گھمنڈ ہے کہ تم ہی ماں ہو..... میں باپ نہیں۔''

''ہاں عورت نے غصے اور حقارت سے کہا: ''باپ قصائی نہیں ہوتے۔ مر سکتے ہیں لیکن اپنی اولاد کا سودا نہیں کر سکتے۔''

رام نے عورت کا سوکھا اور غصے کی آگ میں جلتا چہرہ اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیا اور کرخت آواز میں بولا: ''جب خدا انسانوں کی نہیں سنتا تو انسان خود ایک قوت ہو جاتا ہے عنتر کی ماں۔ ایک عنتر کی بھینٹ سے ہم اپنے دوسرے بچوں کی زندگی بچا سکتے ہیں۔ کیا تمہیں یہ منظور نہیں..... بولو..... بتاؤ؟''

عورت کی آنکھوں میں اپنے ننھے بچوں کے چیختے چلاتے روتے بسورتے، تڑپتے ہوئے چہرے گھوم گئے۔ عنتر تو سمجھ دار ہے سمجھانے پر سمجھ سکتی ہے۔ اس نے سوچا اور جھٹ آنسو پونچھ لیے اور یک لخت اپنے شوہر کی جانب گھوم کر نرمی سے بولی: ''ہاں ہاں بے شک۔ مگر کیا..... کب آئے گا ساہوکار۔ کب عنتر کو اس کے ساتھ بھجوانا ہوگا۔ کہو نا جلد.....''

''شام میں..... جب سورج ڈھل جائے گا۔ سائے چڑھ جائیں گے جب تاریکی ہر شے پر ایک گہرا نقاب ڈال دے گی.....''

اور پھر لمبا فاقہ زدہ دن کچھوے کی طرح رینگ

رینگ کر ہی آگے بڑھا تھا۔ جھلنگی کھاٹ پر بے تابی سے کروٹیں بدلتی ہوئی عنتر نے بڑی بے قراری سے ماں سے پوچھا: ''کب تک مجھے ساہوکار کے گھر رہنا ہوگا ماں اور کیا کیا کرنا ہوگا وہاں..... کام تو مجھے سب آتا ہے مگر کیا میں تم لوگوں سے پھر کبھی نہیں ملوں گی.....؟''

تو اس وقت ماں کے دل میں ایک خنجر سا لگ گیا مگر بہ ظاہر مسکرا کر اور خود کو سنبھال کر اس نے کہا: ''ڈرتی ہے پگلی، میری بیٹی ہوکر ڈرتی ہے۔ ارے میں نے کیسے کیسے موقعے ہنسی خوشی نہ برداشت کر لیے۔ پھر تو تو خوب خوش رہے گی وہاں۔ ٹھاٹ کرے گی مگر ساہوکار کی بات مان لینا بیٹا۔ زیادہ ہنگامہ نہ مچانا۔ پھر جب تو لوٹے گی تو شاید تیرے ہاتھ میں سونے کے کنگن بھی ہوں۔ اور..... اور.....'' ماں کی آواز رندھ گئی مگر بھوک سے نڈھال عنتر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''سونے کے کنگن؟'' اس کی آنکھوں میں ایک حریصانہ چمک پیدا ہوئی اور کوندے کی طرح اس لپک نے اس سولہ سالہ لڑکی کے سارے دبے ہوئے نقوش ابھار دیئے۔

''مگر مجھے ساہوکار سے۔ ساہوکار کی مونچھوں سے چڑ ہے ماں۔ بڑی گھن آتی ہے۔''

''ہوتا ہے بیٹی۔ ہوتا ہے مگر یہ سب چیزیں ناقابل برداشت نہیں۔''

اور جب تک ماں عنتر کو باتیں سمجھاتی رہی۔ زندگی کی مجبوریوں اور اونچ نیچ کی بابت واقف کراتی رہی تب تک رام بے قراری سے باہر ٹہلتا رہا۔ بار بار آنکھوں پر انگلیوں کا چھجا بنا کر سورج کو تکتا رہا زمین پر دھوپ کی ٹوہ لیتا رہا۔ اب دن گذرا کہ اب۔

اسے اپنی عورت اور بیٹی کی باتوں سے مطلق کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو فقط شام کا انتظار تھا۔ سورج ڈھلنے کا۔ ساہوکار کی آمد کا۔ سفید جوار اور موٹے چاول کا۔ کتے دنوں سے اس نے چولھے پر رکھی ہانڈی کی کھت کھت پکنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ توے پر پھیلتی، کروٹیں بدلتی جوار کی موٹی روٹی کا نظارہ نہیں کیا تھا۔ لہسن اور ہری مرچ کی چٹنی کی خوشبو نہیں سونگھی تھی۔ پیاز کے قتلے نہیں چبائے تھے۔ اور ایک وہی کیا بستی کے متمول لوگوں تک کی یہی حالت تھی۔ لوگوں کے پاس پیسہ ہو تو ہو، اناج نہیں تھا اور اناج خدا بن گیا تھا۔ دعائیں، منتیں، مرادیں کیا نہیں کی جا رہی تھیں۔ انسانی گناہوں کی معافی اور بخشش کی آرزو میں مگر جس طرح بادل بغیر برسے گذر چکے تھے، اسی طرح خدا نے بھی ہنوز ان کی طرف نگاہ التفات نہیں کی تھی۔

ایسے میں ساہوکار کی مہربانی بلاشبہ اندھیرے میں اجالے کی وہ کرن تھی جو کم از کم رام کے گھر سے فاقہ مستی کی سیاہی جلد ہی کھرچنے والی تھی۔

وہ ٹہلتا رہا، ٹہلتا رہا، ٹہلتا رہا حتی کہ تھک کر کوٹھری کی سیڑھیوں پر ٹک گیا۔

اب آفتاب کی آتشیں ٹکیہ شفق کے رنگ میں ڈوب چکی تھی اور نظروں سے اوجھل ہوا ہی چاہتی تھی۔ اور تاریکی سے خائف انسان تاریکی کا منتظر تھا۔ وقت گذاری کے لیے وہ ہر تھوڑی دیر بعد آواز دے کے احتیاطاً پوچھ لیتا کہ عنتر تیار ہے یا نہیں، مبادا معاملت میں اور تاخیر نہ ہو جائے۔

پھر دور اسے ملگجے کی چھاتی سے تیز تیز قدموں کی مبہم چاپ سنائی دی اور یہ بتدریج واضح ہوتی گئی حتی کہ پرمرد ماحول کے پس منظر سے ایک چاق و چوبند، چکنا چکنا چہرہ نمایاں ہوا اور اپنے دانت نکوس کر دبا دبا سا گھگھیاتا ہوا قہقہہ لگا کر بولا: ''کیوں ابھی دیر تو نہیں؟''

رام کی نظریں اس حریص چہرے کو پھلانگ کر ارد گرد کی آوارہ گردی میں مصروف ہوگئیں۔ ارے یہ تو خالی ہاتھ ہے پھر.....؟

مگر رام کے سوال سے قبل اس کی بے چینی اور اس کے مطلب کو بھانپ کر ساہوکار خود بولا: ''یکہ میں بوریاں آتی ہی ہوں گی۔ بوریاں نیچے اور لڑکی یکہ میں سوار۔ سمجھ گئے نا.....؟''

رام کے کھچے ہوئے اعصاب مائل بہ سکون ہوگئے۔ اس نے اپنے خشک گلے کو تھوک سے تر کیا۔ پپڑیاں جمے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری اور لپک کر ندر ہولیا۔ ''عنتر کی ماں۔ عنتر کو باہر لاؤ.....''

ماں نے اپنے بہت سے آنسوؤں کو آنکھوں میں ہی روک کر ایک دبی ہوئی سسکی بھری اور عنتر کو قریب کر کے اس کا ماتھا چوم کر اسے باہر دھکیلتی ہوئی بولی: ''جاؤ بیٹی..... خدا حافظ.....''

عنتر کو گھر چھوڑ کر ساہوکار کے ساتھ جانے کا رنج تو بہت تھا مگر سونے کے کنگن کی خوشی بھی، سو اس نے ذرا سے تامل و پیش کے بعد باپ کا ہاتھ تھام لیا اور آگے بڑھ گئی۔

تبھی یکہ کوٹھری کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔ یکے والے نے بوریاں اتار کر رام کی اندھیری کوٹھری میں پہنچائیں اور کوٹھری کے نو عمر اجالے کو یکے میں پہنچا لیا۔ ساہوکار نے دبی ہوئی زبان میں پوچھا: ''لڑکی شور وغل تو نہیں کرے گی، سمجھا دیا ہے نا.....؟''

''ہاں ہاں۔''

رام اسے یکے کی جانب دھکیلتا ہوا بولا: ''اب دفع ہو جاؤ۔''

اور جب شام سرک کر سیاہی کے لبادے میں پوری طرح گھل مل گئی اور ستارے ہزاروں فاقہ زدوں کے سروں پر ان کی بھوک پیاس اور تڑپ سے بے پروا خوب چمک لیے تو تھالی میں مٹھائی اور لڈو لیے ہوئے ساہوکار عنتر کے پاس آیا اور میٹھی آواز میں بولا: ''تمہیں مٹھائی پسند ہے نا عنتر.....؟''

''ہاں مگر تم اپنی مونچھیں دور ہی رکھو۔''

''اچھا اچھا۔ میں صبح اپنی مونچھیں منڈوا دوں گا، مگر اب تو مجھے بخشو.....''

مگر جیسے ہی وہ عنتر کے بازو بیٹھنے لگا عنتر کود کر پلنگ سے نیچے اتر گئی اور دور ہی سے اس نے معصومیت سے کہا: ''پہلے لاؤ میرے سونے کے کنگن۔''

''سونے کے کنگن؟'' ساہوکار نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، جو ماں نے تمہارے پاس رکھوائے ہیں۔''

''خوب'' ساہوکار نے برا سا منہ بنایا اور پھر مصلحتاً ہنستا ہنستا بولا: ''ہاں ہاں۔ سونے کے کنگن بھی بن جائیں گے۔ مگر پہلے تم میری رانی تو بن لو.....''

''رانی؟'' عنتر نے حقارت سے کہا۔ ''بکواس نہ کرو ساہوکار۔ میں رانی وانی بننے یہاں نہیں آئی۔ کام کرنے آئی ہوں۔ ماں نے مجھے ضرور کہا تھا کہ کچھ دن تمہارے ساتھ رہنا ہوگا مگر تم سیدھے سیدھے کام بتاؤ ورنہ تمہاری مونچھیں تمہاری گردن سمیت تمہارے بدن سے الگ ہوں گی ہاں.....''

ارے میری پگلی۔ خفا ہوگئی۔ اری کام تو نوکر کرتے ہیں اور کوئی تم نوکر بننے یہاں آئی ہو۔ خوب ٹھاٹ سے رہو۔ حکم چلاؤ۔ تمہیں تو میں اپنے دل کی رانی بنانے یہاں لایا ہوں مگر تمہاری ماں نے تمہارے ہاتھوں میں مہندی تک نہ لگائی۔ اونھ۔ عجب ہے عورت وہ بھی۔''

''ائے.....'' عنتر نے دھاڑ کر کہا: ''تم بہت بڑھتے جا رہے ہو، اگر تم نے آگے میری ماں کو کچھ کہا تو یاد رکھنا.....''

''ارے واہ۔ یہ تو خوب ہوئی یعنی باپ چست اور

لڑکی سست۔ سونے کا مول اناج گھسیٹ لیا اور اب اوپر سے رعب بھی گانٹھ رہی ہو۔ اری ساہوکار ہوں ساہوکار۔ چاہوں تو تیرے باپ کو جیل بھی بھجوا سکتا ہوں۔ سمجھتی کیا ہے؟ کیا دو بورے اناج یوں ہی مفت دے دیئے؟ تیرے بدلے میں دیئے ہیں پھر تو مجھے آنکھیں کیوں دکھا رہی ہے آخر؟"

"کیا کیا..... کیا کہا....." عنتر نے حیرت سے پوچھا۔ پھر اس نے ساہوکار کا گلا پکڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا: "کیا میرے ماں باپ نے مجھے بیچ دیا ہے تجھے جو تو مجھے آنکھیں دکھا رہا ہے۔"

"ہاں ہاں" ساہوکار نے بھی اب غصے اور جھنجلاہٹ سے کہا: "تیرا باپ تو اتنا لالچی ہے کہ اس نے صرف دو بوروں کے لیے تجھے میرے ہاتھ بیچ دیا۔ تیسرے بورے کا نام تک نہ لیا حالانکہ تیرے لیے تو دس بورے اناج بھی کم ہے مگر میری مہربانی دیکھ، اگر تو مجھے خوش رکھے تو اپنے خفیہ گودام کا منہ تیرے گھر والوں کے لیے کھول دونگا سمجھی.....؟"

مگر عنتر کی آنکھوں میں اتنے میں ہی خون اتر آیا تھا۔ جو کھانا اس نے ساہوکار کے گھر کچھ دیر پہلے کھایا تھا وہ اب الٹ الٹ کے آنے لگا۔ مٹھائی کی تھالی کو پاؤں سے ٹھوکر لگا کر اس نے سہمے ہوئے ساہوکار کو گریبان سے دبوچ لیا اور کھینچتی ہوئی بولی: "چل، چل تو میرے باپ کے سامنے۔ مجھے تیری بات کا یقین نہیں وہاں چل کے کہنا یہ سب باتیں تب میں جانوں گی۔"

مگر پولیس پنچایت کے ڈر سے ساہوکار کی اتنے ہی میں گھگھی بندھ گئی۔ "ارے یہ تو بڑا دھوکا ہوگیا۔ تو تو بڑی طرار چھوکری نکلی۔ تیرے باپ نے مجھے ٹھگ لیا۔ ہائے میرا دو بوری اناج" وہ خود کو عنتر کی مضبوط گرفت سے چھڑا کر پلنگ پر اوندھا گر گیا اور عورتوں کی طرح بسورنے لگا۔

پھڑ پھڑاتی ہوئی عنتر زخمی شیرنی کی طرح دروازہ کھول کر باہر نکلی اور بے خوف سیدھے سپاٹ راستے پر اپنے گھر کی سمت دوڑنے لگی۔

ساہوکار کی توہین آمیز حرکتیں۔ اس کی نازیبا باتیں ابھی تک بجلی کے کرنٹ کی طرح اس کے جسم کو درد دے رہی تھیں۔ اس کا خون کھول رہا تھا، وہ ساہوکار کا سر پر سے پتھر سے کچل دینا چاہتی تھی مگر پہلے اس بات کا یقین ضروری تھا کہ کیا اس کے ماں باپ نے اسے واقعی بیچ دیا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اسے اپنے ماں باپ سے شدید قسم کی نفرت محسوس ہوئی بلکہ ساری دنیا سے ہی نفرت اور بیزاری۔ بھوک، جہالت، افلاس اس کے سوا دنیا میں رکھا ہی کیا ہے مگر وہ تو ان سب حالتوں میں بھی خوش تھی۔ اپنی چھوٹی سی کوٹھری میں مست مگن، پھر اس کے ماں باپ کو یہ کیا سوجھی۔

غصے میں اس نے بند دروازے کو پیٹ ڈالنا چاہا مگر چونکہ دروازہ خلاف معمول بند تھا، لہٰذا اس نے ضبط سے کام لے کر یہ جاننے کے لیے کہ اس کے پیچھے کیا ہو رہا ہے اس نے دروازوں سے اپنی آنکھیں لگا دیں۔

طاق میں روشن بے حد مدھم چراغ کے اجالے میں اس نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ دو خوب پھولے ہوئے بورے مختلف قسم کے میلے کچیلے چیتھڑوں سے مشکل چھپا دیئے گئے ہیں اور اس کے سارے بہن بھائی باپ کے ساتھ دیوار سے پیٹھ لگائے بڑے ہوشیار، ہوشیار چوکنے سے بیٹھے ہیں اور تھالے میں کٹی ہوئی لہسن کی چٹنی خوشبو دے رہی ہے اور پیاز کی ڈلیاں چمک رہی ہیں اور ماں تھرتھراتے ہاتھوں سے موٹی موٹی جوار کی روٹیاں چوروں کی طرح جلد جلد گھڑ رہی ہے۔

یک لخت عنتر کا سارا وجود ایک چیخ میں تبدیل ہوگیا مگر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ زور سے بند کرلیا۔ اسے اپنے خاندان کی حرص پر غصہ تو آیا مگر تھوڑی دیر پہلے کی اپنی وہ حالت بھی یاد آئی جب وہ ساہوکار کے گھر سخت نفرت کے باوجود اس کے دیئے ہوئے کھانے پر ٹوٹ پڑی تھی اور اس وقت سچ مچ اسے کوئی یاد نہ آیا تھا، نہ ماں باپ، نہ بہن بھائی۔ مگر اب؟ کسی نامعلوم کرب کے احساس سے آنسو اس کی ذات میں آندھی کی طرح لپکنے لگے۔ وہ نڈھال نڈھال سی کنویں کی مینڈ پر جا بیٹھی۔ نہیں نہیں۔ اس نے خود کو یقین دلانا چاہا۔ ساہوکار جھوٹا ہے۔ میرے ماں باپ نے میری ملازمت کے عوض اناج ضرور لیا ہوگا مگر وہ مجھے بیچ نہیں سکتے۔ کبھی، کبھی بھی نہیں..... مگر پھر یہ جشن..... یہ خوشی..... یہ پوشیدگی.....؟؟

نہ سمجھ میں آنے والی پیچیدگیوں کے تحت وہ چپ چاپ بیٹھی دور کنویں کی تہہ میں اکا دکا ستاروں کی جھلک دیکھتی رہی اور اندر اس کے باپ نے سرگوشی کے انداز میں اپنے دوسرے بچوں سے کہا: "کم بختو۔ کھا پی کر ہیکڑی جتانے نہ چلے جانا۔ پولیس تھانہ ہوجائے گا۔ ساہوکار الگ مارا جائے گا اور شاید اناج بھی ہم سے چھین لیا جائے۔ سمجھ رہے ہو نا۔"

مگر اتنا کہتے کہتے اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ گرم روٹیوں کا تھال پرے دھکیل کر وہ دیوانہ وار دروازے کی طرف لپکا۔ "کون، کون؟"

"تمہیں تو وحشت ہوگئی ہے۔ کوئی بھی تو نہیں" عورت نے اسے لتاڑا مگر سخت بھوک اور اشتہا کے باوجود سامنے رکھی ہوئی روٹیوں کو ہاتھ لگانے کو اس کا جی مطلق نہ چاہا۔ "بچو کھاؤ، پیٹ بھر کھاؤ" اس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا اور خود تھوک سے حلق تر کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ "ذرا دیکھوں تو، آس پاس کوئی ہے تو نہیں۔"

"ہونہہ" عورت نے ایک ہنکار بھری "برا کام کیا ہے نا۔ اب چین کہاں پاؤ گے"۔ مگر اس کی بات سے بے خبر تاروں کی چھاؤں میں، کھلے آسمان کی دودھیا روشنی میں عنتر کو کنویں کی مینڈ پر بیٹھا دیکھ کر رام سٹپٹا گیا..... "عنتر بیٹی.....؟"

عنتر معاملے کی حقیقت جاننا چاہتی تھی لیکن شدید نفرت اور بے زاری اس پر غالب آگئی۔

"میرے قریب نہ آؤ۔ قریب نہ آؤ۔" وہ چلا کر بولی۔ "مجھے کنویں سے بڑا ڈر لگتا ہے، لیکن اگر تم میرے نزدیک آؤ گے تو میں کنویں سے نہیں ڈروں گی، بابا۔"

"نہیں نہیں، ایسا نہ کرنا بیٹی۔ ایسا نہ کرنا۔" رام غم گیں التجائی لہجے میں بولا اور اسے یک لخت تھام لینے کے لیے آگے بڑھا مگر اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ عنتر کو بالکل ساہوکار کے ہاتھوں کی طرح محسوس ہوئے اور نفرت و کراہت سے لرز کر اس نے خود کو بے خوف کنویں کی نذر کردیا۔

"عنتر..... عنتر.....؟" رام کنویں کی سخت مینڈ پر سر ٹیک ٹیک کر دیر تک روتا رہا اندر بچے خوشی خوشی روٹی کھاتے رہے۔

رام دیر تک غم کو تھپک کر خاموش کراتا رہا پھر دو بوریاں اناج اچانک سوال بن کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ صبح ساہوکار شکایت کرنے ہی نہیں آئے گا بوریاں بھی واپس لے جائے گا۔ وہ کنویں سے اٹھا تو اس کی آنکھیں کسی گدھ کی مانند ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ رات کے اس پہر کسی نے عنتر کو یہاں آتے نہیں دیکھا عنتر ساہوکار کے گھر میں گئی تھی۔ جہاں وہ کل اسے ملنے جائے گا..... عنتر..... ساہوکار..... اسے کتنی ہی اور پھولی ہوئی اناج کی بوریاں نظر آنے لگی تھیں۔ ■ ■ ■

سوانگ

اونچی ذات کی ایک بیوہ کے دکھ کی کہانی،
وہ ایک سوانگ بھری زندگی جینے پر مجبور تھی

سبین علی

فہمیدہ کو اپنے محلے کے متمول گھرانے میں کام کرتے دو ہی دن ہوئے تھے کہ کام سے جواب مل گیا۔ گھر کی مالکن بیچاری کیا کرتی؟ آخر وہ گھر کا کام صفائی ستھرائی کے لیے کراتی تھی نہ کہ گھر کو مزید بدبودار بنانے کے لیے! فہمیدہ اپنے حال میں مست رہتی۔ بہت سوں نے اسے سمجھایا کہ صاف ستھری رہا کرو مگر اس کے کان پر جوں نہ رینگتی۔ وہ اتنی میلی کچیلی اور بدبودار تھی کہ جہاں سے گزرتی، پہلے بدبو کا جھونکا نمودار ہوتا اور لوگ اپنی ناک بند کر لیتے۔ گلی میں سے گزرتی تو گھر کے اندر بیٹھی عورتیں بھی اس کی موجودگی سے باخبر ہو جاتیں۔

اس کے سنہرے گھنگھریالے بال برسوں سے کنگھی سے محروم تھے۔ وہ کندھوں پر جھولتے رہتے۔ ان کے اندر مٹی، تنکے، دھاگے اور نجانے کیا کچھ اٹا پڑا تھا۔ قد اونچا، رنگ کبھی گورا ہو گا مگر اب ہلکے بھورے دھبوں نے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ آنکھوں میں عجیب ویرانی تھی۔ ناخن گھس چکے تھے مگر میل کی لکیریں بہت نمایاں نظر آتیں۔ کپڑے بدلنے یا دھونے کی فرصت کسے نصیب تھی۔ جب گھس گھس کر پھٹنے کے قریب ہوتے تو کوئی دوسرا جوڑا پہن لیتی۔ پھر وہ مسلسل مہینا بھر اور کبھی اس سے بھی زیادہ دن چلتا۔ اس نے کبھی سر پر دوپٹا نہیں اُوڑھا تھا مگر گلے اور چھاتی کو لپیٹے رکھتی۔ پاؤں میں قینچی چپل پہنے پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چلتی تو عجیب بے ہنگم آوازیں نکلتیں۔ یہی حال کچھ اس کے گھر کا بھی تھا۔ وہ درمیانے طبقے

کے محلے میں رہتی تھی۔ 5 مرلے کا گھر تھا، جس کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا۔ صرف دو کمرے اپنے پاس رکھ کر باقی گھر معمولی کرائے پر اٹھا رکھا تھا۔ ایسی لاپرواہ اور بے نیاز عورت کے گھر گندگی کا بسیرا تو ہونا ہی تھا۔ کوئی دروازہ آدھا ٹوٹا ہوا تو کسی کھڑکی کو جالی یا پردہ نصیب نہیں تھا۔ فرش جانے کب سے اُکھڑا ہوا تھا۔ صرف سرخ اینٹیں نمایاں تھیں۔

کوئی اس کے پاس بیٹھنا تو درکنار کھڑا ہونا بھی پسند نہ کرتا۔ اسے کبھی کسی نے مسکراتے یا روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ چہرہ سپاٹ تھا مگر اس پر کرب سا بہت نمایاں رہتا۔ کبھی کبھی ایسے محسوس ہوتا جیسے شدید سر درد میں مبتلا ہو۔ بولتی بھی بہت کم تھی اور مزاج روکھا۔ نہ بحث نہ تکرار، بس جو کام ملتا، کرتی اور اپنی راہ لیتی۔ اب بھلا اتنی میلی عورت کو کون مستقل کام دیتا، ہر گھر سے دو چار دن بعد جواب مل جاتا اور ان دو چار دنوں کی اُجرت بھی ماری جاتی۔

اللہ جو ساری مخلوق کا روزی رساں ہے، اسی نے اس میلی کچیلی عورت کی روزی کا وسیلہ بھی نکال ہی دیا۔ اسے بھینسوں کے باڑے میں ملازمت مل گئی۔ کوئی دوسری عورت یہ کام نہ کرتی مگر اس کے ساتھ پانچ وجود اور بھی تھے اور ان کے پیٹ کا دوزخ بھرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اسے شاید عید کے دن بھی ستھرے کپڑے نصیب نہ تھے۔ عید بھی بھینسوں کا گوبر اٹھاتے گزرتی۔ باڑے کا مالک بھی اسے کوئی تنخواہ نہیں دیتا تھا۔ کوئی مرد بھی اتنے کم پیسوں میں اتنا سخت کام کرنے کو تیار نہ ہوتا۔ اوپر سے فہمیدہ نے عید، شب برات کو بھی کبھی چھٹی نہیں مانگی تھی۔ بھینسوں کے باڑے میں کام آسان نہیں تھا مگر بھینسیں اتنی وحشی نہیں ہوتیں۔ اسے ان سے کوئی خوف محسوس نہ ہوتا۔ مالک پیسے کی پائی پائی کا حساب رکھتا مگر اُسے تنگ نہیں کرتا تھا۔ اُدھر کام کرنے کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ جب مشین لگا کر مکھن نکالا جاتا تو باقی بچی چھاچھ میں سے کچھ اسے مل جاتی۔ 4 بیٹے اور ایک بیٹی سارا دن گھر میں اکیلے پڑے رہتے۔ تاہم وہ دن میں گھر کا چکر لگا لیتی۔ اس کے بچوں نے کبھی کسی سے نوالہ بھی نہیں مانگا تھا، پتا نہیں وہ کب پکاتی اور کب انھیں کھلا کر منہ اندھیرے کام کو نکل کھڑی ہوتی۔

ایک بار ملکانی جی کا بیٹا کئی دنوں سے بخار میں جل رہا تھا۔ کبھی پیروں، کبھی مولویوں اور کبھی ڈاکٹروں کے چکر کاٹ کاٹ کر وہ عاجز آ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ آستانے پر نذرانہ چڑھایا، مولوی صاحب سے دم کرایا، دوا دارو سب کر کے دیکھ لیا، کچھ افاقہ نہ ہوا۔ ملکانی بے چین ہو گئی۔ اکلوتے بیٹے نے کئی دنوں سے گلوکوز کے علاوہ کچھ کھایا نہ پیا۔ سوچ میں پڑ گئی، یا الٰہی کیا کروں؟ کسی نے کہا کہ خون کا صدقہ دے۔ اس نے کالے رنگ کا دیسی پلا ہوا مرغا منگوایا اور فہمیدہ کو بلا بھیجا، وہ آئی تو پوچھا ”فہمیدہ صدقہ لو گی؟“

فہمیدہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئی، آنکھوں کی وحشت آخری حدوں کو چھونے لگی۔ پھر نظر جھکا کر بولی ”میں صدقہ نہیں لیتی۔“

ملکانی نے کہا ”کوئی بات نہیں، اب لے لو۔ تمہارے بچوں نے شاید پچھلی بقر عید کا گوشت کھایا ہو گا۔“ لیکن جب اس کی نظر فہمیدہ کی نظر سے ملی تو وہ سہم گئی اور کہنے لگی ”اچھا جاؤ کسی اور گھر میں دے آؤ۔“ فہمیدہ نے مرغا بغل میں دبا اور پیر صاحب کے گھر کو چل دی۔

لوگ اس کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرتے۔ کوئی کہتا، اکڑ بڑی ہے اس کے اندر، کوئی کہتا بے نمازی کہیں کی، کوئی اُسے میلی کچیلی کا خطاب دیتا۔ کوئی کہتا اسے دین دنیا کا کچھ نہیں پتا۔ وہ کوئی پڑھی لکھی عورت تو تھی نہیں، اسے بس اتنا پتا تھا کہ پیٹ کا دوزخ بھرنا ہے۔

کبھی کبھی اسے لگتا، جہنم کی آگ پیٹ کی آگ سے بُجھی ہے۔ اگر کوئی حلال طریقے سے اِس دوزخ کی آگ بجھا سکے تو اُس دوزخ کی آگ بھی ٹھنڈی ہو جائے گی۔ مگر صرف ایک روٹی سے بجھنے والی آگ بجھانے کی فکر کوئی نہیں کرتا۔ جہاں لوگ اپنے نفس کی بھوک کے بھانبھڑ لگائے بیٹھے ہوں، انھیں اس سے کیا غرض کہ پیٹ کا دوزخ کس چڑیا کا نام ہے؟

اس محلے کی نکڑ پر موڑھوں پہ بیٹھے معززین اور سیاسی کارندے آنے جانے والی ہر عورت کو گھورنا اپنا حق سمجھتے تھے، بھلا وہ ان کی نظر بازی سے کیسے محفوظ رہتی؟ مگر اُسے کچھ کہتے ہوئے سب ڈرتے تھے۔ اس کی کم گوئی اور آنکھوں کی وحشت دیکھ کر سہم جاتے۔ ایک دن نئے کونسلر کو جانے کیا سوجھی کہ اُسے چھیڑ بیٹھا "اری او فہمیدہ! جگہ جگہ کام کرتی پھرتی ہے۔ لوگوں کے گھر صاف کرتی ہے، اپنے گھر کی صفائی بھی کرلیا کر!

یہ سننا تھا کہ وہاں بیٹھے سب آدمی قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔ ایک شخص بولا "کچھ مت کہہ، گالیاں سنائے گی۔"

دوسرا بولا "سنانے دے وہی تو سنتی ہیں۔" اُس کا چہرہ پہلے سرخ ہوا، پھر پیلا زرد، گلا رُندھ گیا، مگر آنکھ سے کوئی آنسو نہ ٹپکا۔ بڑے جلال سے بولی "ارے جب میاں جی زندہ تھے تو بھرجائی بھرجائی کرتے تیری زبان نہ تھکتی، خیرات مانگنے اور قرض لینے میرے دروازے پر کھڑا ہوتا تھا نامراد، اب ہر آتی جاتی کو تکتا ہے..... مشرک کہیں کا" پھر کسی کو سمجھ میں نہیں آیا کہ رُندھے گلے کے ساتھ کیا کیا گالیاں سنا گئی۔ شور سن کر فہمیدہ کے چاروں بیٹے آن موجود ہوئے۔ سوکھی روٹی اور چھاچھ پر پل کر وہ کڑیل جوان بنتے جا رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر کونسلر گھبرا گیا اور گھر کی راہ لی۔

وہ دن فہمیدہ کے کام کا آخری دن تھا۔ بیٹے بڑے ہو گئے تھے۔ انھوں نے گھر سنبھال لیا۔ پھر ایک دن اس نے اپنے بڑے بیٹے کی شادی کر دی۔ گھر میں بہو آئی تو اسے فراغت نصیب ہوئی۔ اب وہ پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اس نے کہیں آنا جانا بالکل کم کر دیا۔ سادگی کے باوجود اس کا حلیہ بھی بہتر ہو گیا۔ بڑھاپا آیا تو صاف رہنا بھی سیکھ لیا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کا امتحان ختم ہوا۔ مگر نہیں ایسا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی بہو کو ایک آنکھ نہ بھاتی، بہو سلیقہ شعار اور گھر داری کی ماہر تھی۔ اسے اس بات کا بڑا ناز تھا۔ فہمیدہ نے گھر کے کسی معاملے میں دخل دینا چھوڑ دیا۔ ایک دن بہو کہنے لگی "یہ گھر میری سلیقہ شعاری سے سجا ہے۔ میری ساس تو پھوہڑ ہے، اس کو کچھ پتا نہیں کہ دنیا کیا ہوتی ہے اور کدھر جا رہی ہے؟ ساری عمر خود میلی رہی، گھر بھی میلا رکھا۔ فہمیدہ سے یہ تہمت برداشت نہ ہوئی، صدمے سے فالج کا حملہ ہوا اور وہ بیچاری چارپائی سے جا لگی۔ بیٹوں نے بڑی خدمت کی، بڑا علاج کرایا مگر اس کا دل دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ بیماری کی حالت میں ایک دن بہو سے کہنے لگی! "اللہ سدا سہاگن رکھے تجھے، جوانی کی بیوگی کاٹنی بڑی مشکل ہے۔" میں جن انگاروں پر چلی اور میلی کچیلی عورت کا سوانگ بھرا، اسے کوئی سمجھ ہی نہ پایا۔ ایک اونچی ذات کی عورت بیوہ ہو کر بھیڑیوں سے بھری اس دنیا میں بدبو دار اور نیچ بنے بغیر کیسے بچ پاتی؟ یہ سن کر بہو کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو آ گئے۔ اسے جب تک سمجھ آئی بہت دیر ہو چکی تھی۔

واپسی کے سفر میں سفید لباس پہنے وہ بہت اجلی لگ رہی تھی۔ چاروں بیٹوں نے کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے ماں کی چارپائی اٹھائی اور اسے آخری منزل تک پہنچانے چل پڑے۔

■■■

مس اورلی مضبوط و متناسب بدن، شہابی رخساروں، لمبے بالوں، چمکتی آنکھوں اور پُر اعتماد چہرے کی مالک خاتون تھی۔ جب اپنے فارم میں کام کرتی تو مردانہ ہیٹ پہن لیتی۔ جب سردی ہوتی تو فوجی نما کوٹ زیب تن کرتی اور لمبے جوتے پہن لیتی۔

اس کے سیاہ بال سفید ہونے لگے تھے، مگر مس اورلی نے کبھی شادی کرنے کا نہ سوچا۔ حتیٰ کہ اسے کسی سے عشق بھی نہ ہوا۔ بیس سال کی تھی کہ ایک قبول صورت نوجوان نے رشتہ بھیجا، مگر اس نے انکار کر دیا۔ اب وہ پچاس سال کی ہو چکی، اسے کبھی اپنے فیصلے پر پچھتاوا نہیں ہوا۔

اب وہ فارم میں تنہا ہی رہتی تھی۔ اس کی کائنات پنٹو نامی کتے، فارم پر کام کاج کرنے والی چند حبشی عورتوں، دس بارہ مرغیوں، دو گائے، تین خچروں اور ایک بندوق تک محدود تھی جس سے وہ جنگلی جانور مار بھگاتی تھی۔

ایک صبح چشم فلک نے خلاف معمول عجب منظر کا نظارہ کیا۔ دیکھا کہ گھر کے باہر مس اورلی کولہوں پر ہاتھ رکھے استادہ ہے۔ سامنے چار بچے کھڑے

جدید امریکی افسانے کا نمائندہ شہ پارہ

پچھتاوا

ایک بوڑھی کا انمول قصہ..... اس کی سُونی زندگی میں اچانک بہار آ گئی تھی

کیٹ شوپن / سید عاصم محمود

ہیں۔ ان کی آمد غیر متوقع، اچانک اور بڑی ناگوار خاطر تھی۔ اسے یہی محسوس ہوا کہ وہ یک دم آسمان سے ٹپک پڑے۔ یہ بچے اس کی قریب ترین پڑوسی، اولڈی کے تھے، گو وہ اتنی نزدیک بھی نہیں رہتی تھی۔

اولڈی پانچ منٹ قبل بچوں سمیت نمودار ہوئی۔ بانہوں میں ننھی لوڈی تھی۔ نومی ماں کی انگلی پکڑے گھسٹتا آرہا تھا۔ پیچھے مارلسین اور مارسیٹی بادل نخواستہ ننھے قدم اٹھاتی چل رہی تھیں۔

نوجوان عورت کا چہرہ سرخ تھا۔ آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ اولڈی نے مس اورلی کو دیکھتے ہی بتایا کہ اس کی ماں سخت بیمار ہے۔ بابا نے اسے لانے کے لیے بیل گاڑی بھیجی ہے۔ شوہر کسی کام سے ٹیکساس گیا ہوا ہے۔ لہٰذا وہ براہ مہربانی چند دن کے لیے اس کے بچے اپنے گھر رکھ لے۔ اولڈی کہنے لگی: ''مس اورلی، میں نہ نہیں سنوں گی، آپ ہی نے میرے آنے تک بچے سنبھالنے ہیں۔ میں نے انھیں اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ آپ کو تنگ نہیں کریں۔ لیکن مس اورلی، یہ شرارتیں کریں یا تنگ کریں تو انھیں بالکل نہ بخشیے گا۔'' یہ کہہ کر متوحش اولڈی تیزی سے بیل گاڑی کی سمت چل دی جو تھوڑی دور کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

اب بچے گھر کے وسیع صحن میں کھڑے تھے۔ صحن کی سرخ اینٹیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ قریب ہی مرغیاں کیڑے مکوڑے تلاش کرتی پھرتی تھیں۔ فضا گلاب، موتیے اور دیگر پھولوں کی خوشبو سے معمور تھی۔ دور کھیتوں سے حبشی عورتوں کے ہنسنے کی آواز آرہی تھی۔

صحن میں استادہ مس اورلی کی نگاہوں میں غصہ چھپا تھا۔ تلخ تیور اس امر کی خبر دیتے تھے کہ وہ بچوں کی ذمہ داری ملنے سے خوش نہیں۔ اس نے مارلسین پر تنقیدی نظر ڈالی جس نے بمشکل موٹی تازی لوڈی کا وزن سہار رکھا تھا۔ پھر یہی نظر مارسیٹی پر پڑی جو آنسو پینے کی سعی کر رہی تھی۔ مگر نومی روتے ہوئے آوازیں نکالتے ماں کے بچھڑنے پر احتجاج کر رہا تھا۔

مس اورلی نے تنقیدی نظریں ڈالتے ہوئے اپنی توانائی بھی مجتمع کر لی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ سر پر آپڑنے والی نئی ذمے داری سے کیونکر عہدہ برآ ہوگی۔ چناں چہ بچوں کو کھلانے پلانے سے پہلا عملی قدم اٹھایا گیا۔

اگر مس اورلی کی ذمے داریاں کھلانے تک محدود رہتیں تو یہ فکر کی کوئی بات نہ تھی۔ کیونکہ اس کا توشہ خانہ انواع اقسام کی غذاؤں سے بھرا پڑا تھا۔ لیکن بچے مرغیاں یا بھیڑ بکریاں نہیں تھے..... انھیں مسلسل توجہ درکار تھی اور ضروری تھا کہ ان کا ہر وقت خیال رکھا جائے اور یہی امر مس اورلی کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ اسے انجام دینے کے لیے قطعاً تیار نہ تھی۔

یہی وجہ ہے کہ شروع کے چند دن بچوں کا بندوبست کرتے ہوئے اس نے بڑی نالائقی اور پھوہڑ پن دکھایا۔ اس کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ جب اونچی اور تحکمانہ آواز میں بات کی جائے تو مارسیٹی زار و قطار رونے لگتی ہے اور یہ بچی کا خاصہ تھا۔

اسی طرح جب نومی نے صحن کی کیاریوں میں اُگے گلاب اور موتیے کے تمام پھول شاخوں سے توڑ لیے تبھی مادام اورلی پر انکشاف ہوا کہ وہ انھیں جمع

کر کے دیکھنا چاہتا ہے، خالق نے پھولوں کو کیونکر تخلیق کیا؟

اس کی بڑی بہن، مارلسین نے مخصوص بچکانہ انداز میں اپنی میزبان کو بتایا ''آنٹی اورلی، یہ باتوں نہیں لاتوں کا بھوت ہے۔ آپ اسے کرسی سے باندھ دیں۔ یہ جب گندے کام کرے تو ماما بھی ایسا ہی کرتی ہے۔'' مگر جس کرسی سے شرارتی نومی باندھا گیا وہ بہت آرام دہ اور فراخ تھی۔ چناں چہ وہ بندھے بندھے ہی آرام سے سو گیا اور اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا گیا۔

رات آئی تو مس اورلی نے انھیں بستروں میں گھسنے کا حکم دیا۔ اس کی آواز پہ مرغیاں فوراً ڈربے میں گھس جاتی تھیں۔ لیکن بچے تو ٹس سے مس نہ ہوئے اور اپنے کھیل میں محو رہے۔ وہ بڑی چاہت سے تکیے نکال کر لائی تھی، مگر بچوں نے ایک دوسرے کو مار مار کر تکیوں کا پلیتھن نکال دیا۔

آخر سونے کا سمے آیا تو مس اورلی کو معلوم پڑا کہ اب پانی سے بھرا ٹب لانا ہے۔ اس میں بچے اپنے تھکے اور گرد آلود ننھے پاؤں دھوئیں گے۔ اس کام سے فراغت ملی تو ایک اور سخت مرحلہ مس اورلی کا منتظر تھا۔ مارسلین اور مارسیٹی تو میزبان کا یہ خیال جان کر ہنس پڑیں کہ نومی پریوں یا جنوں کی کہانی سنے بغیر سو جائے گا اور یہ کہ لوڈی کو لوری اور جھولنے دیئے بغیر نیند آجائے گی۔

چند دن بعد ایک صبح مس اورلی نے اپنی قدیم حبشی ملازمہ کو بتایا ''خالہ روبی! ایک راز کی بات سناؤں۔ میں دس کھیتوں کا انتظام سنبھال لوں گی، لیکن میری توبہ کہ بچے سنبھالوں۔ انھوں نے کچھ ہی

محنتی عورتیں

عورتیں بہت محنتی ہوتی ہیں، اس کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ سو میں سے صرف بارہ عورتیں قدرتی طور پر حسین ہوتی ہیں جب کہ باقی اپنی محنت سے ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔

(انتخاب: مہر اشتیاق، دیپالپور)

دنوں میں میرا تیا پانچہ کر ڈالا ہے۔''

خالہ روبی اپنے مخصوص دہقانی لہجے میں بولی ''ارے بیٹی تو نے پہلے کبھی بچے نہیں سنبھالے، اسی لیے چوکڑی بھول گئی۔ ان بچوں کو سنبھالتے ہوئے تو بڑوں بڑوں کا پتا پانی ہوئے، ہاں۔''

ظاہر ہے، مس اورلی جہاں دیدہ حبشن ماں کے مانند تجربہ کار اور گرم و سرد چشیدہ نہیں تھی۔ وہ پانچ بچوں کی پرورش کرنے کے علاوہ چھٹا دفنا بھی چکی تھی۔ تاہم مس اورلی کی قطعاً یہ تمنا نہیں تھی کہ وہ حبشن کے تجربوں کا نچوڑ حاصل کرے۔ اس کی بس یہ خواہش تھی کہ اسے گزارے کے لیے چند مادرانہ داؤ مل جائیں۔

سالن سے بھری بچوں کی انگلیوں نے مس اورلی کو مجبور کر دیا کہ وہ کئی برس سے صندوق میں پڑے ایپرن زیب تن کر لے۔ اسے بچوں کے نرم، گرم اور نم بوسوں کا بھی عادی ہونا پڑا۔ یہ محبت اور خوشی کے بے ساختہ مظاہرے ہوتے۔ برسوں سے الماری کے اوپر اس کی سلائی مشین بیکار پڑی تھی۔ مس اورلی نے وہ بھی اتار لی تا کہ بچوں کے کپڑے سی سکے۔ ان کی سلائی دھینگا مشتی میں اکثر ادھڑ جاتی تھی۔

مس اورلی کو ان قہقہوں، کھلکھلاتی ہنسی،

چہچہاہٹ اور رونے سے مانوس ہونے میں چند دن لگے۔ ان ہمہ اقسام آوازوں سے صبح تا شام سارا گھر گونجتا رہتا تھا۔ اسی طرح چار پانچ دن بعد ہی وہ لوری کے گرم و گداز جسم کے ساتھ چپکے میٹھی نیند سو سکی۔ تب ننھی بچی کے حرارت بھرے سانس اس کے گالوں سے یوں ٹکراتے جیسے کسی پرندے کے پر ہوا میں لہرا رہے ہوں۔

جب دو ہفتے گزر چکے تو حالات معمول پر آ گئے۔ اب بچوں کے کام کاج کرتے اور انھیں سنبھالتے ہوئے مس اور لی کو کوئی تکلیف نہ ہوتی اور نہ ہی وہ شکایت کرتی۔

لیکن دو ہفتے بعد ہی ایک شام مادام اولڈی واپس آ پہنچی۔ پہلے کی طرح خلاف توقع اور کوئی اطلاع دیئے بغیر! مس اور لی صحن میں کھڑی کھیتوں کا جائزہ لے رہی تھی کہ اسے کچھ دور ایک بیل گاڑی آتی دکھائی دی۔ آگے ہی مادام اولڈی طمطراق سے بیٹھی تھی۔ چہرے پر پھیلی مسکراہٹ بتاتی تھی کہ اس کی ماں صحت مند ہو چکی۔

لیکن پڑوسی کی اچانک آمد نے مس اور لی کو پریشان کر دیا اور اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دماغ میں پہلا خیال ہی آیا کہ بچے جمع کیے جائیں۔ نومی کہاں ہے؟ صاحب زادے اسٹور میں گھسے گندم پیسنے والی چکی کا سائنسی معائنہ فرما رہے تھے اور مارسین و مارسیٹی؟ وہ بالا خانے میں بیٹھی پھٹی پرانی گڑیوں سے کھیل رہی تھیں۔ اور لوڈی؟ وہ مس اور لی کی محفوظ و نرم آغوش میں دبکی ہوئی تھی اور اسے ہی سب سے پہلے ماں کی خوشبو محسوس ہوئی۔ ننھی ماں کو دیکھتے ہی مسرت سے کلکاریاں مارنے لگی۔

میل ملاپ ہوا، خوشی منائی گئی اور پھر مادام اولڈی شکریہ ادا کرتی بچوں کو لیے چل دی۔ بچوں کے جاتے ہی گھر میں خاموشی چھا گئی۔ مس اور لی صحن میں ساکت کھڑی آنے والی آوازیں سننے لگی۔ تیزی سے چھاتی تاریکی نے جلد ہی جاتی بیل گاڑی کو اپنے دامن میں چھپا لیا۔ لیکن اسے گاڑی کے پہیوں کی چرچراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ تاہم مس اور لی کے کان تو بچوں کی خوشی سے بھرپور باتوں پر لگے تھے۔

تھوڑی دیر بعد مس اور لی نے گھر کا رخ کیا۔ ڈھیر سارا کام اس کا منتظر تھا۔ بچے اپنے پیچھے خاصی بدنظمی چھوڑ گئے تھے۔ مگر اس نے چیزوں کو بے ترتیبی سے پڑے رہنے دیا۔ وہ ہال میں بچھی کرسی پر بیٹھ گئی اور اس کمرے کو دیکھا جہاں بچوں نے دو ہفتے گزارے تھے۔ اب وہاں تنہائی اور اداسی کا راج تھا۔

مس اور لی نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپایا اور رونے لگی۔ یہ خواتین والا نرم و نازک اور دھیما رونا نہیں تھا۔ بلکہ وہ مردوں کی طرح ایسی دردناک کراہیں نکالتے اور سسکیاں بھرتے رونے لگی کہ کوئی سنتا تو اس کا دل دہل جاتا۔ وہ اپنے ماتم میں اتنی مگن تھی کہ اسے محسوس ہی نہ ہوا، پونٹو اس کے ہاتھ چاٹ رہا ہے۔

کیٹ شوپن (Kate Chopin) کا شمار نامور امریکی خواتین ادباء میں ہوتا ہے۔ وہ 1850ء میں پیدا ہوئی اور 1904ء میں چل بسی۔ شوپن نے امریکی افسانے کی بنیادیں رکھنے میں نمایاں حصہ لیا۔ اس کے افسانے گھریلو زندگی کو بڑی خوبی سے اجاگر کرتے ہیں۔ "Regret" اس کے فن کا نمائندہ افسانہ ہے۔

■■■

بیکر یلدز/فوزیہ طاہر

خوب صورت انگلیاں

ایک ہنر مند بیوی کا عبرت اثر ماجرا
اسے اپنے میاں کو بتانا بہت مہنگا پڑ گیا تھا۔

گرمی خوب زوروں پر تھی۔ جیواں نے آستین سے چہرے کا پسینا پونچھا، انگیٹھی پر رکھی تمباکو کی پوٹلی کی طرف تفصیلی نظروں سے دیکھا، پھر سارے کمرے میں نظریں دوڑاتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگی، "شاباش لڑکی شاباش..... بالشت بھر کی نو بیاہتا ہو کے شے کس قدر قرینے سے سجا رکھی ہے۔" یہ کہہ کر یک دم اٹھی، سر پر دوپٹا اوڑھا، تمباکو کی پوٹلی اٹھائی اور وین کے گھر چل پڑی۔ اُس کے صحن میں پہنچی تو ساس بُری طرح پھولی ہوئی تھی۔ عائشہ باجی اُسے یوں دیکھ کر بڑی حیرانی سے بولی، "خیر تو ہے جیواں! اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہے؟"

جیواں نے تمباکو کی پوٹلی ہوا میں اچھالی، پر منہ سے کچھ نہ بولی۔ عائشہ باجی ذرا اور فکر مند ہوئیں۔ "اس میں ہے کیا؟ کچھ تو بول۔"

"تمباکو ہے باجی! یہ کم بخت سگریٹ مجھ سے نہیں بنتا۔" "توبہ ہے، اتنی بڑی ہوگئی ہے پر ابھی تک تجھے تمباکو کو مروڑ کے سگریٹ بنانا نہیں آیا۔"

"اللہ میری ماں کی مغفرت کرے۔ اُس نے مجھے سسرال بھیجنے سے پہلے تقریباً ہر کام ہی سکھایا، پر خانہ خراب اِس تمباکو کی طرف اُس کا دھیان ہی نہ گیا۔"

"یہ کیوں نہیں کہتی کہ تیری ماں سب سے بڑا اونٹ طویلے ہی میں بھول کے دنیا سے گزر گئی۔ میری ایک بات اچھی طرح سن کے پلّے سے باندھ لے لڑکی! شوہر کو نہ تو کبھی رات کو اور نہ کبھی دن کو تمباکو کے بغیر رہنے دینا۔" جیواں کا چہرہ لال سرخ ہوگیا۔ پندرہ سال کی تو تھی۔ شرم سے اُس کا سر جھک گیا۔ عائشہ باجی نے ہنستے ہنستے پوچھا، "ہفتہ تو ہو ہی گیا ہوگا۔"

"کس بات کو باجی؟"

"بالکل، کل سے دوسرا ہفتہ ہو چکا ہے۔"

"مرجاتو!"

"ہائے کیوں باجی؟"

"اس لیے کہ پورا ہفتہ گزر چکا ہے اور تجھے اب عقل آئی ہے۔ اتنے دن اُس نے سگریٹ پیے بغیر گزار دیے ہیں؟"

جیواں اپنا دامن بچاتے ہوئے بولی، "نہیں باجی نہیں، اِتنے دن وہ ڈبی والے سگریٹ پیتا رہا ہے۔ یہ تو کل کہیں سے اسمگل شدہ تمباکو اُس کے ہاتھ آ گیا۔ پر اِس تمباکو کے ملنے پر اُس کی خوشی دیکھنے والی تھی۔"

"اچھا، آ! میں تجھے بتاتی ہوں کہ اس کے سگریٹ کس طرح بنائے جاتے ہیں۔ یہاں صحن میں تو ہم گرمی کی شدت سے بھُن جائیں گے۔ چل، اندر چل کے بیٹھتے ہیں۔"

دونوں اندر چلی گئیں۔ عائشہ باجی نے کاغذوں کی ایک گڈی ہاتھ میں پکڑی۔ کاغذ ہونٹوں کے قریب لا کر اُن کے ایک سرے پر اتنے زور سے پھونک ماری کہ کچھ کاغذ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اس نے ان میں سے ایک کاغذ نکال لیا، پھر انگوٹھے اور شہادت والی انگلی جوڑ کر اُن کے اوپر اُس کاغذ کو ٹکا دیا، پوٹلی میں سے ایک چٹکی تمباکو کی نکال کر اُس کاغذ پر بکھیر دی۔ ساتھ ہی نظریں اٹھا کر جیواں کی طرف تکنے لگی۔ جیواں دیدے پھاڑ پھاڑ کے اُس کے ہاتھوں کی طرف حیرانی سے دیکھ رہی تھی، کہنے لگی، "میں بھی اسی طرح سے بنانے کی کوشش کیا کرتی ہوں۔"

عائشہ باجی نے اُس کی بات سن کر ہنکارا بھرا اور کہنے لگی، "اصل استادی تو یہ ہے کہ تمباکو صحیح مقدار میں ڈالا جائے، نہ کم ہو، اور نہ زیادہ۔"

"باجی! اس کے لیے کوئی ایسا پیمانہ نہیں جس کے ذریعے تمباکو کی کم یا زیادہ مقدار کا اندازہ لگایا جا سکے؟"

"وقت کے ساتھ ساتھ اے لڑکی! وقت کے ساتھ ساتھ۔ یہ سب تجربے کی باتیں ہیں، صحیح اندازہ تو تیری آنکھیں اور انگلیاں ہی کر سکتی ہیں۔"

عائشہ باجی نے تھوڑی دیر کے لیے اپنے کالوں میں سانس بھری اور اپنی ماہرانہ انگلیوں سے کاغذ میں بکھرا ہوا تمباکو کو گول شکل میں لپیٹ لیا اور کچھ دیر تک اس کو مروڑتی رہی۔ پھر ہونٹوں کے پاس لے جا کے کاغذ کے کھلے سرے کو زبان سے لعاب لگا کر چپکا دیا۔ جیواں نے بڑی بے صبری سے ہاتھ آگے بڑھایا اور بولی، "لا باجی عائشہ، اب مجھے پکڑا! باقی میں خود بنا لوں گی۔"

لیکن عائشہ باجی اُسے سگریٹ پکڑانے سے پہلے بڑے غصے سے بولی، "اصل ہنر تو سگریٹ کو گول کرنے میں ہے۔ تھوک لگا کے اِس کے کھلے سرے کو تو پھتو دائی بھی جوڑ سکتی ہے۔ لے پکڑ، باقی کام خود کر!"

جیواں نے سگریٹ لے لیا۔ اُس کی بے ہنر انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ بے چاری نے بڑی کوشش کی لیکن تمباکو سے بھرا کاغذ مروڑ کے گول نہ کر سکی۔

عائشہ باجی نے اُس کے ہاتھ پر زور سے تھپڑ مارتے ہوئے کہا، "چل، مان لیا کہ تُو نے خود کبھی یہ کام نہیں کیا، لیکن کیا کسی کو کرتے ہوئے بھی کبھی نہیں دیکھا؟ اب تک تیری عقل کہاں تھی نالائق!"

"پیاری عائشہ باجی!"

"اب زیادہ خوشامد نہ کر!"

"میں نے بتا جو دیا کہ میرے سے بہت بڑی غلطی ہو گئی جو یہ کام نہ سیکھا۔ اچھا ذرا ایک بار نئے سرے سے بنا کے تو دِکھا!" جیواں نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

"عقل کی بات کر لڑکی! میں نے اپنی ہنڈیا بھی پکانی ہے۔ دوپہر سر پر آ کھڑی ہے۔"

"میری بہت ہی پیاری باجی! میں تیرے ہاتھ چوم لوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ جب وہ شام کو گھر آئے تو اُس کا مزاج ناخوش گوار ہو۔"

عائشہ باجی کو اپنی شادی کے فوراً بعد کے شروع شروع کے دن شدت سے یاد آنے لگے، جب خاوند کے منہ سے بات بعد میں نکلتی اور پوری وہ پہلے ہی کر دیتی تھی۔ وہ ہر وقت اپنے گھر والے کے آگے پیچھے پروانے کی طرح گھومتی رہتی تھی۔ جیواں کو منتیں کرتا دیکھ کے وہ موم کی طرح پگھل گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے، آج شام تجھے شرمندگی اٹھانی نہ پڑے، اس لیے میں تجھے فوری طور پر کچھ سگریٹ تیار کر دیتی ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ تُو غور سے میری انگلیوں کی طرف دیکھتی رہے گی۔ دوبارہ میں ہرگز نہیں بنا کے دینے کی۔ سمجھ گئی نا!"

☆☆☆☆

سورج اگرچہ تین گھنٹے پہلے ڈوب چکا تھا، پھر بھی گرمی کی وجہ سے ہر طرف گھٹن کا سا احساس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سورج ڈوبا نہ ہو، بلکہ اندھیرے میں کہیں چھپا بیٹھا ہو۔ عائشہ باجی نے صحن میں چارپائی بچھا کے، اس کے اوپر مچھر دانی لگا دی اور اپنے گھر والے کو آواز دے کے کہنے لگی، "بستر تیار ہے آغا جی!"

اس کا گھر والا کوئی بات کیے بغیر چپ چاپ آ کے چارپائی پر لیٹ گیا۔ بڑی دیر تک دونوں میاں بیوی خاموش لیٹے رہے۔ اس کا گھر والا آنکھیں میچے پڑا تھا، پر عائشہ باجی کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے دل میں کسی بات کی کھٹک ہے۔ وہ کبھی ایک طرف کروٹ بدلتی تو کبھی دوسری طرف۔ لیٹے لیٹے اسے جیواں کی سگریٹوں کی بات یاد آ گئی۔ اب اس کی سمجھ میں بات آئی کہ اس کے دل میں چھپی کیا بات اسے بے چین کر رہی تھی۔ اُس نے اپنے گھر والے کو دھیمی آواز میں مخاطب کیا، "آغا جی! سو گئے کیا؟"

گھر والے نے اسے جواب تو دیا، لیکن ایسے جیسے کہیں دور سے بول رہا ہو۔ غالباً وہ سونے کے موڈ میں تھا۔

"ہاں، تقریباً سو ہی گیا تھا۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ عائشہ باجی چپ کر کے لیٹی رہی اور آسمان کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگی، جو باریک جالی دار مچھر دانی کے اوپر تنا ہوا تھا۔ نکھرے نکھرے تارے آج جانے کیوں قریب قریب دکھائی دے رہے تھے۔ عائشہ باجی نے آنکھیں بند کر لیں، پر اس کی آنکھوں میں نیند بالکل غائب تھی۔ وہ جان گئی کہ جب تک وہ اپنے گھر والے کو جیواں کی نالائقی کے بارے میں بتا نہیں لے گی، تب تک اسے نیند نہیں آ سکتی۔ اس نے پھر اپنے گھر والے کو آواز دی، "اتنی جلدی تو نہ سویا کریں آغا جی! مجھے ایک ضروری بات کرنی تھی آپ سے۔" گھر والے نے ہلکی سی جنبش لی اور غصے سے بھرے انداز میں بولا، "کہہ مر! کیا بات ہے؟"

عائشہ باجی نے جلدی سے اپنی بات کی تمہید باندھنے کی کوشش کی۔ "آج کل کی بیویوں کی مت پوچھیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے زمانے کی تو بات ہی اور ہوا کرتی تھی۔ وہ جیواں ہے نا..... وہی، جس کی ڈولی پچھلے ہفتے ہمارے پڑوس میں آئی تھی۔"

گھر والا نیند سے ذرا اور بیدار ہوا اور بولا، "ہاں

ہاں، کیا ہوا! کوئی بدنامی و دنامی۔"

"نہیں..... نہیں۔"

"تو پھر بتاناں، کیا ہوا اسے؟"

"اگر میں آپ کو بتاؤں تو خدا کی قسم ہنس ہنس کے آپ بے ہوش ہو جائیں گے۔"

"کم بخت! بتا بھی دے، معاملہ کیا ہے؟"

"کتنی حیرت کی بات ہے کہ جیواں کو سگریٹ لپیٹنے نہیں آتے۔"

گھر والے نے کروٹ بدلی اور حیران ہو کر پوچھا، "تو پھر؟" "بس پھر کیا۔ ہمارے زمانے میں تو ایسی بیویوں کی کوئی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔"

"اس کے گھر والے نے مار مار کے اس کا پنڈا نیلا نہیں کیا؟"

"میں کہتی ہوں۔ پہلے پوری بات تو سنیں۔ پتا ہے، آج کیا ہوا؟" عائشہ باجی کے چہرے پر مسکان کھیلنے لگی۔ درحقیقت وہ اپنے گھر والے سے اپنی مہارت اور آج کل کی لڑکیوں کے پھوہڑ پن کا ذکر کر کے داد وصول کرنا چاہتی تھی۔

"جی آغا جی! یہ لڑکی بیاہی تو گئی ہے، پر بے چاری کو ابھی تک سگریٹ بنانا نہیں آیا۔ اُس کو بھی بھلا کوئی 'عورت' کہہ سکتا ہے؟ کہتی ہے، میرا باپ سگریٹ کا عادی نہیں تھا۔ بھلا ماں کو بھی عقل نہ آئی کہ بیٹی کو یہ ہنر سکھا ڈالتی۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

گھر والے نے بات مختصر کرتے ہوئے کہا، "ظاہر ہے، قصور اس کی ماں کا ہے۔ جسے چاہیے تھا کہ اپنی بیٹی کو پاس بٹھا کے، سر پر دس جوتیاں مار کے سکھاتی۔ بس، قیامت کے آثار ہیں اور کیا ہیں۔"

"اللہ قسم! آپ نے بالکل سچ کہا ہے۔ اچھا آپ اپنے ایمان سے بتائیں۔ میں نے کبھی آپ کو ایک دانہ کے لیے سگریٹ کے بغیر رہنے دیا ہے؟ پر افسوس، آپ نے تو ہماری قدر ہی نہیں جانی۔"

"اچھا اچھا، زیادہ سر پر نہ چڑھ!"

"اس میں سر پر چڑھنے کی کیا بات ہے۔ اس لڑکی جیواں کے بھی آخر آج میں ہی کام آئی۔"

وہ کس طرح؟"

"بس آج اپنے ابا کے صدقے میں نے ایک ہی سانس میں بہت سارے سگریٹ بنا کے جیواں کے منہ پہ مار دیے۔"

گھر والا غصے میں اس کی جانب پلٹا۔ "کون سے سگریٹ؟"

عائشہ باجی کو اپنے سرہانے کی طرف ایک چنگھاڑتی چنگاڑ کا سا سایہ محسوس ہوا۔ وہ کانپ گئی۔

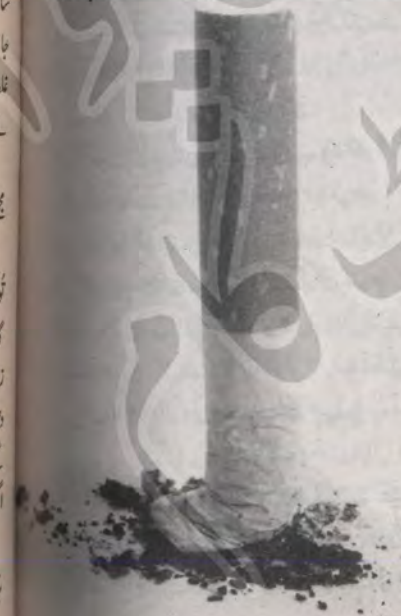

زبان پر آئے ہوئے الفاظ اس کے ہونٹوں ہی پر چپک کے رہ گئے۔ وہ بڑی مشکل سے تھوک نگلتے ہوئے بولی، "جیواں جو تمباکو لے کے آئی تھی، اس کے سگریٹ۔"

یہ سننا تھا کہ اس کے گھر والے نے اسے بالوں سے پکڑ لیا۔ وہ غصے سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ "اس کا مطلب ہے، اب غیر مردوں کے ہاتھوں میں تیرے بنائے ہوئے سگریٹ گھوم رہے ہیں۔ تف کمینی عورت!"

"میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا آغا جی؟ خدا کے لیے مجھے مت ماریں۔ آپکی قسم، مجھ سے واقعی غلطی ہو گئی۔"

عائشہ باجی کا گھر والا غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ اسے مارتا بھی جا رہا تھا اور گالیاں بھی بکے جا رہا تھا۔ "کم بخت! آگے سے کہتی ہے، میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ لے، چکھ مزہ! کم عقل کتنی عورت! تو نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

"میری توبہ آغا جی! خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔ مجھے مت ماریں میرا قصور تو بتائیں..... ہائے!"

"میں تجھے تیرا قصور بتاؤں، بے ایمان عورت! تو نہیں جانتی، کل کیا ہوگا۔ وہ خبیث قہوہ خانے جائے گا اور دوستوں کو سگریٹ پیش کرے گا۔ وہ حرام زادے بھی سگریٹ لے کے سلگائیں گے، دھوئیں پر دھواں چھوڑیں گے اور سگریٹ کی طرف دیکھ کر کہیں گے، 'کیا خوب صورت بھرے ہوئے سگریٹ ہیں اور اگر جیواں کے گھر والے نے بتا دیا کہ....."

"خدا کے لیے اب ہاتھ روک لو آغا جی! میری ہڈیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ ماں! میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں آغا جی! اور نہ ماریں مجھے۔"

"میں تجھے نہ ماروں..... ہیں؟ ذلیل عورت! تجھے تو گولی مار دینی چاہیے۔ کہاں ہے میرا ماؤزر حیف ہے تیرے ان ہاتھوں پر اگر وہ کم بخت، نامراد اس وقت یہ کہہ دے کہ یہ سگریٹ عثمان سنار کی گھر والی کے ہاتھوں بنے ہوئے ہیں تو پھر؟"

عائشہ باجی کے سارے جسم کا ماس سوج گیا۔ اس کی آواز بھی بیٹھ گئی۔ اس نے چیخ ماری، "ہائے مر گئی لوگو۔ میں مر گئی۔" مگر اس کے گھر والے کا ہاتھ نہ رکا اور اس کے جسم پر کوڑے بن کر برستا رہا۔

"تُو مر گئی کہ میں مر گیا، نامراد؟ جب وہ حرام زادے کہیں گے کہ عثمان سنار کی گھر والی کے ہاتھوں کے بنے ہوئے یہ سگریٹ..... پھر پتا ہے کیا ہوگا؟ وہ کنجر کے بیچ آنکھیں بند کر کے تیری انگلیوں کے بارے میں سوچنے لگ جائیں گے۔ ان باتوں سے کیسے بچا جا سکتا ہے، حرافہ عورت، بتا! پھر وہ کہیں گے، کتنی خوب صورت انگلیاں ہوں گی سگریٹ بنانے والی کی۔ وہ یہ ہرگز نہیں سوچیں گے کہ چالیس سال بعد عثمان سنار کی گھر والی نے پرائے مردوں کو سگریٹ بھر بھر کے پلانے کیوں شروع کیے ہیں؟ پھر وہ مسٹنڈے، جن کی اپنی گھر والیاں اچھی بھلی گھر بیٹھی ہوئی ہیں۔"

عائشہ باجی کی سانس دھیمی پڑتی جا رہی تھی۔ وہ بالکل بے سُدھ ہو گئی۔

دوسری طرف، پڑوسیوں کے ہاں، جیواں اپنے گھر والے کے سامنے شیخی بگھارتے ہوئے کہہ رہی تھی، "اچھے بنے ہیں نا سگریٹ! یہ میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں۔"

■■■

”مومو“ سے ملیے

ہیروئن نہ ہوتے ہوئے بھی ہر خاص و عام میں
مقبولیت پانے والی اداکارہ کا احوال

گل جانہ شاہ

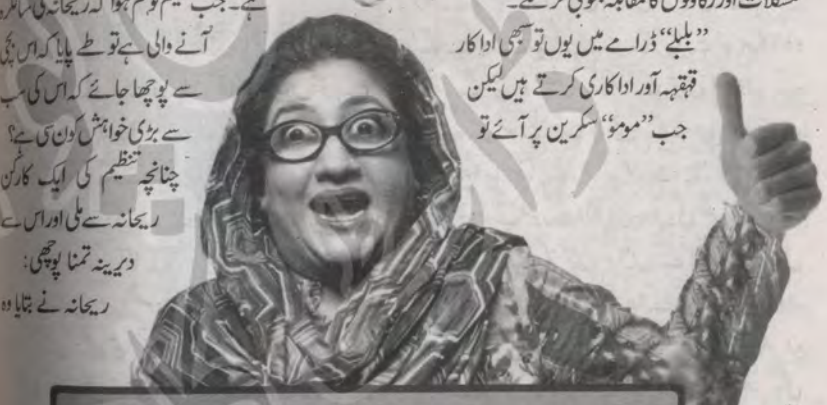

کراچی کی 8 سالہ معصوم بچی ریحانہ رضوان خون کے ایک موذی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ قومی ادارہ برائے امراض خون (National Institute of Blood Diseases) میں زیرِ علاج ہے۔ اس کا تعلق نئی کراچی کے ایک غریب گھرانے سے ہے۔ مذکورہ بالا ادارے میں مختلف امراض خون میں مبتلا لڑکے لڑکیاں زیرِ علاج ہیں۔

شام کے وقت یہ بچے، بچیاں مزاحیہ ٹی وی پروگرام دیکھ کر گزارتے ہیں۔ اے آر وائی سے دکھایا جانے والا ڈراما سیریل ”بلبلے“ ان کا پسندیدہ پروگرام ہے۔ دراصل مزاح میں یہ زبردست طاقت پوشیدہ ہے کہ وہ انسان کا موڈ خوشگوار بنا کر اسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ روزمرہ مشکلات اور رکاوٹوں کا مقابلہ بخوبی کر سکے۔

”بلبلے“ ڈرامے میں یوں تو سبھی اداکار قہقہہ آور اداکاری کرتے ہیں لیکن جب ”مومو“ سکرین پر آئے تو سبھی کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔ خصوصاً جب وہ ٹیڑھی میڑھی ہو کر چلتی اور بار بار نام بھول جاتی ہے تو بچے کھلکھلا کر ہنسنے لگتے ہیں۔

”مومو“ خصوصاً ریحانہ کی پسندیدہ اداکارہ تھی۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ مومو سے ملاقات اور ڈھیر ساری باتیں کرے۔ اتفاقاً کچھ عرصہ قبل ریحانہ کی آٹھویں سالگرہ کا موقع آیا۔ تب ایک عجیب واقعہ ظہور پذیر ہوا اور ریحانہ کی آٹھویں سالگرہ کو یادگار بنا گیا۔

ہوا یہ کہ کراچی کی ایک تنظیم، ”کوئی خواہش کرو“ (Make a wish) بیمار بچوں سے ملتی، ان کی پسندیدہ ترین تمنا پوچھتی اور پھر اسے پورا کرنے کی سعی کرتی ہے۔ جب تنظیم کو علم ہوا کہ ریحانہ کی سالگرہ آنے والی ہے تو طے پایا کہ اس بچی سے پوچھا جائے کہ اس کی سب سے بڑی خواہش کون سی ہے؟ چنانچہ تنظیم کی ایک کارکن ریحانہ سے ملی اور اس سے دیرینہ تمنا پوچھی:

ریحانہ نے بتایا وہ ”مومو“ سے ملنا چاہتی ہے۔ تنظیم نے اسی وقت مومو سے ملنے کی کوششیں شروع کر دیں۔

جس دن ریحانہ کی سالگرہ تھی، تو شام کو تنظیم نے ہسپتال کے باغ میں ایک چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کیا۔ ریحانہ کی سالگرہ پہلے اتنے تزک و احتشام سے کبھی نہیں منائی گئی تھی لہٰذا وہ بہت خوش تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ابھی ایک اور ”سرپرائز“ اس کا منتظر ہے۔

ریحانہ جب کیک کاٹنے لگی، تو اچانک ”مومو“ جانے کہاں سے آئی اور اس کے قریب کھڑی ہو گئی۔ یہ دیکھ کر ریحانہ حیران پریشان ہوئی پھر اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ دونوں نے مل کر کیک کاٹا اور مومو ہی نے اسے ایک ٹکڑا کھلایا۔ بعدازاں ریحانہ نے جی بھر کر اپنی پسندیدہ اداکارہ سے باتیں کیں اور انھیں ”بلبلے“ کے من پسند رکالے سنا کر حیرت زدہ کر دیا۔

دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی اداکارہ مقبول ہو جائے تو پھر وہ عام لوگوں سے کترانے لگتی ہے۔ وجہ کوئی بھی ہو عموماً یہی کہا جاتا ہے کہ وہ مغرور اور خودغرض ہو گئی۔ لیکن ”مومو“ میں غرور نام کو نہیں، اسی لیے جب انھیں ایک معصوم بچی کی ننھی سی خواہش کا علم ہوا تو فوراً اسے پورا کرنے کی ہامی بھر لی۔ یہ مومو کی نیک و نرم طبیعت کی منہ بولتی مثال ہے۔

☆☆☆

آپ اور ہم سب کی ”مومو“ کا اصل نام حنا دلپذیر ہے۔ شاید یہ انوکھے نام کی برکت ہے کہ وہ واقعی پاکستان بھر کی دلپذیر ہستی بن گئیں۔ لاہور میں پیدا ہوئیں۔ بچپن سے اداکاری کا شوق تھا لیکن ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسٹیشنوں میں کوئی جاننے والا نہ تھا لہٰذا انھیں اپنے جوہر دکھانے کا کوئی موقع نہیں مل سکا۔ پھر شادی ہوئی اور وہ متحدہ عرب امارات چلی گئیں۔

دلپذیر چاہتی تو برطانیہ یا امریکا کی شہریت بآسانی لے سکتی تھیں لیکن انھوں نے پاکستان واپس آنے کو ترجیح دی۔ وہ پکی پاکستانی اور وطن سے محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ پھر من میں یہ خواہش بھی بسی تھی کہ شاید اردو ڈراموں میں اداکاری کا موقع مل جائے۔

برنس روڈ کی نیلوفر

کراچی پہنچ کر دلپذیر نجی و سرکاری ٹی وی اسٹیشنوں کے چکر لگانے لگیں۔ چونکہ وہ کسی سے واقف نہیں تھیں لہٰذا انھیں اپنا آپ منوانے میں خاصا وقت لگا۔ دراصل وہ ظاہری خوبصورتی نہیں رکھتی اور بیش تر ٹی وی اسٹیشنوں میں ایسا جوہری موجود نہ تھا جو ان میں پوشیدہ اداکارانہ صلاحیتیں پہچان لیتا۔

آخر ایک انوکھے طریقے سے دلپذیر کو اپنے پہلے ڈرامے، برنس روڈ کی نیلوفر میں کام مل ہی گیا۔ ہوا یہ ہے کہ ڈرامے کے ہدایت کار مظہر معین کو مرکزی کردار (نیلوفر) کے لیے ایسی اداکارہ کی تلاش تھی جو ایک جاہل چونچال لڑکی کا کردار ادا کر سکے۔ دلپذیر نے خود کو پیش کرتے ہوئے مظہر معین کو چیلنج دیا کہ وہ ان سے بہتر اداکارہ تلاش نہیں کر سکتے۔ مظہر نے کئی اداکاراؤں کا آڈیشن لیا لیکن واقعی کردار پر دلپذیر ہی موزوں بیٹھیں۔ چنانچہ نیلوفر کا کردار انھیں ہی ملا۔

برنس روڈ کی نیلوفر میں دلپذیر نے شاندار اداکاری دکھا کر سبھی سے داد سمیٹی۔ خاص و عام نے انھیں فون کر کے بے مثال اداکاری پر مبارک باد دی۔ دلپذیر نجی زندگی میں بڑی مہذب، سلجھی ہوئی اور نستعلیق قسم کی خاتون ہیں۔ لیکن انھوں نے نیلوفر کا کردار اتنے حقیقت پسندانہ انداز میں نبھایا جیسے وہ بڑی اجڈ اور گستاخ لڑکی ہو۔

پہلے ڈرامے کی کامیابی کے بعد دلپذیر کو مختلف ہدایت

کاروں کی جانب سے پیش کشیں ملنے لگیں۔ تاہم انھوں نے وہی کردار قبول کیے جو وہ کر سکتی تھیں اور طاقت ور بھی تھے۔

حنا دلپذیر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر انسان سے امیر ہو یا غریب، گھل مل جاتی ہے۔ خصوصاً وہ انوکھی شخصیت کے مالک سے ضرور ملتی ہیں۔ یوں رنگا رنگ انسانوں سے ملنے کے تجربات نے انھیں یہ سیکھنے میں مدد دی کہ مختلف الانواع کردار کامیابی سے کیونکر ادا کیے جاتے ہیں۔ مزید برآں اسی خصوصیت نے دلپذیر کو یہ صلاحیت بخش دی کہ وہ ہر قسم کا کردار بھرپور اور موثر طریقے سے کر سکے اور یہی ان کی کامیابی و مقبولیت کا راز بھی ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہیروئن نہ ہوتے ہوئے بھی حنا دلپذیر عام و خواص میں مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب رہیں۔ پھر انھوں نے مختصر مدت میں رنگا رنگ کردار اتنی خوبی سے ادا کیے کہ سبھی پر اپنی صلاحیت کا سکہ بٹھا دیا۔ پاکستان کی ورسٹائل اداکارہ، بشریٰ انصاری کہتی ہیں:

''کون کہتا ہے کہ میرے بعد مجھ جیسی کوئی اور ہم نوع اداکارہ نہیں آئی؟ میں کہتی ہوں کہ مجھ سے بھی کہیں باکمال اور مزے دار اداکارہ آ گئی ہے..... اور وہ ہے حنا دلپذیر..... میں حنا کے تمام ڈرامے بہت شوق اور مزے سے دیکھتی اور لطف اٹھاتی ہوں۔'' شاید ایک بہترین اداکارہ کی طرف سے دوسری عمدہ اداکارہ کے لیے یہ بہترین تبصرہ ہے۔

تاہم شہرت نے دلپذیر کے دماغ میں خناس نہیں بھرا اور نہ وہ آپے سے باہر ہوئی ہیں۔ کہتی ہیں ''انسان کب بے رنگ ہو جاتا ہے، اس کو خود پتا نہیں چلتا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہی ہے کہ میری اداکاری پسند کی گئی۔ اگر کوئی مشہور ہونے کے لیے اداکاری کرتا ہے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اداکاری بہت خطرناک اور سنجیدہ شعبہ ہے اور بچوں کا کھیل نہیں۔''

قدوسی صاحب کی بیوہ

بلبلے میں اداکاری کے جوہر دکھانے کے بعد زرینہ ''قدوسی صاحب کی بیوہ'' میں تو دلپذیر نے بیک وقت چار سے زائد مختلف کردار ادا کر کے سبھی کو ششدر کر دیا۔ ڈرامے میں ''اماں'' گھرانے کی سربراہ اور ایک سخت گیر عورت ہے۔

اس کی بیٹی، بدر محکمہ تعلیم کی افسر ہے۔ اسی کی تنخواہ پر گھر چلتا ہے چنانچہ اماں اس کی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ ڈرامے کا ایک کردار روح افزا کا ہے جو فلموں کی دلدادہ اور خاصی یو لائی ہوئی پھرتی ہے۔ ایک اور کردار، بنگالی باجی عورتوں کی مشکلات اور مسائل حل کرتا ہے۔ یہ چاروں کردار حنا دلپذیر نے بڑی خوبصورتی سے ادا کیے۔

اس ڈرامے کی ایک خاصیت کثیر تعداد میں محاوروں کا استعمال ہے جنھیں ''اماں'' بڑے برمحل اور خوبصورت انداز میں ادا کرتی ہے۔ پھر وہ ایسے الفاظ بولتی ہے جو اب صرف لغت میں ملتے ہیں اور عام بول چال میں مستعمل نہیں۔ چنانچہ یہ ڈراما نئی نسل کو دلچسپ اردو محاوروں اور الفاظ سے متعارف کرا رہا ہے۔

عام زندگی میں حنا دلپذیر سب سے زیادہ اپنے والد کے قریب تھیں جن کا کچھ عرصہ قبل انتقال ہوا ہے۔ بتاتی ہیں ''وہ میرے باپ نہیں دوست تھے، مددگار اور تحریک دینے والے۔ میں نے انہی سے دیانت اور راست بازی سیکھی۔ اگر انھیں کسی کی کوئی حرکت پسند نہ آتی تو اسے منہ پر ٹوک دیتے تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان کی روح اب بھی میرا سہارا بنی ہوئی ہے۔''

■■■

فلسطینیوں اور مصریوں کے ساتھ 14 دن

غزہ میں پہلا قدم

کیا خوش کن، خوشگوار اور خوبصورت لمحہ تھا

اردو ڈائجسٹ کا تاریخی اعزاز
فلسطینی خطے غزہ کا دورہ کرنے والے پہلے پاکستانی ایڈیٹر
کا سفرنامہ جو دنیا سے کٹی دنیا کو آپ کے دل سے جوڑ دیتا ہے

تحریر و تہذیب: اختر عباس

- سرنگوں میں چنگ چی کا کیا کام؟
- غزہ میں ٹنل سروس کیسے شروع ہوئی؟
- شاندار استقبال نے ساری تھکاوٹ دور کر دی
- اسرائیل ڈپلومیٹس کو مصر میں گھر کیوں نہیں ملتے؟
- فلسطینی وزیراعظم اسماعیل ھنیا کا خوش آمدید
- اسی کمرے میں چند روز قبل خالد مشعل ٹھہرے تھے
- اسی سڑک پر اسرائیلی فوجی لوگوں کو 8,8 گھنٹے کھڑا رکھتے تھے
- بٹ صاحب یاسر عرفات کے تباہ شدہ ہیلی کاپٹر میں گھس گئے

بسوں میں سوار مسافروں کے پاسپورٹ چیک ہوتے اور وہ سامان سمیت گزر جاتے۔

پیدل کراس کرنے والے فلسطینیوں میں لڑکیاں، لڑکے، فیملیز، بوڑھے ہر عمر کے لوگ قطار بنائے کھڑے تھے۔ فلسطین کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خوبصورتی کے دس حصے بنائے 9 حصے فلسطین کو دے دیئے اور ایک حصہ باقی دنیا کو۔ انبیاء کی سرزمین کے دروازے سے ہم کچھ دور ہی تھے۔ انتظار، بے تابی اور بے چینی میں ڈھلنے لگا تھا۔ دل میں کتنے ہی خطرات اور خدشات تھے، انہی کی وجہ سے لاہور میں جس جس کو پتا چلا تھا کہ غزہ جا رہا ہوں اسی نے سمجھانے کی کوشش کی کہ خطرناک علاقہ ہے، مت جائیے۔ یہاں تک بتایا گیا کہ دنیا کے لیے غم کو دس حصوں میں تقسیم کیا گیا تو نو حصے فلسطین کو دیئے گئے۔ وہاں لوگ کیسے ہوں گے، دن کیسے گزریں گے، ابھی اسی سوچ میں تھا کہ اچانک ہلچل ہوئی پتا چلا کہ جامعہ الزہر کا ایک وفد آیا ہے جو غزہ جا کر جمعہ پڑھائے گا اور وہاں خطیبوں کو تربیت دے گا۔ لمبی لمبی شیروانیاں اور کالی ٹوپیاں ان کو سب سے نمایاں کر رہی تھیں۔ لوگ دھڑا دھڑ تصویریں بنوا رہے تھے۔ ایک صاحب آئی پیڈ پر تصاویر بنا کر اپنے وفد کے سربراہ کو بھی دکھا رہے تھے۔ بڑا سا بینر بھی بنا کر ساتھ لائے تھے۔ میں نے بھی چند تصاویر لیں۔ 11 بجے کے قریب ایک اکلوتی دکان پر چائے لینے گیا۔ قہوے کے ساتھ بسکٹ اور کیک بھی لیے، ٹرے میں رکھے اور لے آیا۔

گاڑی میں سبھی نے ٹرے دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔ دس بارہ پاؤنڈ کے کیک اور بسکٹ تھے۔ بھوکے پیٹ سے تھے سبھی ٹوٹ پڑے۔ عمران غیور صاحب، خلیفہ کے ان سات ڈبوں میں سے ایک کو جو انتظار صاحب اکبری منڈی لاہور سے تحائف کے طور پر لائے تھے، اپنی گود میں رکھ کر بیٹھے تھے تاکہ بٹ صاحب سے پوچھ کر ناشتے کے لیے کھول سکیں۔ بٹ صاحب نے بخوشی اجازت دے دی تو وہ بسکٹ بھی کھائے گئے۔ چائے کے نام پر کڑوا سیال پیا۔ اس کا رنگ اور مزہ ایسا تھا کہ مجبوری میں بھی اس میں بسکٹ ڈبو کر کھانے کا رسک نہیں لیا جا سکتا تھا۔

تصویریں

رفاہ گیٹ کے ساتھ ساتھ میں وہاں آتی جاتی فیملیز اور ان کے سامان کی تصویریں لے رہا تھا۔ یہ بے خوفی تھی، اطمینان تھا، ضرورت بھی مگر یوں آسانی سے مود کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہاں سے میں قریبی کھیتوں کی طرف چلا گیا تاکہ غرقد کی تصویر بنا سکوں۔ وہاں زیتون کے پودے تھے۔ ایلوویرا کے بڑے بڑے پتوں والے پودے تھے، پتا چلا کہ غرقد، غزہ میں نہیں یروشلم کے آس پاس اُگایا جاتا ہے۔

ایک آنکھ والی عورت

اچانک بٹ صاحب نے کہا کہ ہوٹل کے باہر ایک عورت اپنے میاں کے ساتھ بیٹھی ہے، آنکھ پر پٹی بندھی تھی۔ مصر کے کسی شہر سے آپریشن کروا کر آئی تھی۔ بٹ صاحب کی خواہش تھی کہ اس کی تصویر لے لیں بہانے بہانے سے بٹ صاحب کو ایک بڑے سے ٹوٹے گملے (Vass) کے ساتھ کھڑا کیا اور اس خاتون کی تصویریں لے لیں۔

انتظار کی نہ ختم ہونے والی کوفت

غزہ جانے والوں کی قطار لمبی سے لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ اندر سے آنے والوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ کبھی کبھی کوئی باہر آتا تو کرنسی بدلنے والے، ٹیکسی والے اس پر ٹوٹ پڑتے۔ اس بیچارے کو جان چھڑانی مشکل ہو جاتی۔ میں گاڑی سے اتر کر ہوٹل میں بھی ایک دو بار گیا

2006ء جب پورا نقشہ ہی بدل گیا

غزہ کے محلے الدرج میں آج بھی وہ قبر موجود ہے۔ قبر کے پڑوس میں ایک شان دار تاریخی مسجد، مسجد سید ہاشم واقع ہے۔ یہ مسجد ممالیک کے عہد میں تعمیر کی گئی۔ سلطان عبدالحمید نے 1850ء میں اس کی تجدید کی، غزہ کو اسی حوالے سے غزہ ہاشم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ مصر کی وادی سینا سے منسلک اور بحر متوسط کے ساحل پر پھیلی ہوئی 40 کلومیٹر لمبی اور 10 کلومیٹر چوڑی غزہ کی پٹی میں 15 لاکھ فلسطینی بستے ہیں۔ 1948ء میں سرزمین فلسطین پر قبضہ کر کے جب صہیونی ریاست قائم کرنے کا اعلان کیا گیا تو غزہ کی پٹی مصر کے زیر انتظام آ گئی۔ مصری انتظام 19 سال تک قائم رہا۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے نتیجے میں دیگر وسیع علاقوں کے ساتھ ہی ساتھ غزہ پر بھی صہیونی افواج نے قبضہ کر لیا اور غزہ ہاشم پر ابتلا کا نیا دور شروع ہو گیا۔ 1948ء کے بعد دیگر فلسطینی علاقوں سے بھی مہاجرین کی بڑی تعداد غزہ منتقل ہو گئی تھی یوں آٹھ مہاجر خیمہ بستیاں وجود میں آئیں۔ یہودیوں نے بھی یہاں اپنی 25 جدید بستیاں تعمیر کیں اور غزہ کی یہ مختصر سی پٹی کثافتِ آبادی کے لحاظ سے دنیا کی سب سے گنجان انسانی آبادی بن گئی۔ مفلوک الحال آبادی سسک سسک کر جی رہی تھی کہ وہاں جہاد و مزاحمت سے آشنا ایک نئی نسل نے جنم لیا۔ شیخ احمد یٰسین، ڈاکٹر عبدالعزیز الرنتیسی اور انجینیر یحییٰ شہید جیسے راہ نماؤں نے اس نسل کی تربیت کا بیڑا اٹھایا۔ اسلامی یونیورسٹی غزہ جیسے شان دار تعلیمی ادارے قائم کیے اور بالآخر 1987ء میں اسلامی تحریک مزاحمت حماس (یعنی جوش وجذبہ) وجود میں آ گئی۔ انتفاضہ میں پتھروں اور غلیلوں سے ٹینکوں کا مقابلہ کیا گیا، معصوم بچوں نے کنکریوں سے دیوقامت ٹینکوں اور جدید ترین ہتھیاروں کا مقابلہ کیا۔ ابابیل صفت بچے گھروں سے نکلتے ہوئے باوضو ہو کر آتے، مساجد میں نوافل ادا کرتے اور صہیونی درندوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نکل پڑتے۔ بظاہر صہیونی اسلحے کے انباروں اور بے وسیلہ بچوں کا کوئی تقابل نہیں تھا لیکن دنیا نے دیکھا کہ ہزاروں شہدا، زخمیوں اور قیدیوں کا نذرانہ دینے کے بعد بالآخر بے وسیلہ تحریک انتفاضہ ہی کامیاب ہوئی اور 1967ء سے غزہ پر قابض صہیونی افواج 2005ء میں انخلا پر مجبور ہوئیں۔ صہیونی اور امریکی منصوبہ یہ تھا کہ اسرائیلی انخلا کے بعد غزہ اور مغربی کنارے میں فلسطینی آپس ہی میں لڑتے ختم ہو جائیں۔ صہیونی استعمار کے ساتھ مذاکرات و مصالحت کرنے والی الفتح تحریک خود کو فلسطینی عوام کا اکلوتا نمایندہ قرار دیتی رہی ہے۔ وہی 1993ء کے بعد سے لے کر غزہ اور مغربی کنارے میں قائم فلسطینی اتھارٹی کے سیاہ و سفید کی مالک تھی۔ صہیونی اور امریکہ منصوبہ ساز اس اتھارٹی کے ذریعے فلسطینی مجاہدین کو فلسطینی حکمرانوں کے ہاتھوں نیست و نابود کروانا چاہتے تھے۔ اربوں ڈالر کی امداد کا اعلان کیا گیا اور یہ جانتے کے باوجود کہ یہ خطیر امدادی رقم چند جیبوں میں جا رہی ہے اس کرپشن پر کوئی اعتراض نہ کیا گیا۔ مزید امداد کے لیے اکلوتی شرط یہی رکھی گئی کہ مزید دہشت گردوں، یعنی مجاہدین کا قلع قمع کرو۔

یہ منصوبہ اور سازش شاید کامیاب ہو جاتی لیکن جنوری 2006ء میں پورا نقشہ ہی بدل گیا۔ انتخابات ہوئے اور حماس نے پہلی بار انتخابات میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔ امریکا، اسرائیل اور فلسطینی اتھارٹی نے لاکھ دھمکیاں دیں کہ اگر حماس کو منتخب کیا گیا تو امداد بند کر دی جائے گی..... اسرائیل پھر فوج کشی کر دے گا..... محاصرہ کر دیا جائے گا..... لیکن فلسطینی عوام نے بھاری اکثریت سے حماس ہی کو اپنا نمایندہ منتخب کیا۔ امریکا، اسرائیل اور ان کی پسندیدہ فلسطینی اتھارٹی سب ایک مخمصے کا شکار ہو گئے۔ اپنے وضع کردہ نظام کو باقی رکھتے ہوئے حماس کو حاصل دو تہائی اکثریت تسلیم کر لیں یا سب کچھ لپیٹ کر واپس 1993ء سے پہلے کی صورت حال میں جا پہنچیں۔ طویل لیت و لعل کے بعد صدر محمود عباس کو پارلیمنٹ کا اجلاس بلانے، منتخب ارکانِ اسمبلی اور ارکانِ حکومت سے حلف لینے کی ہدایات دی گئیں۔ وزیراعظم اسماعیل ھنیہ اور ان کے ساتھیوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔

مگر وہاں کھانے کی کوئی تازہ چیز نہ تھی سوائے میٹھے بسکٹ اور کڑوی چائے کے۔ آس پاس نہ سایہ تھا نہ کوئی فروٹ اور کھانے کی تازہ چیز۔ ہاں ہر طرف انتظار کی نہ ختم ہونے والی کوفت تھی۔

لیٹ کر گاڑی میں سو گیا

تنگ آ کر گاڑی میں لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد نیند آ گئی، اٹھا تو ظہر کا وقت تھا۔ سڑک خالی تھی سب لوگ جا چکے تھے اور ہماری اکیلی گاڑی کھڑی تھی۔ حتیٰ کہ شہد اور زیتون بیچنے والی عورتیں بھی جا چکی تھیں۔ وضو کیا، دکان کی چھت پر بنی مسجد میں جا کر ظہر کی نماز پڑھی۔ واپسی پہ برادر عبدالرحمٰن الردعی موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ قاہرہ سے انٹیلی جنس کی کلیرنس رپورٹ نہیں آئی۔ ڈاکٹر خالد حنفی نے ایک انٹیلی جنس آفیسر کا نام دیا تھا۔ وہ بھی اندر موجود ہے۔ بٹ صاحب اس سے مل چکے ہیں مگر بات نہیں بنی۔ ایمبیلی جنس کلیرنس کے بغیر اندر جایا ہی نہیں جا سکتا اور کلیرنس ابھی آئی نہیں۔

اخوان اراکین پارلیمنٹ سے ملاقات

سب سے دلچسپ بات یہ ہوئی کہ وہاں اخوان المسلمون کے دو اراکین پارلیمنٹ سے ملاقات ہوئی۔ بٹ صاحب نے انھیں اپنے وفد اور مشن کی تفصیل بتائی۔ انھوں نے گیٹ پر متعین عملے کی طرف دیکھا تو انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا ''ہمارے اخوان بھائی اب قانون ساز ادارے کے ممبر بن گئے ہیں۔ انھیں پتا ہے کہ قانون کی اہمیت کیا ہے اور اس کی عمل درآمد کی صورت کتنی ضروری ہے۔'' دونوں چپ رہے۔ برادر الردعی نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''آپ واپس جائیں گے۔ کل جمعہ کی چھٹی ہے بارڈر پر کام نہیں ہوگا۔ میں ادھر غزہ میں ہی رہوں گا۔ جونہی قاہرہ سے رپورٹ آئے لی تو میں آپ کو بلا لوں گا۔''

اس کا مشورہ تھا کہ 400 کلومیٹر دور قاہرہ جانے کی بجائے آپ ''العریش'' شہر میں رک جائیں اور وہاں ٹھہریں تا کہ دوبارہ سے چار سو کلومیٹر طے کر کے نہ آنا پڑے۔ بٹ صاحب نے قاہرہ واپسی کا فیصلہ سنایا۔ وہاں سے روانہ ہوئے تو بٹ صاحب نے بعد میں ایک مزے کی بات کہی کہ اگر وہاں العریش رک جاتے تو پتا چلتا کہ اگلے ہی روز کسی کام اور تفریح کی عدم موجودگی میں وفد کے اراکین باہم تعلقات خراب کر کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ چھوٹے سے قصبے نما شہر میں نہ کوئی سرگرمی تھی نہ ایکٹویٹی، نہ سیر کے لیے جگہ، زیادہ دیر ایک دوسرے کو دیکھا جائے تو اسی طرح کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ 2005ء سے بیرون ملک پی او بی ٹرسٹ (Perventim of Blindness Trust) کے تحت ڈاکٹروں کے وفود 15 ممالک میں لے جا چکے ہیں۔ لوگوں، موسموں اور شہروں کے مزاج کو بخوبی سمجھتے ہیں، آنے والے دو دنوں نے مجھے بھی سمجھا دیا کہ پڑھے لکھے بزرگوں کے ساتھ رہنے کے لیے کافی دل گردہ چاہیے وہ ایک دن جس چیز سے انکار کرتے ہیں، دوسرے دن اسی کے لیے کہہ رہے ہوتے ہیں۔ دل میں طے کیا کہ اس پر چڑنا نہیں۔ اگر کہا جاتا ہے کہ سیر پر چلیں۔ جواب ملتا کوئی ضرورت نہیں سارا دن خوار ہونے کی۔ مشورہ ہوتا آج آرام کرتے ہیں، جواب آتا ''نہیں سیر پر چلتے ہیں۔ اتنی دور آئے کیوں ہیں۔ کیا کمرے میں پڑے رہیں۔'' شکر خدا کا ہمارے کمرے الگ الگ ہیں۔ 5 دن سے اس چکر میں ساری دوپہر بھوکے رہتے ہیں کہ بزرگ دوپہر کو کھانے کے حق میں نہیں۔ میں نے نوٹ کیا کبھی اپنے اپنے طور پر بھوک

محاصرے کی ہلاکت خیزماں

کہنے کو تو ایک منتخب حکومت اور پارلیمنٹ وجود میں آ گئی لیکن عملاً یہ زہریلے کانٹوں سے بھرا ایک تاج تھا جو حماس حکومت کے حصے میں آیا۔ کہنے کو تو صہیونی انخلا کے بعد غزہ سے اسرائیلی افواج کی نمایندگی کرنے والے دندناتے پھرتے تھے۔ منتخب حکومت کو ایک دن بھی سکھ کا سانس نہیں لینے دیا گیا۔ 1993ء میں صہیونی انتظامیہ کے ساتھ اوسلو معاہدے کے نتیجے میں متعارف کروائی جانے والی فلسطینی اتھارٹی کی بنیاد ہی بیرونی مالی امداد اور اسرائیلی شراکت داری پر رکھی گئی تھی، جماس کی حکومت آتے ہی تمام بیرونی امداد یکسر بند کر دی گئی۔ اسرائیلی انتظامیہ نے تعاون کے بجائے عداوت کے نئے مورچے کھول لیے اور ان سے یہی توقع تھی۔ حماس نے چیلنج قبول کیا اور کہا کہ امداد بند ہے تو بند رہے ہم اپنا جہاں خود پیدا کریں گے۔ پورے عالم اسلام کے عوام نے ان کے لیے مالی امداد جمع کرنا شروع کی، ایک خطیر رقم جمع ہوگئی۔ بعض حکومتوں نے بھی دست تعاون بڑھایا اور دنیا کو خطرہ لاحق ہو گیا کہ حماس حکومت کامیاب ہو سکتی ہے۔ مسلمان ملکوں کے بینکوں پر پابندی عائد کر دی گئی کہ کوئی بینک فلسطین حکومت کے اکاؤنٹ میں ایک پیسہ بھی منتقل نہ کرے۔ کئی بینکوں نے منتخب فلسطینی حکومت کے لیے جمع شدہ رقوم ضبط کرنے کا اعلان کر دیا لیکن حماس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور ذمہ داران حکومت خود مالی اعانت لے کر غزہ جانے لگے۔

غزہ کو باقی دنیا اور خود فلسطین کے دیگر مقبوضہ علاقوں سے ملانے والے راستوں کی تعداد چھے ہے۔ ان میں سے پانچ تو براہ راست اسرائیلی انتظام میں ہیں اور غزہ کو مقبوضہ فلسطینی علاقوں سے ملاتے ہیں جب کہ ایک راستہ (رفح گیٹ وے) غزہ کو مصر سے ملاتا ہے۔ وزیراعظم ہنیہ، وزیر خارجہ محمود الزہار اور دیگر کئی ذمہ داران حکومت کو رفح کے راستے جمع شدہ مالی اعانت غزہ لے جانے سے روکنے کی کوشش کی گئی، لیکن ہر بار فلسطینی مجاہدین نے باقاعدہ مزاحمت کرتے ہوئے یہ امداد اندر پہنچائی۔ یوں اس محاصرے کو چھ سال ہونے کو آئے ہیں۔ غزہ آنے جانے کے تمام راستے مکمل طور پہ بند ہیں۔ کوئی گاڑی، کوئی سواری، کوئی شخص غزہ آ سکتا ہے، نہ وہاں سے جا سکتا ہے۔ اس مکمل بندش سے زندگی معطل ہو کر رہ گئی۔ ایندھن، پانی، ادویات، سامان خورد و نوش فلسطینی مقبوضہ علاقوں سے آتا تھا، وہ بند ہو گیا۔ غزہ سے کچھ سامان تجارت خصوصاً فرنیچر ملبوسات اور زیتون کی مصنوعات باہر جاتی تھیں وہ بند، غزہ میں موجود 18 ہزار سرکاری ملازمین کی تنخواہیں بند۔ غزہ سے لاکھوں افراد روزانہ محنت مزدوری کے لیے مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں جاتے تھے، ان کے جانے پر پابندی عائد ہوگئی۔ غزہ میں علاج کی سہولت محدود ہونے کے باعث سنگین امراض کے شکار افراد علاج کے لیے رفح کے راستے مصر لے جائے جاتے تھے۔ شروع کے سات ماہ میں کئی افراد کو انتہائی مجبوری کے عالم میں مصر لے جانے کی کوشش کی گئی لیکن انھیں کئی کئی روز راستے ہی میں روکے رکھا گیا جس کی وجہ سے 82 افراد راستے ہی میں دم توڑ گئے۔ کئی مریض ایسے تھے کہ حصار سے پہلے مصری ہسپتالوں میں داخل تھے، انھیں علاج کے بعد واپس اپنے اہل خانہ کے پاس نہیں جانے دیا گیا۔ ان میں کئی خواتین اور بچے بھی شامل ہیں۔ عالمی امداد بند، تمام بڑی راستے جزوی طور پر بند، صہیونی فوجی کارروائیوں کا وسیع پیمانے پر دوبارہ آغاز اور سب سے بڑھ کر یہ کہ الفتح تنظیم اور صدارتی افواج کے ذریعے حماس کے ساتھ باقاعدہ مڈبھیڑ کا اہتمام، آئے روز ذمہ داران قتل، مجاہدین گرفتار ہوتے، صہیونی دشمن کے ہاتھوں نہیں، اپنے ہی بھائی بندوں کے ذریعے۔ اس دوران کئی مصالحتی کوششیں ہوئیں۔ مکہ مکرمہ میں حماس اور الفتح کے درمیان کعبے کے سائے میں ایک تفصیلی معاہدہ طے پایا۔ معاہدے کی سیاہی بھی خشک نہ ہوئی تھی کہ صدارتی افواج اور الفتح کے مسلح عناصر کی جلاؤ گھیراؤ کی یہ کارروائیاں عروج پر پہنچیں تو بالآخر 14 جون 2007ء کو حماس کے جوانوں نے غزہ سے صدارتی کیمپ کے تمام دفاتر خالی کرا لیے۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر غزہ میں صرف حماس ہی کی عوامی و عسکری قوت باقی رہ گئی۔ حماس نے اعلان کیا کہ یہ صرف ایک عارضی اور انتظامی کارروائی ہے، ہم معاہدۂ مکہ کی اصل روح کے ساتھ اپنے تمام فلسطینی بھائیوں سے اشتراکِ عمل چاہتے ہیں، لیکن 14 جون کے واقعات کو بنیاد بنا کر غزہ کو مکمل گھیرے میں لے لیا گیا۔

کے باعث حقیقتاً ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ پانی، جوس، بسکٹ اور پھل ڈھونڈتے رہتے ہیں شام کو اوور ایٹنگ کر کے سو رہتے ہیں اور صبح نماز کے بعد پھر زیادہ کھانا کھا لیتے ہیں لیکن دوپہر کو کچھ نہ کھانے کے فیصلے پر قائم ہیں۔

قاہرہ واپسی کا سفر اور کھانے کا معمّہ

قاہرہ واپسی کا سفر شروع ہوا تو بھوک زوروں پر تھی۔ صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ دوپہر کا کھانا وہاں دستیاب نہیں تھا۔ سہ پہر کو چلے تو امیر سفر کو دو تین بار یاد دلا کر میں صبر شکر کر کے خاموش ہو گیا۔ ایک آدھ بار فروٹ لینے کے لیے کہا تو ڈرائیور بھی مزاجاً بزرگ نکلا۔ ضدی آدمی نے اپنی مرضی کی اور بریک لگائے بغیر چلتا رہا۔ دو گھنٹے کے بعد تب بریک لگی جب نہر سویز پہ گاڑیوں کی لمبی لائن نے رکنے پر مجبور کیا۔ وہاں ٹول کے علاوہ فوجی چیکنگ بھی ہو رہی تھی۔

مجھے الشر حیرت ہوتی ہے کہ یہ فوجی یا جلہ جلہ جسمانی تلاشی لینے والے سپاہی اور اہل کار آخر چیک کیا کرتے ہیں۔ فوجی بالکل ہی بچہ سا تھا۔ صرف وردی پہن کر تو فوجی نہیں بنا جا سکتا۔ قد کاٹھ، تربیت، مزاج سبھی درکار ہوتا ہے، ایک فوجی بننے اور لگنے میں۔

نہر سویز کے پل پر پرفیوم والے سے ملاقات

نہر کا پل عبور کرنے سے پہلے لمبی قطار میں باری کا انتظار لمبا ہو رہا تھا، جب ایک پرفیوم والا آ گیا۔ اس نے پرفیوم "Boss" دکھایا کہ Made in France ہے۔ پھر دوسرا پرفیوم دکھایا Made in Korea، سامنے پورٹ سعید شہر نظر آ رہا تھا۔ بٹ صاحب کی خوش گمانی تھی کہ سمگل ہو کر آیا ہو گا، ٹھیک ہی ہو گا۔ قیمت اس نے 200 پاؤنڈ بتائی۔ جو کم ہوتے ہوتے ڈیڑھ سو پاؤنڈ ہو گئی۔ میں نے پھر بھی انکار کر دیا۔ اس نے گود میں ڈال دیئے۔ میں نے اٹھا کر واپس کیے مگر

محصوری اور تاریکی کے تین بدترین دن

20 جنوری 2008ء محاصرے کی ہلاکت خیزیوں کے عروج کا دن تھا۔ غزہ کی 15 لاکھ آبادی بجلی کے حصول کے لیے مقبوضہ فلسطینی علاقوں اور مصر سے آنے والی سپلائی کے رحم و کرم پر تھی۔ پانچ فیصد بجلی پہلے ہی بند کر دی گئی تھی۔ پانچ فیصد پر کسی نہ کسی طرح گزارا ہو رہا تھا لیکن یہ جنریٹر بھی تیل سے چلتے ہیں اور ایندھن کی سپلائی گزشتہ سات ماہ سے بند تھی۔ 20 جنوری کو پاکستانی وقت کے مطابق رات ساڑھے گیارہ اور غزہ کے وقت کے مطابق رات ساڑھے آٹھ بجے آخری جنریٹر بھی تیل نہ ملنے کی وجہ سے بند ہو گیا۔ 15 لاکھ افراد پر مشتمل آبادیاں مکمل اندھیرے میں ڈوب گئیں۔ غزہ مکمل طور پہ تاریک ہو گیا۔ صرف تاریکی ہوتی تو اسے برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن برقی رو نہ ہونے کے باعث ٹیوب ویل بند ہو گئے، پانی ناپید ہو گیا۔ ہسپتالوں میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے حساس طبی آلات نے کام چھوڑ دیا، جن مریضوں کے آپریشن ضروری تھے یا جن کے آپریشن ہو چکے تھے، موت و حیات کی کش مکش سے دوچار ہو گئے۔ ٹیلی فون ایکسچینج اور موبائل فون کی بیٹریاں ختم ہو گئیں، ذرائع ابلاغ و مواصلات معطّل، نقل و حرکت کے وسائل مفلوج، زرعی اجناس کھیت سے منڈی منتقل کرنا محال۔ اسی پر اکتفا نہیں، ساتھ ہی ساتھ اسرائیلی بم باری شروع۔ حماس کے ذمہ داران اور نوجوانوں کو چن چن کر میزائلوں کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ منتخب وزیر خارجہ محمود الزھار کا کڑیل جوان بیٹا بھی شہید کر دیا گیا (ان کا ایک بیٹا 2003ء میں اس وقت شہید ہو گیا تھا جب خود انھیں میزائلوں کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ تو محفوظ رہے ہمراہ جانے والا بیٹا شہید ہو گیا)۔ محاصرے و تاریکی کے تین روز کے اندر اندر چالیس کے قریب افراد کو شہید کر دیا گیا۔ شہداء اور زخمیوں کی جو فہرست غزہ سے جاری ہوئی ہے اس میں سے صرف تین افراد ایسے ہیں کہ جن کی عمر بالترتیب 42، 54 اور 59 سال ہے۔ باقی سب نوجوان یا بچے تھے۔

اس نے واپس نہ لیے۔ ایسا ہی ایک سین اہرام مصر پر بھی ہوا تھا جب ایک آدمی نے آ کر پوچھا پاکستانی، انڈین! پھر پوچھا مسلم! میں نے جوابی طور پر نعم یعنی ہاں کہا تو بولا "الحمدللہ، انا مسلم ایضاً" پھر اس نے کہا "ہذا ھدیہ الاخوان المسلم" اور ساتھ ہی ایک ٹی شرٹ میرے کندھے پر رکھ دی۔ میں اہرام کی تصویر بنا رہا تھا۔ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کر کے آگے بڑھا۔ ہوا چل رہی تھی وہ میرے بازو سے اپنے آپ نیچے گر گئی۔ میں نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ ایسے ہی کئی منظر لڑائی میں بدلتے میں دو تین جگہ دیکھ چکا تھا اس لیے سبق یاد تھا کہ ایسے موقعوں پر نہ 'آئی کنٹیکٹ' (Eye Contact) کرنا ہے، نہ ہاں کرنی ہے۔ پرفیوم والے نے کار کے کھلے شیشے سے منہ داخل کرنے کی کوشش کر کے پوچھا "اچھا تم کتنے دیتے ہو؟" میں نے بٹ صاحب سے مشورہ کر کے کہا پندرہ (مطلب تھا دونوں کے لیے)۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔ میں نے جیب سے 20 پاؤنڈ نکال کر اسے دکھائے، اس نے ناں کی۔ میں نے واپس جیب میں رکھ لیے اور منہ پھیر لیا۔ یوں لگا کہ وہ چلا گیا ہے کیونکہ اس کی بڑبڑاہٹ کم ہو گئی تھی۔ ہماری گاڑی آگے بڑھ رہی تھی جب اس نے آ کر وہ پرفیوم پھر میری گود میں ڈال دیا اور بولا! نکالو۔ میں نے بیس پاؤنڈ دے دیئے۔ بٹ صاحب کا قہقہہ گونجا، "دو چار اور لے لیں، قیمت ٹھیک ہے۔ اس کو زیادہ بچت نہیں ہوئی۔" میرا دل تو چاہا مگر ساتھ ہی خوف لاحق ہوا کہ جس طرح ہمارے ہاں لاہور کے شاہ عالمی بازار میں لوٹے بھر بھر کے پرفیوم بیچتے ہیں، وہاں ہر برانڈ اور ماڈل کے ڈرم بھرے رکھے ہوتے ہیں۔ پیکنگ بھی مرضی کی کر کے دیتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں پتا چلے کہ نہر سویز کے قریب ایسی ہی دو نمبر پیداوار کا پلانٹ لگا ہوا ہے تو کیا کر لیں گے۔ مصر میں اس طرح کے واقعات عام ہیں۔

سیکڑوں خواتین نے آہنی دیوار مسمار کر دی

15 لاکھ انسانوں کو پوری دنیا کے سامنے روزانہ موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ فلسطینی تھے، اپنے نبی ﷺ کے قبلۂ اول اور مقام اسراء و معراج پر صہیونی قبضہ تسلیم کرنے سے انکاری تھے۔ لاکھوں افراد کے سامنے جب کوئی راستہ نہ بچا تو 22 جنوری 2008ء کی شام سیکڑوں خواتین رفح کے سرحدی پھاٹک پر جمع ہو گئیں، انھوں نے زبردستی پھاٹک کھولنے کی کوشش کی لیکن مصری انتظامیہ نے ان پر آنسو گیس اور گولیاں چلا دیں۔ اگلے روز، یعنی 23 جنوری کو ہزاروں کی تعداد میں فلسطینی نوجوان اکٹھے ہوئے اور انھوں نے بلڈوزر کے ذریعے غزہ اور مصر کے مابین حائل جنگلے اور آہنی دیوار مسمار کر دی۔ پھر وہاں سے لاکھوں فلسطینیوں کے قافلے مصری شہر عریش اور رفح کی جانب چل دیے۔ سب کا ہدف صرف یہ تھا کہ تیل، کھانے پینے کا سامان لالٹینیں، موم بتیاں خرید کر واپس جا سکیں۔ جب اتنی بڑی تعداد کو روکنا مصر کے لیے ممکن نہ رہا تو صدر حسنی مبارک نے اعلان کیا کہ ہم نے سرحد کھول دی ہے، فلسطینی سامان خورد و نوش خریدنے کے لیے آ سکتے ہیں۔ مصری دکان دار اور تاجر ایک انوکھی سرشاری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ معمول سے بھی کم قیمت پر جو کچھ ہے اپنے محصور بھائیوں کو پیش کر دیتے، بعض اوقات قیمت خرید سے بھی کم پر۔

ایک طرف 15 لاکھ انسانی جانیں موت کی دہلیز پر کھڑی ہیں اور دوسری جانب سرحدی دیوار روند دیے جانے پر امریکا بہادر نے خبردار کیا کہ یہاں سے دہشت گرد اسلحہ اور مجاہدین غزہ جا سکتے ہیں۔ اسرائیل نے بھی دھمکی دی کہ مصر یہ راستہ بند کر دے وگرنہ براہ راست کارروائی کریں گے اور مصر نے آمنّا و صدقنا کہتے ہوئے یہ سرحدی شگاف بند کر دیا۔ غزہ سے کسی کو مصر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ مصر کی طرف آئے ہوئے فلسطینی واپس غزہ کی سب سے بڑی انسانی جیل میں جا سکتے تھے۔ یہ پابندی قائم رہی یہاں تک کہ مصر میں انقلاب آ گیا اور مرسی نئے صدر بن گئے۔

پورٹ سعید رکنے کی خواہش

پورٹ سعید پر رکنے کی خواہش پر برادر الردعی نے روانگی سے قبل ہی شدت سے جانے، رکنے اور کھانے کی تلاش سے منع کر دیا تھا کہ وہاں حالات بہت تپے ہوئے ہیں، وہ ان دنوں قاہرہ کے لوگوں کے سخت خلاف ہیں۔ وہاں نہ جائیے گا۔ العریش اور صحرائے سینا سے اندھیرا پھیلنے سے پہلے نکل جانے کے اصرار کے بعد رکنے کا واحد آپشن اسماعیلیہ تھا۔ پورٹ سعید سے اسماعیلیہ تک 20 کلومیٹر تک آموں کے مسلسل باغات تھے۔ فرق یہ تھا کہ آم جہاں ہمارے ہاں کھلی قطاروں میں کاشت کیے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں چار چار کی قطار میں پودے لگے تھے۔ بالکل ساتھ جڑے ہوئے، پتے آپس میں اتنے گھل مل گئے ہوئے تھے کہ روشنی بھی زمین پر نہیں آ رہی تھی۔ گندم بونے کا طریقہ بھی نرالا تھا۔ بڑی بڑی کھالیاں اور بیچ میں اونچی کیاریاں جن میں گندم کاشت کی گئی تھی۔ کینو کم نظر آئے البتہ کیلا اور کھجور دونوں خوب موجود تھے۔

اسماعیلیہ کی پہلی حیرت

کھانے کی تلاش میں اسماعیلیہ کے شہر کے اندر داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ ان کی ٹیکسیاں قاہرہ کی سفید دانے دار ڈیزائن کی ٹیکسیوں کے بجائے ایک دم مختلف تھیں۔ orange کلر اور ایک سفید پٹی کے ساتھ۔ ڈرائیور نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مین بازار کا رخ کیا۔ وہاں جس ہوٹل پر اترے وہ کلو کے حساب سے کباب دے رہا تھا۔ کباب، تکہ کے علاوہ ہانڈی گوشت جو سبزی آلو کے ساتھ پکا ہوا تھا، بہت ہی پھیکا اور بدمزہ تھا۔ حمص والی ڈش بھی کافی پھیکی تھی مگر ہم نے وہ پہلے ہی کھالی۔ ڈرائیور کو بھی ساتھ کھلایا۔ اس کے

الشیخ صیام سے لاہور میں یادگار ملاقات

''شکر ہے اسماعیل حانیا نے دوران طالب علمی مجھ سے مار نہیں کھائی۔ بڑا ہی مدبر، دھیمے مزاج کا صالح نوجوان ہے۔'' فلسطین کے موجودہ وزیراعظم کے بارے میں یہ بات کرنے والے کوئی اور نہیں، دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں چاندی کی انگشتری پہنے، کانفرنس روم میں تیسری نشست پر بیٹھے، بڑھاپے میں بھی نوجوانوں کے سے جذبات سے معمور فلسطینی استاد الشیخ محمد صیام تھے، جوان دنوں یمن یونیورسٹی میں استاد ہیں۔

پروفیسر نصیر الدین ہمایوں کے صاحبزادے حسان نے اگر مجھے چند سال پہلے بار بار فون کر کے 5 ذیلدار پارک بلایا اور یاد نہ دلایا ہوتا تو اس قابل قدر مہمان سے ملاقات اور اس کی دلچسپ باتوں سے محروم رہ جاتا۔ ''فلسطین کی نئی منتخب پارلیمنٹ میں حماس کے 76 اراکین میں سے اکثریت نوجوانوں کی ہے اور ایک بڑی تعداد میں خواتین رکن پارلیمنٹ منتخب ہوئی ہیں۔ بادھو رہ کر خدمت کا کام کرنے والے ان نوجوانوں کی محبت اللہ نے لوگوں کے دلوں میں یوں ڈال دی کہ وہ دوران الیکشن دھمکیاں سنتے رہے اور یہ جانتے بوجھتے بھی حماس کا ساتھ دیتے رہے کہ ان کے انتخاب کے بعد دنیا فلسطین پر اور بھی نامہربان ہو جائے گی مگر وہ ڈرے نہ سہمے، بس اللہ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا تو اس کی نصرت ان کے شامل حال ہو گئی۔ شیخ الصیام نہ صرف غزہ کی اسلامی یونیورسٹی میں استاد رہے بلکہ بیروت اور سوڈان میں بھی اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم دیتے رہے۔ مسجد الاقصیٰ میں امامت کا منصب بھی انہیں حاصل رہا۔ حماس کی نئی قیادت میں خالد مشعل ہوں یا اسماعیل حانیا، انہی کے ہاتھوں پلے بڑھے اور قیادت کی نزاکتوں سے باخبر ہوئے۔ یہی وہ موقع تھا جب پہلی بار غزہ جانے اور غزہ والوں سے ملنے کی خواہش جاگی تھی۔

سے الگ آرڈر دے دیا مگر اس نے باہر جا کر اپنے لیے بھی خاص مرغ پیس کوئلوں پر تیار کرایا۔ بٹ صاحب نے برسوں پہلے بوتل پینے سے اپنے آپ کو بے نیاز کر چکے تھے۔ وہ بالکل نہیں پیتے۔ ہمیں ایسی کوئی مجبوری نہ تھی۔ کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو چائے کی طلب ہوئی۔ وہ وہاں تھی نہیں۔ اب واپسی کا ارادہ تھا۔ شہر کے بیچوں بیچ اسماعیل خدیوی کا بڑا سا سٹیچو (Statue) ایستادہ تھا، گھوڑے پر براجمان۔ اس وقت تو سمجھ نہیں آئی کون صاحب ہیں، بعد میں پتا چلا کہ یہ صاحب مصر کے (1863-1879) حکمران رہے۔ یہ شہر بھی انھوں نے بسایا تھا۔ نماز مغرب کے لیے ایک مسجد میں اترے۔ وہاں ایک سبزی والا بہت سلیقے سے سبزی سجائے ہوئے تھا۔ پک اپ سے سبزی اتار کر مزید سجا رہا تھا۔ تصویر لینے لگا تو وہ فٹافٹ سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر دو لوگ ہو گئے۔ تصویر اچھی بنی اور ان کو بھی دکھائی۔ خوش ہوئے پاکستان کا سن کر اور خوش ہوئے، اہلاً وسہلاً والا جملہ سب کو خوب آتا ہے۔ مسجد زیر تعمیر تھی۔ نماز کے لیے کھلی نہیں تھی۔ واپس گاڑی میں آ کر بیٹھے تو میں نے کہا کہ گاڑی میں پڑھ لیں۔ پروفیسر صاحب نے ناراضی سے کہا ''قیام کے بغیر نماز نہیں ہوتی''، ''کیوں نہیں ہوتی؟'' میں نے احترام سے اختلاف کیا۔ ''بس میں، ریل میں، جہاز میں، حتیٰ کہ اونٹ کی پیٹھ پر ہو جاتی ہے۔'' وہ نہیں مانے، میں نے نماز لیٹ ہوتے دیکھ کر سیٹ پر بیٹھے بیٹھے نیت باندھ لی۔ کچھ دیر بعد ایک اور مسجد کے قریب انھوں نے گاڑی رکوائی۔ میں تب آخری رکعت میں تھا۔ آرام سے فارغ ہوا۔ سامنے گلی میں لائٹیں سجی تھیں۔ ہوا بھرے ہوئے دو بڑے بڑے Statues تھے۔ ایک گرا ہوا تھا۔ دو بچے اسے دھکیل کر کھڑا کر رہے تھے۔ اور وہ ان کی تھوڑی سی بات مان کر دوبارہ لڑھک جاتا۔ بالآخر اسے الگ الگ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ دونوں کے بیچ میں گلی کا راستہ بھی نکل آیا کچھ ہی دیر بعد اندر سے ڈیک پر تیز تیز گانوں کی آوازیں آنے لگیں۔ گلی لائٹوں سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ شادی کی تقریب تھی اور کوئی دم جاتا تھا جب وہاں کسی میوزک گروپ کی پرفارمنس شروع ہونے والی تھی جب یہ لوگ واپس آ گئے تو ہم دوبارہ سے اسماعیلیہ کے گلی کوچوں میں سے ہوتے ہوئے قاہرہ کی مرکزی شاہراہ پر روانہ ہو گئے۔ یہ وہی شہر اور جگہ ہے جہاں سے اخوان المسلمون کا آغاز ہوا۔ یہیں مرشد عام حسن البنا نے اسکول پڑھاتے پڑھاتے پہلی تنظیم قائم کی اور لوگوں کے ذہن بدلنے شروع کیے۔ لوگوں کی محبتیں سمیٹیں اور سازشوں کا مقابلہ کیا۔ وہ بے حد سادہ مگر اپنے مشن کے لیے فنا ہونے والے شخص تھے۔ اپنے سیکرٹری کے ساتھ ایک بار کسی پڑھے لکھے زمیندار کے گھر ملنے گئے تو اس نے آپ کی دعوت سن کر اتفاق کیا مگر بولا مجھ میں ایک خرابی ہے۔ شراب پیتا ہوں اس لیے آپ کی تنظیم میں نہیں آ سکتا۔ امام نے کہا کہ آجائیے ہم شامل کر لیں گے، وہ چائے لینے اندر گیا تو سیکرٹری صاحب نے امام سے اختلاف کیا اور دلیل دی ''لوگ کیا کہیں گے۔'' حسن البنا کی دلیل یہ تھی کہ

امام حسن البناء

''صالح فطرت آدمی برے لوگوں میں رہے گا تو برا ہی رہے گا۔ آپ میں شامل ہو گا تو آپ جیسا بن جائے گا۔ یہ تو خطرہ نہیں ہے ناں کہ آپ لوگوں کو شراب پہ لگا دے گا۔ مریض کو ڈاکٹر نہیں دیکھے گا تو کون ٹھیک کرے گا اسے اس لیے چھوڑ دیں کہ شراب پیتا ہے۔'' وہ رئیس آنے والے برسوں میں اخوان المسلمون کا بہت بڑا سرمایہ بنا۔ اسے امام کی گفتگو اور دلائل کی سادگی نے موہ لیا تھا۔ آج مصر کو اسی حسن البنا سے محبت کرنے والوں نے موہ لیا ہے۔

اسماعیلیہ میں گورا قبرستان

اسماعیلیہ کے مین چوک میں فروٹ منڈی تھی گرجے کے بعد۔ گرجا بھی بہت بڑا تھا اور ساتھ قبرستان تھا۔ مسلمانوں کا قبرستان بھی ساتھ تھا۔ یہ گورا قبرستان کا لفظ بھی خوب ہے۔ پاکستان کے ''نامور گورنر جنرل'' غلام محمد خدا جانے اپنی خواہش پر یا اپنی عادتوں کی وجہ سے کراچی کے گورا قبرستان میں مدفون ہیں۔ ممکن ہے ان کی خوبصورت جرمن سیکرٹری مس روتھ نے انھیں اس حال کو پہنچایا ہو۔ یقیناً مسلمان گورنر جنرل کو عیسائیوں کے قبرستان میں دفنانے کا فیصلہ کچھ سوچ سمجھ کر ہی اتنے بڑے پیمانے پر کیا گیا ہو گا۔

رات گئے ہوٹل پہنچے

دوبارہ سے قاہرہ المعادی ہوٹل پہنچے۔ نئے سرے سے فارم پُر کیے۔ رات کے ابتدائی پہر فرنٹ ڈیسک پر محمد رمادان تو نہیں تھا البتہ ایک سانولا سا مودب آدمی موجود تھا۔ اس کی آواز اچھی براڈ کاسٹروں والی تھی۔ طے ہوا اب کے دو دو لوگ اکٹھے رہیں۔ 501 میں بٹ صاحب کے ساتھ۔ ویسے قرعہ عمران صاحب کے ساتھ آرہا تھا مگر ٹی وی دیکھنے اور دیر تک لکھنے کے مسائل کے پیش نظر بٹ صاحب مفید روم میٹ ثابت ہو سکتے تھے۔

کمرے میں بستر بہت عمدہ کلر کے تھے البتہ فروٹ یا بسکٹ جو کمپلیمنٹری (اعزازی، تحفتاً) ہوتی ہے، نہیں تھی۔ اگلے روز انھیں یاد کرایا۔ باتھ روم بھی صاف ستھرا تھا مگر اس میں کموڈ پانی کی دھار والا نہیں تھا، مسلم شاور والا تھا۔ ڈاکٹر عمران صحاف پاکستان میں آئی سرجن کی تنظیم کے صدر بھی ہیں اور بہت ماہر سرجن مانے جاتے ہیں۔ نجی گفتگو میں بہت ہی دلچسپ شخصیت، تبلیغی پس منظر کے باوجود خدمت خلق کے جذبے نے انھیں ایک عمدہ ہم سفر بنا دیا۔ ان کے پاس واقعات اور لطائف کی ایک زنبیل تھی جو مسلسل کھلتی، بڑھتی رہتی۔

اس بار کرایہ 95 ڈالر فی کمرہ تھا۔ پہلے 125 ڈالر فی یوم ادا کیا گیا تھا۔ 4 اسٹار ہوٹل میں ہر فلور پر 14 کمرے، کل 15 فلور ہیں۔ حیرت ہوئی کہ 13 واں فلور غائب ہے۔ گنتی میں سرے سے 13 واں نمبر ہی نہیں تھا۔

غزہ - شہیدوں کی سرزمین کا سفر

ٹھیک تین دن بعد صبح چار بجے ہم نے المعادی ہوٹل چھوڑ دیا۔ صحرائے سینا ایک بار پھر ہمیں بلا رہا تھا اور ہم خدشوں، وسوسوں، بے یقینی کو گٹھڑیوں میں باندھے پھر اسی کار پر رفح بارڈر کے لیے رواں دواں تھے۔

غزہ، شہیدوں کی سرزمین پر پہلا قدم رکھنے میں ابھی مصر کا بارڈر، مصری انٹیلی جنس اور امیگریشن کی تہہ در تہہ رکاوٹیں حائل تھیں۔ دلوں میں امید بے شک زیادہ تھی مگر تین دن کی دوری نے نا اُمیدی کے بہت سے در بھی

کھول رکھے تھے۔

ٹنل بھی آزمایا جا سکتا ہے

انتظار بٹ صاحب خوب آدمی ہیں۔ انھوں نے ہونا سیکھا ہی نہیں۔ جب ہم واپس قاہرہ جا رہے تو کئی مصری ڈاکٹروں کے فون آئے کہ آپ لوگ پہنچ گئے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ''واپس آرہے الحمد للہ! پوری کوشش کی ہے۔ مگر کوئی کمی رہ گئی ہے اللہ کی مرضی۔ ہم لوگ تو پورے اخلاص سے تھے۔'' مشورہ ملا کہ اگر اب کے پھر رکاوٹ ہو تو نہ کیجیے کہ بارڈر سے ہی غزہ نہیں جایا جا سکتا ہے۔ راستہ اور بھی ہے، اسے آزما کے دیکھیے۔ یہ حیران کن راستہ برسرِ زمین نہیں زیرِ زمین تھا۔ اسے ٹنل کہا جاتا ہے۔ بعض ٹنلز تو ایک ایک کلومیٹر لمبی ہیں۔ مجھے اشتیاق ہوا کہ جانا تو جائے یہ ٹنل سروس ہے کیا؟ اور بغیر اجازت کے کیسے غزہ لے جاتی ہے۔

ٹنلز۔ دنیا کی انوکھی سروس کے کمالات

جن دنوں اسرائیل نے غزہ کا طویل ترین محاصرہ کیا ہوا تھا۔ وہاں کھانے پینے کی اشیا ناپید ہو چکی تھیں۔ سبزیاں، دالیں ڈھونڈنے سے نہ ملتی تھیں۔ پٹرول کی سپلائی اور سٹاک ختم ہو چکا تھا۔ 95 فیصد بجلی اسرائیل سے آتی تھی وہ بھی بند کر دی گئی تھی اور 5 فیصد مصر سے آتی تھی اس کی سپلائی بھی معطل تھی۔ انہی دنوں غزہ کے جیالوں نے جینے کی نئی راہ ڈھونڈ نکالی۔ انھوں نے سرحدی علاقوں میں سرنگیں کھودنی شروع کیں۔ کسی گھر میں کنواں کھودتے اور بیس فٹ گہرائی میں جا کر بارڈر کی طرف رخ کر کے کھدائی شروع کرتے اور بارڈر پار کسی ایک گھر کے صحن یا کمرے تک پہنچا دیتے۔ وہاں کنواں کھودا جاتا..... پہلی کامیابی نے امید کے کئی دیے روشن کر دیئے اور ہوتے ہوتے عالم یہ ہو گیا کہ اردن اور مصر دونوں طرف خفیہ ٹنلز کی بہار آ گئی۔ 700 ٹنلز تو گنی جا چکی ہیں پھر غزہ میں ٹنلز سنبھالنے کا باقاعدہ محکمہ وجود میں آ گیا۔

ٹنل میں کیسے کام ہوتا ہے

پہلے پہل تو رسی سے باندھ کر سامان دوسری طرف کھینچ لیا جاتا تھا پھر ترقی ہوئی تو اس کے ساتھ موٹر لگا دی گئی۔ موٹر چلتی اور سامان کا کنٹینر یا باکس دوسری طرف روانہ ہو جاتا۔

تیسرے مرحلے میں ٹنل کو کھلا کیا گیا۔ دونوں دیواروں کے ساتھ لکڑی کی دیواریں بنائی گئی۔ چھت پر بھی لکڑی کے سہارے دیئے گئے۔ سیمنٹ اور تعمیراتی سامان کا تو تقریباً قحط تھا۔ 4 ڈالر کی ایک بوری سیمنٹ 400 ڈالر میں بھی دستیاب نہ تھی۔ ریتلی زمین کے باعث قبروں کو ہر صورت میں سیمنٹ سے ہی بند کرنا پڑتا ہے۔ اسرائیلی بمباری کی شدت بڑھی تو اس نے غزہ کی اکلوتی سڑک اڑا دی، چھوٹی سی واحد بندرگاہ تباہ کر دی۔ ہر تھانہ، سرکاری عمارت یہاں تک کہ ہسپتال تک کو نہ چھوڑا۔ اس تباہ کاری کے فوری مقابلے کے لیے بھی ریت، بجری، سیمنٹ تو چاہیے تھا۔ ادھر تب کے مصری صدر حسنی مبارک کی چونکہ اسرائیل کے ساتھ بہت زیادہ

ایک ٹنل / سرنگ کا منظر

ہم آہنگی تھی، مصر نے نہ صرف رفح بارڈر بند کر دیا بلکہ سرکار کی طرف سے کہیں کہیں تو ٹنلز میں گیس چھوڑ دی گئی اور کہیں پانی، اس سے بے شمار لوگ سرنگوں کے بیٹھ جانے سے زندگی کی بازی ہار گئے مگر غزہ کے لوگ ہی کیا جو ہار مان لیں۔ ان سرنگوں سے اب بھیڑ بکریوں کے علاوہ تعمیراتی سامان اور کھانے پینے کا سامان آنے جانے لگا۔ چنگ جی وہاں بھی جا پہنچے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ چنگ چی صرف باربرداری کے کام آتے ہیں۔ سواریاں بٹھانے کے نہیں، ٹنلز نے جہاں بحیثیت ایک متبادل تجارتی روٹ کے اپنی اہمیت منوائی وہاں عام لوگوں کے لیے زندگی کی آسانی کا باعث بنا۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ غزہ کے فلسطینی سائنس دانوں نے جو میزائل M-75 تیار کیا ہے اور جس نے 2012ء کی جنگ رکوانے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ قصام کے فوجیوں نے اسے تل ابیب کے نواحی علاقے میں فائر کیا اور پیغام دیا کہ اگلا حملہ ہوا تو یہ میزائل تل ابیب پہ گرے گا۔ تب سے اسرائیلی فضائی حملے بند ہیں۔ وہ جنگ بھی اسرائیل نے خود رکوائی۔ اس میزائل کے بننے میں ٹنلز کا گہرا کردار محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ برسرِ زمین تو ہر چیز حتیٰ کہ انسان بھی اسرائیلی نگاہ میں ہوتے ہیں۔

ہمیں ایک اعلیٰ سطحی افسر نے کہا کہ اگر آپ کو بارڈر سے آنے کی اجازت نہیں ملتی تو ہم آپ کو آج ٹنلز سے لے جائیں گے۔ ہمارے دونوں بزرگ اٹک گئے کہ وہاں سے چلے تو جائیں گے واپس کیسے آئیں گے؟ عرض کیا حضور جو لے کر جائیں گے وہی چھوڑ بھی جائیں گے۔ ان کا سوال اسی طرح قائم تھا اور جو حکومت مصر نے واپس قبول نہ کیا تو.....؟ اب اس کا کیا جواب دیتے کہ حکومت مصر اور غزہ میں مستقل قیام کا پروگرام تو اس منظر میں کہیں تھا ہی نہیں۔

مرسی حکومت کی خصوصی مہربانی

مرسی حکومت نے امت مسلمہ کا حصہ ہونے کا حق یوں ادا کیا کہ عام فلسطینیوں کے لیے بارڈر کھول دیا۔ تعمیراتی سامان اور اشیا خوردونوش کی بھی ممانعت نہ رہی۔ غزہ اخوان کا اپنا ایشو ہے۔ حسنی مبارک کے عہد میں بہت سے اخوان نے غزہ کے ایشو پہ حکومتی پالیسی کے خلاف مظاہرے کرنے پر لمبی مدت جیلوں میں گزاری۔ مرسی کے بارے میں لوگ سچ کہتے ہیں کہ اس نے بڑی ذہانت سے اپنے دشمنوں کو فوکس کیا اور دھیرے دھیرے ان سے نمٹ رہا ہے مگر جو فوری قومی یا ملی مسائل تھے ان کو فوری طور پر ایڈریس کیا۔ اس نے آج تک اسرائیل کے کسی پیغام کا جواب دیا نہ اس کے نمایندوں کو ملنے کا وقت دیا۔ حکومتی پالیسی کا اثر یہ ہوا ہے کہ قاہرہ میں اسرائیلی سفارت خانے کو کوئی شخص اپنا گھر یا بلڈنگ تک کرائے پر دینے کو تیار نہیں۔ مجبوراً اسرائیلی ڈپلومیٹ ہوٹلوں میں مقیم ہیں۔

فلسطینی بارڈر پہ استقبال

ہم السلطنیہ الوطنیہ الفالسیطنہ میں داخل ہوئے تو توقع تھی کہ اجڑے ہوئے در و بام ہوں گے۔ کملائے ہوئے لوگ اور سہمے ہوئے بچے، خدا جانے حکومت اور نظام کیسے چلتا ہو گا۔ ایک صاف ستھرے باوردی ڈرائیور نے مصری حدود میں آ کر ہمارا سامان گاڑی میں رکھا۔ مسکراتے چہرے کے ساتھ ہمیں گاڑی میں بٹھایا اور چند لمحوں کے بعد ہم وی آئی پی لاؤنج کے دروازے پر تھے۔ پورے سفر میں یہ پہلا لمحہ تھا جب ہمیں اپنے سامان کو اتارنے اور سنبھالنے کی فکر نہیں ہوئی۔ لاؤنج میں بیٹھتے ہی قہوہ سرو کیا گیا۔ اتنی دیر بعد اوہام ال بتنا

ان کی ٹیم ہم تک پہنچ گئی۔ انھیں سرکاری طور پر وکول ڈیوٹی کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ فلسطینی نڈے کے دو اطراف رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئے دوسری کرسی کے لیے ہم نے ڈاکٹر انتظار ب صاحب کو بھجوایا۔ کم عمری کے باعث وہ کبھی کبھی سادہ اور سفری کپڑوں کو دیکھ رہے تھے جو بالکل سرکاری مہمانوں جیسے نہیں تھے۔ بٹ صاحب نے بھی اپنی نومولود عربی کا بھرپور مظاہرہ کیا اور پانچ منٹ کی وہ پوری تقریر کر دی جس کا آغاز یہاں سے ہوتا تھا۔ ''نحن اطبا العیون من الباکستان۔''

رفح وی آئی پی لاونج میں

شرما بھی جاتے ہیں۔ اوہام صاحب نے اہلاً وسہلاً مرحبا کہنے کے بعد کہا ''آپ کا دورہ ایک مشکل وقت میں ہو رہا ہے۔ ہمیں آپ کی مشکلات کا بھی احساس ہے۔ اہل فلسطین آپ کے دورے کو بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہم کئی روز سے آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں، تین روز قبل جب آپ کے وفد نے آنا تھا تو جناب وزیراعظم اسماعیل ھنیا کے ساتھ ملاقات بھی طے تھی۔ انھوں نے ایک سرکاری تقریب میں آپ کے وفد کو خوش آمدید کہا اور حاضرین کو بتایا کہ ''برادر اسلامی ملک پاکستان سے ہمارے تین ڈاکٹر اور ایک صحافی بھائی آرہے ہیں۔ یہ پہلا وفد ہے جو وہاں سے غزہ پہنچے گا۔ اللہ اللہ! آپ آگئے ہیں۔ اہلاً وسہلاً مرحبا۔'' تصاویر لی جارہی تھیں۔ ویڈیو بن رہی تھی اور ہم سارے اپنے

اس رسمی تقریب کے بعد قہوہ دوبارہ آ گیا۔ پاسپورٹ ہم سے لے کر پاسپورٹ آفس بھجوا دیئے گئے۔ عمران صحاف صاحب نے فرمائش کی کہ ''میرے پاسپورٹ پہ انٹری نہ لگائی جائے۔ امریکا وغیرہ جانا ہوتا ہے، وہاں مسئلہ ہو جائے گا۔'' ہمیں ویسا کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ اس لیے خوشی خوشی مہر لگانے کی اجازت دے دی۔ عمران صاحب کے پاسپورٹ کی بجائے ایک کارڈ پر مہر لگا کر واپس کر دیا گیا۔ وی آئی پی قسم کے مراحل طے ہو گئے تو ایک ہائی روف وین آ گئی۔ سامان پہلے سے رکھا جا چکا تھا۔ گاڑی روانہ ہوئی تو ہم سب کی آنکھوں کی چمک دیکھنے والی تھی۔ دل کی خوشی، اطمینان اور ایک لحاظ سے فخر کے احساس نے زبانوں کو شکر کے الفاظ کی ادائی میں مصروف کر دیا۔

سچی بات یہ ہے کہ غزہ میں آنے تک ہم اس کے محل وقوع، لوگوں، آبادی، کلچر، ماحول، آسانیاں، مشکلیں، غرض کسی بارے میں واضح نہیں تھے۔ جو جو باتیں سن رکھی تھیں، سنی سنائی ایسی ادھوری معلومات تھیں۔ وہ بیچارے ہاتھی کے جسم کے مختلف حصوں کے بارے میں کوئی واضح تصویر بنانے میں مددگار بھی نہیں تھیں۔

''کیسا خوب صورت، خوشگوار اور خوش کن لمحہ ہے۔'' میں نے عمران صاحب سے کہا۔ وہ پورے وجود کے ساتھ ایک ایک منظر کی ویڈیو بنا رہے تھے۔ ''ہم فسلطین کے آزاد حصے غزہ کی مرکزی سڑک پر پوری آزادی کے ساتھ رواں دواں ہیں، یہ یقین کرنے میں تھوڑا وقت اور لگے گا۔'' انھوں نے جواب دیا۔

ٹنل فارمنگ نے حیران کر دیا

کھجوروں کے جھنڈ، زیتون کے باغات، کچے پکے مکانات اور حیرت میں مبتلا کرنے والی جگہ جگہ بنی ہوئی ٹنل فارمنگ۔ اس میں بھی غزہ کے لوگوں نے دو قدم آگے بڑھ کر کام کیا ہوا تھا۔ ٹنل فارمنگ میں پلاسٹک شیٹ کو راؤنڈ کر کے نصف دائرے کی شکل میں ٹہنیوں کی مدد سے زمین کے ساتھ دبایا جاتا تھا۔ یہاں قریباً ہر جگہ فارمنگ کے مستقل سٹیل راڈز لگے تھے اور جگہ جگہ انھیں پلاسٹک کی بجائے کالے کپڑے سے ڈھانپا گیا تھا۔ ٹنل فارمنگ کا تصور خود پاکستان میں زیادہ پرانا نہیں ہے۔ بے موسم کی سبزیوں کی کامیاب کاشتکاری میں یہ طریقہ بے حد موزوں رہتا ہے۔

آدھ ایک گھنٹے بعد ایک بڑا قصبہ آیا۔ اس کا نام خان یونس تھا۔ یہاں سے گزرتے ہوئے سرکاری اور پرائیویٹ اقصیٰ یونیورسٹی کی خوب صورت عمارت پر نظر پڑی۔ بڑا سا سرکاری ہسپتال بھی راہ میں تھا۔ ابھی اسی پہ حیران ہو رہے تھے کہ اچانک سڑک پانی کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ یہ کیا، یہ کہاں سے آ گیا؟ پتا چلا یہ بحیرہ روم ہے جو غزہ کی پوری پٹی کے ساتھ ساتھ بہتا ہے۔ 2010ء میں اسی بحیرہ روم میں ترکی کے جہاز فریڈم فلوٹیلا نے آنے کی کوشش کی تھی جس میں ہمارے نامور صحافی اور اینکر طلعت حسین بھی تھے۔ یہ جہاز ترکی سے ادویات اور خوراک لے کر غزہ آ رہا تھا کہ اسرائیلی فوجیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ قبضہ کر کے نہ صرف سب مسافروں کو گرفتار کر لیا بلکہ ان پر تشدد بھی کیا اور جہاز کو شدید نقصان پہنچایا۔

اس سڑک پر کبھی اسرائیلی فوجی چوکیاں ہوا کرتی تھیں۔ غزہ سے پہلے ایک چوکی پر رکتے ہوئے میزبان نے بتایا۔ ''یہاں اسرائیلی قبضے کے دوران 8 سے 9 گھنٹے تک لوگ کھڑے رہتے اور اسرائیلی فوجی ان کو گزرنے نہ دیتے۔ چیک ہی نہ کرتے واپس بھجوا دیتے۔ یہ ان کے فلسطینی مسلمانوں کو اذیت دینے اور بے وقعت کرنے کے انداز تھے۔''

غزہ شہر آنے والا تھا۔ جب ڈرائیور نے اچانک گاڑی روک لی۔ دائیں طرف ایک گراؤنڈ میں ایک ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ بتایا گیا، یہ فلسطینی حکومت کا واحد ہیلی کاپٹر ہے جو صدر یاسر عرفات کے زیر استعمال تھا۔ اس سے ذرا پیچھے ان کا صدارتی کمپاؤنڈ تھا جس میں وہ قید رہے۔ انتفاضہ ٹو کے بعد جب یہاں حماس لوگوں کے دلوں میں بس گئی تو یاسر عرفات سے وہ کمپاؤنڈ خالی کرا لیا گیا اور الفتح کے لوگ غزہ سے ویسٹ بینک چلے گئے اور وہاں جا کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ فلسطین اصل میں تین حصوں پر مشتمل ہے۔ یروشلم اور آس پاس کا علاقہ جس پر یہودی قابض ہے اور اسرائیل کہلاتا ہے،

یہاں سے 25 لاکھ فلسطینیوں کو نکالا گیا ہے جو بیچارے صرہ، شام، اردن، لبنان اور سعودی عرب میں پناہ گزین ئے۔ بعد میں ان کے مہاجر کیمپوں پر حملے کر کے وہ بھی تباہ کر دیئے گئے۔ بیروت کے صابرہ اور شتیلا کے کیمپوں میں جس طرح فلسطینی عورتوں اور بچوں کو مارا گیا وہ تاریخ کا المناک باب ہے۔ ایسی ہی تاریخ اردن میں بھی دہرائی گئی کہ ذکر کرتے ہوئے دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔ کسی نے سچ کہا تھا

اس شجر کے قریب مت جانا
اس میں حیرت اتار دی گئی ہے

یاسر عرفات کا ہیلی کاپٹر

ہیلی کاپٹر اسرائیلی حملے کا بری طرح شکار ہوا تھا۔ اس کے پر، انجن، باڈی ہر چیز ہی تہس نہس کر دی گئی تھی۔ ڈھانچہ محفوظ تھا۔ ہم نے پہلے دور سے اور پھر محافظوں کی اجازت سے قریب جا کر خوب تصویریں بنائیں۔ بٹ صاحب تو کاک پٹ میں جا بیٹھے۔ اتارنا مشکل ہو رہا تھا۔ بٹ صاحب اس قدر شاندار ہم سفر ثابت ہوئے کہ اظہار نہ کرنا زیادتی ہو گی۔ زندہ دل، کیئر کرنے والے، خدمت کرنے والے۔ ان کی اپنے روم میٹ اور ہم سفر سے کوئی ڈیمانڈ نہیں ہوتی۔ ھنسوڑ اتنے کہ لگتا بھی نہیں پاکستان کے اتنے مشہور آئی سرجن ہیں۔ سروسز ہسپتال، اتفاق ہسپتال اور میڈیکل کالج ہر جگہ ان کے کام اور خوش مزاجی کا ڈنکا ہے۔ مجھے تو یہی حیرت مارے جاتی تھی کہ 90 ہزار سے زائد آنکھوں کے آپریشن پچھلے 15 برسوں میں خود وہ اپنے ہاتھوں سے پاکستان اور پاکستان سے باہر کر چکے ہیں۔

غزہ شہر کیا شروع ہوا، حیرتوں نے آن لیا۔ خوب صورت گھر، اچھی صاف ستھری سڑکیں، خوش لباس، خوش اطوار لوگ، خوش شکل خواتین، سلجھے ہوئے بچے اور الٹے ہاتھ پر چلتی ہوئی ٹریفک سڑک پر تازہ مچھلی کے چھوٹے چھوٹے اسٹال بھی تھے اور پھل کی دکانیں بھی۔

گاڑی جس جگہ رکی وہاں سفید کوٹوں میں ملبوس بہت سے ڈاکٹر جمع تھے۔ سب سے پہلے جنھوں نے

یاسر عرفات کا تباہ شدہ ہیلی کاپٹر

گلے لگایا وہ ڈاکٹر کاشف تھے، ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ۔ اس دورے میں پوری کوآرڈینیشن انہی کی تھی، وہ فلسطینی وزیر صحت ڈاکٹر مفید کے دست راست کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے شستہ انگریزی میں غزہ حکومت اور وزیر صحت کی طرف سے خوش آمدید کہا۔ اس قدر بھرپور استقبال نے سارے سفر کی تھکاوٹ ہی دور کر دی۔ غزہ کے سب سے بڑے آئی ہسپتال کا دورہ کرایا گیا اور پھر کھانے کے لیے ایک اچھے سے ہوٹل لے جایا گیا۔ کھانا اس قدر عمدہ، لذیذ اور مزے دار تھا کہ گزشتہ پانچ چھ دنوں کی کسر نکل گئی۔ پتا چلا فلسطینی بھی ہماری طرح اچھی نمک مرچ مصالے والی مرغی اور سالن کھاتے ہیں۔ باربی کیو بھی بے حد عمدہ تھا۔ ڈاکٹر کاشف خود کھانے میں شریک ہوئے۔ انھوں نے وہاں دوسرے اعلیٰ حکومتی عہدے داروں اور محکمہ صحت کے افسران سے متعارف کرایا، کھانے کے بعد ہمیں ہوٹل بھجوا دیا تا کہ کچھ آرام بھی کر لیں اور سامان وغیرہ سیٹ کر لیں۔ سمندر کے کنارے واقع یہ ہوٹل بے حد خوبصورت اور صاف ستھرا تھا۔

مجھے اور بٹ صاحب کو ہوٹل کموڈور کا آخری کمرہ ملا جس کے سامنے سمندر کی لہریں اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ یہ دوسرے کمروں کی نسبت کافی فراخ تھا۔ پتا چلا کہ چند روز قبل ہی حماس کے سربراہ خالد مشعل طویل برسوں کے بعد غزہ آئے تو انھیں اسی کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ان کا بے پناہ شاندار استقبال ہوا تھا۔ وہ تین بار حماس کے سربراہ منتخب ہو چکے تھے اور چند ہفتے پہلے مصر میں ہونے والے اجلاس میں حماس کی اعلیٰ سطحی قیادت نے انھیں چوتھی بار حماس کا قائد منتخب کیا ہے۔

خالد مشعل نے ہجرت کے بعد سے قریباً 30 سال شام میں گزارے جہاں سے حالیہ خانہ جنگی کے بعد وہ مصر آ گئے ہیں۔ الفتح کے مقابلے میں حماس کو کھڑا کرنے والی اصل میں وہی شخصیت ہے۔ شیخ احمد یاسین کی شہادت کے بعد حماس کی قیادت ڈاکٹر ابو مرزوق کے پاس تھی۔ انھیں امریکا میں گرفتار کر لیا گیا تو خالد مشعل کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قیادت سونپنے سے چند ماہ قبل انھیں لاہور بھجوایا گیا جہاں وہ کئی ہفتے قاضی حسین احمد کے مہمان رہے۔ برادرم عبدالغفار عزیز اس نوجوان فلسطینی کو مختلف اہل علم سے ملاتے رہے۔ لاہور دکھایا، لاہور والے دکھائے، ان کی خوب صورتی، توانائی اور زندہ دلی کو ان کے میزبان بھولے تھے نہ ان سے ملنے والے ان کی معاملہ فہمی، دینی بصیرت اور جہاد پہ بے پناہ یقین کو فراموش کر سکتے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ سوڈان کے موجودہ نائب صدر علی بھی پاکستان آئے، یہاں کے نظام تربیت کو دیکھا، لوگوں سے ملے، وہ بھی منصورہ میں قاضی صاحب کے مہمان تھے۔ سوڈان واپسی کے چند روز بعد صدر عمر البشیر نے انھیں ملک کا نوجوان ترین نائب صدر بنا دیا۔ تب سے یہ کہا جاتا ہے کہ سوڈان میں ہونے والی تمام پائیدار تبدیلیوں اور پالیسیوں کے پیچھے علی کا ذہن کارفرما ہے۔

(حیرتوں سے بھرے اس تاریخی سفرنامے کا باقی احوال ان شاءاللہ آئندہ شمارے میں)

■■■

آپ بھی اپنی عمدہ سوچ، اچھے مشاہدے اور گہرے مطالعے کی حامل تحریر کے ساتھ ''باتیں نئی، تحریریں نئی'' کا حصہ بن سکتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

ساحلی شہر کا غم

ایک شہر ناپرساں کا تذکرہ جو ہمارے اندر بستا ہے اور روز اک نیا دکھ عطا کرتا ہے۔

صفیہ کریم

آسمان جو غم کے آنسو ضبط کیے ہوئے تھا، گزشتہ رات اس کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ شاید وہ اس منظر کی تاب نہ لا سکا جو زمین کی طرف تکتے تکتے اسے ایک ساکت عمارت کے قدموں میں دکھائی دیا۔ وہاں جمع چند لوگ سرگوشیوں میں کہہ رہے تھے۔ دیکھو ایک لاش پڑی

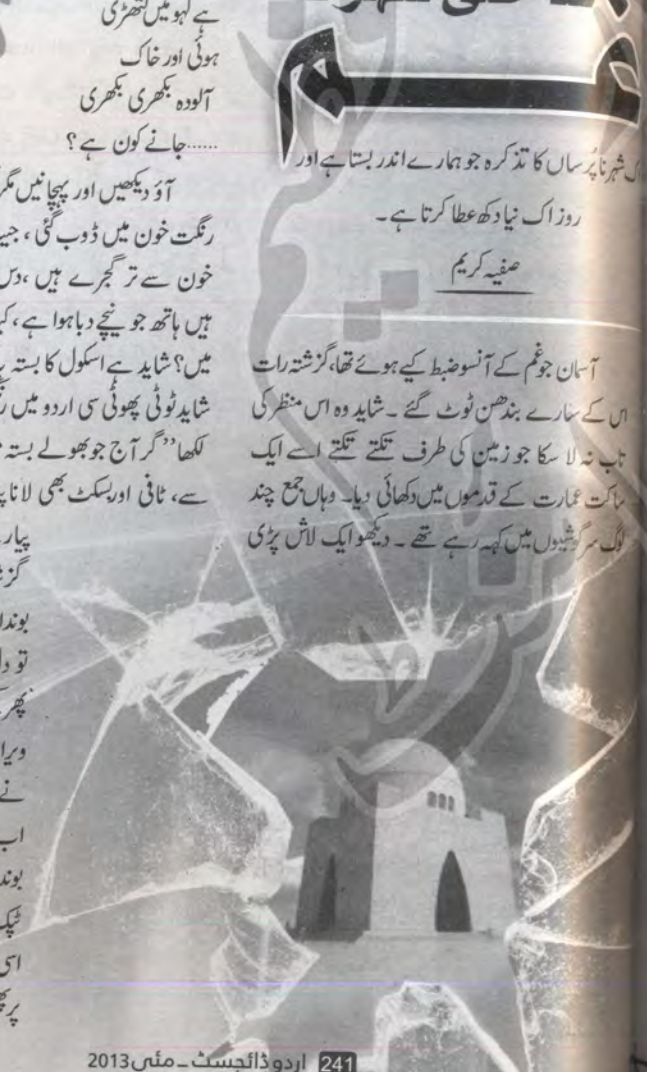

ہے لہو میں لتھڑی
ہوئی اور خاک
آلودہ بکھری بکھری
.....جانے کون ہے؟

آؤ دیکھیں اور پہچانیں مگر نقش مٹا ڈالے گولی نے رنگت خون میں ڈوب گئی، جیب ٹٹولو، کیا رکھا ہے یہ تو خون سے تر گجرے ہیں، دس دس کے دو نوٹ رکھے ہیں ہاتھ جو نیچے دبا ہوا ہے، کیا ہے اس کی سخت گرفت میں؟ شاید ہے اسکول کا بستہ یہ اک پرچہ ہے، خط ہے شاید ٹوٹی پھوٹی سی اردو میں رنگین پنسل کے رنگوں سے لکھا ''گر آج جو بھولے بستہ میرا گئی ہو جاؤں گی آپ سے، ٹافی اور بسکٹ بھی لانا پیارے ابو جلدی آنا..... پیارے ابو جلدی آنا.....

گزشتہ شب جب تیز ہوتی بوندا باندی میں بھیگتا شہر دیکھا تو دل میں عجیب سا قلق تھا۔ پھر کچھ ہی دیر میں بھیگی سڑکیں ویران ہونے لگیں۔ درختوں نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ اب کے پتوں سے پانی کی بوندیں آنسوؤں کے مانند ٹپک رہی تھیں۔ آخر وہ بھی اسی شہر کے باسی تھے۔ کھڑکی پر پھسلتے بارش کے قطرے دیکھ

کر مجھے پابلو نرودا کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو اس نے اپنے آخری مجموعہ کلام "The book of question" میں لکھے تھے۔ بچے کی مانند ہی اس نے ایک عجیب سوال کرتے ہوئے پوچھا تھا "عذاب گزیدہ شہروں پر بارش کس زباں میں ہوتی ہے۔" "In what language does rain fall over tormented cities?"

کیا اس مختصر سے سوالیہ جملے میں کراچی شہر کا عکس نظر نہیں آتا؟ وہ شہر جہاں کے باسیوں کو اس سے عجیب لگاؤ ہے۔ آج وہاں رہنا تقریباً ناممکن ہو چکا۔ مگر اس شہر سے کوچ کر جانا بھی بہت مشکل ہے۔ وہ اس شہر کا ساتھ برے وقتوں میں نہیں چھوڑنا چاہتے بلکہ بہتری کی امید میں جی رہے ہیں۔ مگر وہ فرانسیسی مفکر سارتر کی کہی ہوئی یہ بات بھول جاتے ہیں "کبھی کبھی اُمیدیں خواب آور گولیوں کی طرح ہمارا ہوش چھین لیا کرتی ہیں" یا شاید انہی حالات کے پیشِ نظر جون ایلیا نے کہا تھا، اس شہر میں ایک کتے نے دوسرے سے کہا بھاگ جا ورنہ انسان کی موت مارا جائے گا۔

مختلف ادوار میں ایک ہستی کو شہر پر مسلط کرنے کی کوشش میں کئی جرائم ہوئے۔ خود کو معتبر ثابت کرنے کے لیے بہت سا خون بہایا گیا۔ ہر طرف لہو چاٹتی تلواروں اور لاشوں کے ڈھیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر یہ شہر اپنے ہی باسیوں کی طرح بے بس ہے۔

سب منظر مجھ سے روٹھے ہیں
سب اپنے مجھ سے چھوٹے ہیں
گل و بلبل کی باتیں رہنے دو
میرے شہر کے بچے بھوکے ہیں
آنکھوں میں رقصاں خون یہاں ہے
سارے جگنو کدھر گئے ہیں۔۔۔؟
بیٹوں کے ساہوکار یہاں ہیں
ہاں میرے کرم ہی پھوٹے ہیں
بھیڑیئے، سانپ، سب ہی سہمے ہیں
کہاں انسان شکار کو نکلا ہے
پھر لہو نے خبر کو سرخی دی
کہیں ہال ماؤں نے نوچے ہیں
آگ لگی ہے گلشن گلشن
کرب و بلا ہے مسکن مسکن
بھاگو گے اب بچ کے کہاں
ہوئے مقتل سارے کوچے ہیں

عروس البلاد میں سیاسی چپقلش کا بازار تو گرم ہے ہی، مگر اس عہدِ پُرخطر میں جینے والے کراچی شہر کے باشندوں کا کیا قصور جنھیں ہر صبح نئے خوف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس بے یقینی کے ساتھ کہ وہ شام کی چائے بھی پی پائیں گے کہ نہیں!

شہر کراچی جس پر بارش آنسوؤں (بین) کی زبان میں پڑتی ہے اور سڑکوں پر بہنے والے خون کے دھبوں کو اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے بظاہر اہالیانِ کراچی اپنے جدا ہونے والے پیاروں کو بھول کر روشنیوں کے شہر میں کھو جاتے ہیں مگر وہ بارش لواحقین کے اندر کے غم کو نہیں دھو پاتی، تب ہی وہ اور شدت سے برسنے لگتی ہے تاکہ مائیں اس میں اپنے بہتے آنسوؤں کو چھپا سکیں۔

اس ساحلی شہر کا بس یہی غم ہے۔

■■■

(صفیہ کریم کراچی کی بیٹی ہے۔ 2012ء میں اس نے انٹر آرٹس میں تیسری پوزیشن لی تھی۔ وہاں کے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے شاید پہلی پوزیشن کی حق دار بن رہی ہیں)

خالی دامن

ہر سفر کے لیے زادِ راہ ضروری ہوتا ہے، خالی دامن کوئی بھی سفر طے ہو نہیں پاتا

باتیں نئی
تحریریں نئی

چند برس پہلے میں نے اپنے گھر میں کمرے کی ایک دیوار پر ہلکے رنگوں کے امتزاج سے ایک تصویر بنائی تھی جو فطرت کے دل آویز حسن کی عکاس تھی۔

نیلے نیلے امبر پر، سپید رنگ کے بادل، تیرتے ہوئے۔ سپید رنگ بادلوں کے اوپر کہیں ہلکے اور کہیں گہرے، سرمئی رنگ کے بادل، سایہ فگن۔ کھلی فضا میں اڑتے، چہچہاتے، خوش رنگ پرندے حقیقت کا روپ دھارے ہوئے، کیا جاں فزا منظر تھا۔

جب بھی میں اپنی بنائی ہوئی اس تصویر کو دیکھتا ہوں، اداس ہو جاتا۔ آج اس تصویر پر نظر پڑی تو دیکھتا ہی چلا گیا۔

کمرے میں رکھی میز کرسی کھینچی اور تصویر کے سامنے بیٹھ گیا۔ آج میں اس منظر میں کھو جانا چاہتا تھا۔ اس منظر میں جانے سے پہلے اٹھا اور کچن کی سمت چل دیا۔

کیتلی میں پانی ڈالا، لائٹر سے چولہا جلایا اور ہلکی آنچ پر پانی گرم ہونے کو رکھ دیا۔ پانی سے دھواں اٹھنے لگا تو اس میں ایک چمچ چائے کی پتی، حسب ذائقہ چینی ڈالنے کے بعد گرم پانی میں تھوڑا دودھ ملا دیا۔ اب تازہ گرم چائے تیار تھی۔

چائے کی خوش گوار مہک چہار سو پھیلنے لگی۔

میں نے چائے کی پیالی اپنی طرف بڑھاتے ہوئے، ایک گھونٹ لیا۔ واہ! اپنے ہاتھوں سے بنائی گئی چائے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔

تصویر کے منظر کی کیفیت میں اترنے، اس کی جزئیات پر بدیر غور کرنے سے، تصویر کا منظر دھندلانے لگا۔ میری یادوں کے دریچے میں، آسمان کو چھوتے کوہساروں کے حصار میں واقع جنت ارضی، وادیٔ کالام کا حسین منظر ابھرنے لگا۔ مجھے یاد آنے لگا، میں ہر برس اپنے بچوں کے ہمراہ موسم گرما کی تعطیلات میں لمبی

ڈرائیو پر نکلتا۔ ہم لاہور سے نوشہرہ کے راستے مینگورہ سے ہوتے ہوئے دریائے سوات کے سنگ سنگ سفر کرتے۔ دریا کے کنارے پر واقع 'مدین' ہوٹل پہنچتے۔ وہاں شوریدہ جھاگ اڑاتے دریا کے کنارے بیٹھ کر چائے سے لطف اندوز ہوتے۔ تھوڑی دیر آرام کرتے پھر سیبوں سے لدے پھندے درختوں کے زیرِ سایہ اس ہوٹل سے نکل کر دریاؤں کے سنگم پر واقع بحرین پہنچتے۔ وہاں آنکھوں کو خیرہ کرتے مناظر، حیرت و انبساط سے دیکھتے کالام کی راہ اختیار کرتے۔ ہم مغرب سے پہلے کالام پہنچ جایا کرتے تھے۔

جب سے دنیا کے سب سے بڑے جمہوریت کے علمبردار نے اس خطے میں دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ شروع کر رکھی ہے۔ امنِ عالم غارت ہو گیا ہے۔

پھر انسانی حقوق کا پرچار کرنے والے ہمارے ملک کی سرزمین پر ڈرون حملوں سے انسانیت کی دھجیاں بکھیر رہے ہیں۔ ہمارے بے بس، بے کس، محبِ وطن نہتے پرامن شہریوں پر ظلم و ستم سے ان کی جبیں پر شکن تک نہیں آتی۔

جب سے یہ نام نہاد جنگ شروع ہوئی ہے۔ میں اپنے وطن کی سرسبز و شاداب وادی کی سیاحت کو نہیں جا سکا۔ اس کے خوبصورت مناظر میرے ذہن میں بستے ہیں۔ میں اس کی تیز و تند سرد ہواؤں کو نہیں بھولا، جو اسے ہمہ وقت اپنی لپیٹ میں لیے رہتی ہیں۔ میں سبزے میں کھلے ان دیکھے بیش رنگ، مہکتے پھول نہیں بھولا، میں کوہساروں سے گرتی، گنگناتی، آبدار موتی برساتی آبشاروں کو نہیں بھولا۔ میں سوچتا ہوں، میں اس حسین وادی میں کب سانس لے سکوں گا۔

وہ دن کب آئے گا، جب ہماری دھرتی، امن آشتی کے پھول کھلائے گی..... اپنے ہی خیالات کے پیچ و خم میں الجھتے میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ تصویر بنا، ایک مانوس چہرہ، میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ وہ انجم تھا، میرا پھوپھی زاد بھائی، جو تین برس قبل مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ وہ میرا ہم عمر تھا۔ ہم نے زندگی کے قیمتی ایام، ایک ساتھ گزارے تھے۔ ہماری وابستگی یہاں تک رہی کہ ہم نے ایک ساتھ ایک ہی برس میں میٹرک کیا۔ کالج میں داخلہ لیا، پھر تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک ہی برس کے ایک ہی ماہ میں ہماری شادیاں ہو گئیں۔ ہم بہت قریب تھے کہ ایک روز اجل نے ہمارے درمیان لامتناہی فاصلے پیدا کر دیئے۔

انجم مجھے تصویر کے حسن میں گم پا کر بولا ''کیا تم اس سے بھی کہیں خوبصورت منظر کو دیکھنا چاہو گے؟''

''کیوں نہیں۔''

''تو پھر تم میرے ساتھ چلے آؤ۔''

''تمھارے پاس چلا آؤں، مگر کیسے؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''زادِ راہ ہے تمھارے پاس؟''

وہ ہی تو نہیں ہے میرے پاس۔''

میں سر جھکائے ہوئے بولا ''تو پھر تم میرے پاس کیسے آپاؤ گے؟''

یہ کہتے، انجم نے ٹھنڈی آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔

انجم کے سوال نے مجھے چونکا دیا۔ میری نیند کافور ہو گئی۔ میں خوابیدہ منظر سے باہر نکل آیا تھا۔ نشست پر سیدھا بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا ''کچھ بھی تو نہیں ہے میرے پاس، ہاں کچھ بھی نہیں!'' آنکھیں بھیگنے لگیں، ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، احساس ندامت سے چھلکتے آنسو، میرا خالی دامن بھگونے لگے تھے۔

■■■

لفظوں کی حرمت

باتیں نئی
تحریریں نئی

اگر لفظوں کی تعلیم کے ساتھ لفظوں کی حرمت کا احساس بھی دلایا جائے تو پھر تعلیم اور تربیت دونوں ہو جاتی ہیں

نورین قادر قریشی

ڈاکٹر طیب کلاس میں داخل ہوئے تو یک دم کلاس میں اٹھنے والا طوفان بدتمیزی تھم سا گیا۔ سب طالب علم اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ کر اپنے نئے استاد کا مختلف زاویوں سے جائزہ لینے لگے۔ کسی کی نگاہیں ان کے لباس پر تھیں، کوئی ان کے چہرے کے تاثرات سے ان کے رحم دل یا ظالم ہونے کا اندازہ لگا رہا تھا۔ جب کہ کچھ طالب علم اشاروں کی زبان سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ ڈاکٹر طیب نے ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کلاس کا سرسری جائزہ لیا۔ اپنا مختصر سا تعارف کروایا اور طلبہ سے ان کے متعلق بات چیت کرنے لگے۔

انھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ملک کی کئی معروف یونیورسٹیوں میں پڑھایا۔ کئی ملکوں کی سیر و سیاحت کے بعد ان کے پاس تجربہ اور مشاہدہ کا بھی وافر ذخیرہ موجود تھا۔ جسے وہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنے طالب علموں میں بانٹتے تھے۔ انھیں اپنے شاگردوں سے ایک خاص قلبی لگاؤ تھا۔ وہ طالب علم جو اپنی کمزور تعلیمی حالت کے باعث اکثر اساتذہ کی نظروں سے اوجھل ہو چکے ہوتے آپ ایسے طالب علموں کو اپنی خاص توجہ و شفقت سے نوازتے۔ کئی کمزور طلبہ جو ایک دو بار کی ناکامی کے بعد تعلیم سے بدظن ہو چکے تھے۔ آپ کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی سے پھر سے تعلیمی سفر پر گامزن ہو گئے۔ ان کی مشفقانہ شخصیت کا سحر طلبہ کو بھی ان سے تادیر جوڑے رکھتا۔ طلبہ کا مسئلہ چاہے کسی بھی نوعیت کا ہو وہ اس کے حل کے لئے اپنی سی بھرپور کوشش کرتے۔

اعلیٰ سطح پر تدریسی خدمات سرانجام دیتے ہوئے انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ جس طرح ایک ڈاکٹر کسی پس ماندہ علاقے میں جانے سے کتراتا ہے اسی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ بھی ابتدائی مدارج میں تدریس سے کتراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے طلبہ ابتدائی مدارج میں اچھے اساتذہ سے محروم رہتے ہیں۔

اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے

انھوں نے تین ماہ کے لیے ایک پسماندہ علاقے کے ایک ہائی اسکول میں پڑھانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اتنا آسان نہ تھا۔ ان کو اپنی علمی قابلیت کے مطابق معاوضہ ملنے کی امید نہ تھی اس کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے طریقہ تدریس کو بھی تبدیل کرنا تھا۔ کچھ دیگر معروضی مسائل اس کے علاوہ تھے۔ بہرحال تمام مشکلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے اپنے فیصلہ کو حتمی شکل دی۔ سکول والوں کے لئے یہ ایک اعزاز کی بات تھی۔

سکول جوائن کئے ہوئے انھیں تین ماہ ہونے کو تھے۔ ایک مسئلہ انھیں روز اول ہی سے پریشان کئے ہوئے تھا۔ سکول کے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے، کلاس کی کرسیوں پر یا روسٹرم پر لکھا ہوا کوئی نازیبا جملہ انھیں ذہنی کوفت میں مبتلا کر دیتا۔ اس مسئلے کو سلجھانے کے لئے انھوں نے پرنسپل سے مشاورت کا سوچا۔

پرنسپل نے ان کی آمد کی اطلاع ملتے ہی انھیں اپنے آفس میں بلا لیا۔ رسمی گفتگو کے بعد انھوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ درپیش مسئلہ ان کے گوش گزار کر دیا۔ اور اس کے حل کے لئے بھی چند تجاویز پیش کیں۔

''ڈاکٹر صاحب یہ بات میں نے بھی محسوس کی ہے لیکن ایسی باتوں کو کیسے روکا جا سکتا ہے۔''

''لیکن ایسی باتوں کو روکنا بھی ہماری ہی ذمہ داری ہے، ہم تعلیم کے ساتھ تربیت کے پہلو کو نظرانداز کر کے ادھورے انسانوں کی جماعت تیار کر رہے ہیں جن کے ادھورے پن کا خمیازہ پھر پورے معاشرے کو بھگتنا پڑے گا۔''

''میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں لیکن بھلا آپ خود بتائیں کسی طالب علم کو باتھ روم کی دیوار پر نازیبا اشعار یا کلمات لکھنے سے کیونکر روکا جا سکتا ہے؟ ڈاکٹر صاحب یہ کچے ذہن ہیں، اس لئے ایسی معیوب حرکتیں کرتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی سمجھ جائیں گے۔ ایسی باتوں پر تو بات کرتے ہوئے بھی کچھ عجیب سا لگتا ہے۔''

پرنسپل کے اس ردعمل نے ان کو کسی حد تک دل برداشتہ سا کر دیا لیکن ان کا ذہن مسلسل کسی حل کی تلاش کے لئے کوشاں تھا۔

ڈھلتی شام کا منظر بہت بھلا لگ رہا تھا۔ وہ پرنسپل کے ساتھ ان کے گھر کے لان میں بیٹھے ڈوبتے سورج کے دل کش منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''آپ کے گھر کا باغ بہت خوبصورت ہے' لگتا ہے کوئی قابل اور ماہر مالی رکھا ہوا ہے آپ نے''۔

''مالی تو واقعی قابل ہے اپنے کام کو انتہائی لگن اور دل جمعی کے ساتھ کرتا ہے' میں بھی اسے معقول معاوضہ دیتا ہوں تاکہ وہ مطمئن رہے اور یہاں سے بھاگنے کا نہ سوچے۔'' انھوں نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ جواب دیا۔

''اگر کبھی اسے کچھ ماہ کے لئے چھٹی جانا پڑ جائے تو پھر کیا ہو؟''

''ہونا کیا..... باغ جنگل بن جائے گا جسے ٹھیک کرنے کے لئے دوگنی محنت کرنا پڑے گی''۔

''جب ایک چھوٹے سے باغ کو درست حالت میں رکھنے کے لئے ہمیں ایک ماہر اور فرض شناس مالی کی ہمہ وقت مدد درکار رہتی ہے پھر ہم انسان کے کچے ذہنوں کو وقت کی تربیت کے حوالے کیوں کر دیتے

ہیں؟''

انہوں نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پرنسپل صاحب کی طرف دیکھا۔ چند لمحے ان کے درمیان مکمل خاموشی رہی۔ وہ ایک پھول پر نظریں جمائے کسی سوچ میں گم تھے۔

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب میں آپ سے اس مسئلے کے کسی ٹھوس حل کے لئے ہر ممکن مدد کے لئے تیار ہوں؟ آپ کی تجاویز پر بھی غور کیا جائے گا اور دیگر اساتذہ سے بھی رائے لی جائے گی۔'' پرنسپل صاحب نے ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ انھیں اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔

وہ مسرت آمیز جذبات کے ساتھ گھر واپس آئے۔

☆☆☆

''دیکھو بیٹا ہمارا ہر عمل اچھا یا برا اثر رکھتا ہے، یہ اثر ہم پر ظاہر ہوتا ہے اور کبھی اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ آپ کی ایک مسکراہٹ کسی کے پورے دن کو خوش گوار بنا دیتی ہے اور کبھی آپ کا ایک لفظ کسی کو گھنٹوں رلا دیتا ہے' لفظوں کا اثر دیرپا ہوتا ہے اور جب لفظ تحریر کی صورت میں ہو تو ان کا اثر کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ جب تک وہ لفظ لکھا رہے گا ہر پڑھنے والا اس کے اثرات لیتا رہے گا اچھے یا برے یہ آپ کے الفاظ کی نوعیت پر منحصر ہے لہٰذا ہمیشہ لفظوں کی حرمت کا خیال رکھنا' کیونکہ ہمارے بعد بھی ہمارے لکھے لفظ زندہ رہتے ہیں۔''

''اگر ہم تعلیم یافتہ ہو کر اس قسم کی حرکتیں کریں گے تو پھر معاشرے کے ناخواندہ افراد سے کیا امید رکھی جائے''

''ہمارے لکھے ہوئے ایک نازیبا جملے پر کوئی ردعملی کلمات لکھے گا یہ سلسلہ چلتا رہے گا یوں اس کی ابتدا کرنے والا ان سب کے غلط فعل میں برابر کا شریک ہوگا۔''

ہر استاد اپنے اپنے لیکچر کے اختتام پر طلبہ کو ایسی ہی چند باتیں بتانے لگے۔ انھیں یقین تھا کہ سب کی یہ مشترکہ کاوش طلبہ پر ضرور مثبت اثرات ڈالے گی۔

چند ماہ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک واضح فرق محسوس کیا کہ ان کے آنے پر جو کچھ لکھا ہوا تھا اس میں مزید اضافہ نہیں ہوا۔ ان کا دل اس بات پر پختہ یقین رکھتا تھا کہ جب انسان خلوص نیت سے کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو قدرت بند راستوں اور بند دلوں کو خود بخود کھول دیتی ہے۔ ہمارا کام بس اپنی سی کوشش کرنا ہوتا ہے۔

وہ کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے، جب ان کا ملازم انھیں ایک بند لفافہ دے کر گیا۔ انھوں نے تجسس سے لفافہ کھولا۔

''اس سے پہلے مجھے لفظوں کی تعلیم دی گئی تھی۔ آپ نے مجھے لفظوں کی حرمت کا احساس دلایا، اس کا شکریہ۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

آپ کا شاگرد

آپ کا احسان مند

انہیں تو اپنے شاگرد ہر حال میں عزیز تھے۔ ایسے پلٹ آنے والے تو ان کے عزیز از جان ہو جاتے تھے۔ انھوں نے جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ کئی بار اس مختصر تحریر کو پڑھا۔ اور پھر بہت اہتمام کے ساتھ محفوظ کر لیا۔ بلاشبہ یہ الفاظ ان کے لئے ایک انمول خوشی کا باعث تھے ایک استاد کی حیثیت سے ان کی زندگی ایسی ہی انمول خوشیوں سے پر تھی۔

■■■

باتیں نئی
تحریریں نئی

بلاوا

اس نے اپنی ساری زندگی کی کمائی اپنے ہی ہاتھوں سے لُٹا کے اپنے پَر کاٹ ڈالے تھے۔ مگر شاید قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

محمد سلیم اختر

فیض عالم اپنے گاؤں کی مسجد کا خادم تھا۔ مسجد کی صفائی ستھرائی اور وضو کے لیے پانی کی فراہمی اس کے بنیادی کام تھے۔ گاؤں میں بجلی تو تھی نہیں، اس لیے وہ باہر کچھ فاصلے پر بنے کنوئیں سے مشک میں پانی بھر کر لاتا اور مسجد کے اندر بنی ٹینکی میں لا ڈالتا۔ بیوی فضلاں بھی ان کاموں میں اس کی مدد کرتی۔ فیض عالم غریب اور مسکین شخص تھا۔ گاؤں میں اس کی کوئی جائیداد نہ تھی، صرف ایک کچا سا کوٹھا تھا۔ جہاں وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا۔ پکا نمازی اور پرہیز گار شخص تھا۔

طبیعت میں انکسار اور عاجزی تھی اور قناعت پسندی بھی۔ وہ نہ صرف بڑوں بلکہ چھوٹوں کی بھی عزت کرتا۔ گاؤں کا ہر فرد اس کے خلوص اور ایمانداری کا معترف تھا۔

اس کا بیٹا جبار سب بہن بھائیوں سے بڑا تھا۔ جب جبار کچھ سمجھ دار ہوا، تو وہ باپ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اس نے ایک ریوڑ بنایا اور گاؤں کے لوگوں کی بھیڑ

بکریاں چرانے لگا جس کا اسے ہر ماہ کچھ نہ کچھ معاوضہ مل جاتا۔ پھر بھی فیض عالم کے گھرانہ کی گزر بسر مشکل سے ہوتی۔ مگر وہ ہر لحہ تقدیر پر شاکر تھا اور اوپر والے کا شکریہ ادا کرتے نہ تھکتا۔

اس کی دوستی صرف خانو کمہار سے تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی تھے کیونکہ گاؤں میں سب سے زیادہ غریب وہ تھا یا پھر خانو کمہار۔ فارغ وقت میں وہ دونوں گپ شپ بھی لگاتے۔ خانو کمہار کا بیٹا رشید، فیض عالم کے بیٹے جبار کا ہم عمر تھا۔ وہ بھی جبار کی طرح بھیڑ اور بکریاں چراتا۔ ان کی دنیا صرف بھیڑ بکریوں جنگل اور گاؤں تک ہی محدود تھی۔ فیض عالم کو نعتیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اس نے کچھ پنجابی نعتیں یاد کر رکھی تھیں جنھیں وہ اکثر شوق اور لگن سے پڑھا کرتا۔

''کملی والے مینوں وی مدینے بلالے''

اس کی پسندیدہ نعت تھی۔ وہ جب یہ نعت کسی محفل میں سناتا تو اس کی آنکھیں بھر آتیں اور اس کے من میں مدینہ بلائے جانے کی خواہش مچل اٹھتی۔ مگر یہ تمنا سینے میں ہی دم توڑ جاتی کیونکہ مدینہ شریف جانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ فیض عالم نے اپنی خواہش کا اظہار کبھی کسی نے نہیں کیا تھا، لیکن وہ اس کی تکمیل میں لگا ہوا تھا۔ اس نے بکریوں والے باڑے میں گڑھا کھود کر ایک مٹی کا گھڑا اس میں دبا رکھا تھا۔ گاؤں والوں سے جب کبھی اسے روپیہ، دو روپے ملتے وہ گھڑے میں ڈال کر منہ بند کر دیتا..... وہ یہ رقم سفر مقدس کے لیے جمع کر رہا تھا۔ اس بھولے شخص کو معلوم نہ تھا کہ وہ معمولی رقم سے یہ مقدس سفر نہیں کر سکتا۔

گاؤں کا امیر ترین گھرانہ گاؤں کے نمبر دار راجا شہباز کا تھا۔ وہ گاؤں کا نمبر دار ہونے کے ساتھ ساتھ یونین کونسل کا چیئرمین بھی تھا۔ علاقہ میں سب سے زیادہ جائیداد اس کی تھی۔ امیر ہونے کے باوجود سخاوت اور ہمدردی اس سے کوسوں دور تھی۔ راجا مسجد کی شکل سال میں دو بار ہی دیکھتا یعنی عیدین کے مواقع پر! یونین کونسل کا چیئرمین ہونے کا وہ بھرپور فائدہ اٹھاتا۔ ترقیاتی فنڈ، زکوٰۃ فنڈ اور دیگر سرکاری رقومات ہضم کرنا اس کے لیے معمولی بات تھی۔ یہ فنڈ اور رقومات ہضم کرتے کرتے جب اس کے ضمیر کو 'نیکی' کا خیال ہوتا، تو فوراً عمرہ یا حج کرنے روانہ ہو جاتا۔ واپسی پر اس کا استقبال اس طرح کیا جاتا جیسے وہ کوئی محاذ فتح کر کے آرہا ہے۔ ایسے موقع پر فیض عالم کی آنکھوں کے سامنے جالا سا بن جاتا۔

''میری باری کب آئے گی مولا!'' وہ ڈبڈباتی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ کر کہتا۔ پھر اٹھ کر مشک اٹھاتا اور پانی بھرنے روانہ ہو جاتا۔ کبھی کبھار راجہ شہباز تبرک تقسیم کرنے مسجد بھی آجاتا۔ فیض عالم اسے مسجد میں دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور اسے مبارکباد بھی دیتا۔ ایک بار فیض عالم نے راجا سے پوچھا ''راجا صاحب! کتنا خرچ آتا ہے، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے گھر کی زیارت کرنے کا؟''

''پورا ایک لاکھ روپیہ۔'' راجا شہباز فخریہ انداز سے قہقہہ لگا کر بولا ''تمھیں کیا شوق چڑھا ہے، پیسے پوچھنے کا، کیا حج پر جانے کا ارادہ ہے؟'' اس کے لہجے میں غرور بھی تھا اور طنز کی کاٹ بھی۔

''میری اتنی طاقت اور نصیب کہاں راجا صاحب!'' فیض عالم نے شکستہ لہجے میں کہا تو راجا کا سینہ کچھ اور پھول گیا۔ فیض عالم نے دیگر نمازیوں سے نظریں چرائیں اور اداس سا گھر لوٹ آیا۔ اس رات

اسے نیند نہ آئی۔ اس کی سوچ پر غم و اداسی کی چادر تنی رہی۔ رہ رہ کر ایک ہی آواز اس کے من میں گونجتی تھی ''میری باری کب آئے گی؟'' میری باری کب آئے گی، میری باری کب آئے گی؟''

وہ یہی سوچتا رہا کہ راجا صاحب تو ہر سال حج کرنے چلے جاتے ہیں۔ میں گزشتہ چالیس برس سے مٹکے میں پیسے رکھتا چلا جاتا ہوں، جو بڑی مشکل سے پینتیس ہزار روپے ہوئے ہیں۔ نجانے ایک لاکھ کب پورے ہوں گے؟ کیا چالیس برس اور..... کیا میرے نصیب میں سفر مقدس نہیں ہے؟

وہ جب کبھی اپنی اس خواہش کا اظہار خانو سے کرتا تو وہ اسے کہتا ''یہ تو توفیق کی بات ہے فیض عالم! یہ تو بلاوا آنے کی بات ہے۔''

فیض عالم خالی خالی نظروں سے اسے تکنے لگتا۔ خانو اس کی کیفیت سمجھ جاتا اور کہتا ''فیض عالم! مجھے یقین ہے ایک روز تمھارا بلاوا ضرور آئے گا۔''

''توفیق..... بلاوا.....'' فیض عالم تھکے سے لہجے میں کہتا ''یہ بلاوا ہر بار راجا صاحب ہی کو کیوں آتا ہے؟''

''فیض عالم! اب یہ توفیق یا بلاوا نہیں۔'' خانو بولا ''ایسے لوگ تو زبردستی خدا اور اس کے رسول ﷺ کے گھر میں جا گھستے ہیں۔ پھر وہاں سے جو کچھ ہاتھ لگے، اسے حاضری کے ثبوت کے طور پر اٹھا لاتے ہیں۔ مثلاً کھجوروں کے ٹوکرے، آبِ زم زم کے کنستر..... یہ حاضری نہیں کہلاتی فیض عالم!'' اس کی آواز بھر جاتی۔ ''لیکن ایک لاکھ بہت زیادہ رقم ہے۔'' فیض عالم ٹوٹے لہجے میں کہتا۔

تم کوشش کر کے سیڑھیاں چڑھتے چلے جاؤ انھیں گنومت۔'' خانو اس کی ہمت بندھاتا۔

گاؤں میں صرف ایک پرائمری اسکول تھا۔ جہاں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے، اسکول میں صرف دو ہی استانیاں تھیں۔ اردگرد کے دیہات سے بھی کچھ لڑکے اور لڑکیاں اس اسکول میں پڑھنے آتے۔ اسکول گاؤں سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ گاؤں اور اسکول کے درمیان ایک نالہ پڑتا تھا۔ اس نالے میں معمولی بارش ہونے سے بھی طغیانی آجاتی۔ اس باعث اسکول اور گاؤں کا رابطہ منقطع ہو جاتا۔ گاؤں کے بچے اسکول جاتے ہوئے یہ نالہ پار کرتے تھے۔ بارشوں کے موسم میں جب نالہ پانی سے بھر جاتا تو بچوں اور والدین کو کافی پریشانی اٹھانی پڑتی..... لوگوں نے اس نالے کا نام ''خونی نالہ'' رکھ دیا تھا کیونکہ یہ ہر سال کسی نہ کسی بچے کی جان لے لیتا۔ گاؤں کے لوگوں کے مطالبے اور اصرار راجا شہباز نے حکومت سے نالے پر پل بنانے کی منظور لے رکھی تھی۔ اسے فنڈ مل گیا مگر کئی برس گزر جانے کے باوجود وہ پل نہ بن سکا۔ البتہ سرکاری فائلوں میں وہ بن چکا تھا۔ گاؤں کے لوگ جان گئے تھے کہ راجا شہباز سرکاری افسروں سے مل ملا کر پل کے لیے ملنے والی رقم ہڑپ کر چکا۔ مگر اس کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت کسی میں نہ تھی۔ جب بھی کوئی بچہ اس خونی نالے کی بھینٹ چڑھتا، راجا شہباز گاؤں والوں کو یقین دلاتا کہ اگلے مالی سال کے فنڈ ملنے پر وہ پل کی تعمیر کرا دے گا..... لیکن اگلا سال کبھی نہ آتا۔

اس برس بھی ایسا ہی ہوا۔ فیض عالم کے دوست خانو کمہار کا پوتا اس خونی نالے کی بھینٹ چڑھ گیا۔ فیض عالم کو جب یہ خبر ملی تو وہ فوراً خانو کے گھر پہنچا اور اس کے گلے لگ کر خوب رویا۔ بچے کی لاش اگلے روز بہت دور سے ملی۔ اس کی نماز جنازہ پڑھتے وقت ہر آنکھ

تھی۔ فیض عالم بھی ان میں شامل تھا۔ سب سے ...وہ دکھ اسی کو ہوا۔ بچے کو دفنانے کے بعد فیض عالم ...لی قمیص سے آنکھیں صاف کیں اور بوجھل قدموں ...گاؤں کی طرف چل پڑا۔ اس کا رخ راجا شہباز کی ...ی کی طرف تھا۔ راجا شہباز نے فیض عالم کو دیکھا تو ''ہو فیض عالم! خیریت سے آئے ہو نا!''

''راجا صاحب!'' فیض عالم ہمت کر کے بولا ...یک عرض کرنی تھی جی۔'' وہ عاجزانہ انداز میں بولا ...ہو کیا بات ہے؟'' راجا شہباز پیشانی پر بل ڈال کر ''راجا صاحب! آج خانو کا پوتا خونی نالے کی ...ٹ چڑھ گیا ہے۔'' وہ زخمی الفاظ میں بولا ''وہ ..... اگر نالے پر پل بن جائے تو بچوں کو آسانی ہو ...ے گی۔''

''فیض عالم!'' راجا کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ...ب دار لہجے میں بولا ''تم مسجد کے خادم ہو۔ تم مسجد کی ...کرو، یہ کام تمھارے کرنے اور سوچنے کا نہیں۔ پل ...ا کام ہو جائے گا۔ تمھیں کیا جلدی ہے؟''

فیض عالم نے راجا کا غصہ دیکھا تو وہ خفت اور ...ے چارگی کے ملے جلے احساسات لیے حویلی سے باہر ...ل آیا۔ مغرب کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ فیض عالم نے ...س روز ناقابل بیان کیفیت میں نماز پڑھی۔ ''پل کب ...نے گا؟ کب.....؟''

نماز پڑھنے کے بعد اس نے خود سے سوال کیا۔ نہ ...جانے وہ کون سا لمحہ تھا کہ اسے یوں لگا کہ جیسے کوئی راز ...ہے جس سے وہ اچانک آشنا ہو گیا۔

نماز عشا ادا کرنے کے بعد وہ بے چین سا رہا۔ ...ماز ختم ہوئی تو اس نے مسجد کی لالٹین بجھائی، بڑے ...دروازے کو کنڈی لگائی اور گھر آ گیا۔ پھر وہ باڑے میں

بجلی بجلی بجلی

اک بجلی کا عذاب ہے اور ہم ہیں دوستو
حالت بڑی خراب ہے اور ہم ہیں دوستو
مفلوج کر کے رکھ دیا ہے ساری قوم کو
یہ آئے یا نہ آئے اس کو نہ کچھ کہو
ٹینشن کا اک سیلاب ہے اور ہم ہیں دوستو
کتنا حسین بجلی نے تحفہ ہے یہ دیا
ہر خوش مزاج شخص کو ہے چڑچڑا کیا
کانٹوں بھرا گلاب ہے اور ہم ہیں دوستو
اپنی تو دسترس سے باہر یہ ہو گئی
جل دے کے نکلنے میں ماہر یہ ہو گئی
کیا چیز لاجواب ہے اور ہم ہیں دوستو
اس کے بغیر ہم بھی اب رہ نہیں سکتے
دکھ دیتی ہے ہزاروں کچھ کہہ نہیں سکتے
یہ گوہرِ نایاب ہے اور ہم ہیں دوستو
دیکھا تھا رات ڈیم کالا باغ بن گیا
اس بے بہا خوشی سے سینہ بھی تن گیا
کتنا رنگین خواب ہے اور ہم ہیں دوستو
اک بجلی کا عذاب ہے اور ہم ہیں دوستو

(چوہدری عبدالخالق)

گیا، مٹی کا گھڑا نکال کر اسے اپنے گھر میں لے آیا اور اُلٹ دیا۔ گھڑے سے برآمد کردہ ساری رقم اس نے چادر پر پھیلا دی۔ وہ ساکت نظروں سے لالٹین کی سہمی ہوئی روشنی میں رقم کو گھورنے لگا۔ جو اس کے چالیس برس کی کمائی تھی..... ایک، دو، پانچ، دس اور سو روپے کے نوٹ اس نے انتہائی نفاست سے الگ الگ تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے سکوں کا بھی ڈھیر تھا۔ وہ پھر اپنی جمع شدہ پونجی گننے لگا، چالیس ہزار

روپے سے کچھ اوپر رقم بنی۔ اس کا دماغ سن ہو گیا اور سارے احساسات اور جذبات سرد ہو گئے۔ وہ اپنے آپ سے کچھ کہنے لگا۔

''کل میں یہ ساری رقم پل بنانے کے لیے دے دوں گا۔''

وہ یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گیا۔ رات کو نیند بھی اسے خوب آئی۔ صبح جب وہ فجر کی نماز ادا کرنے کے لیے مسجد کی طرف روانہ ہوا تو رقم کی پوٹلی ہاتھ میں تھی۔ نماز ختم ہوتے ہی اس نے نمازیوں سے درخواست کی کہ وہ ان سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ تمام نمازی چونک گئے، آج پہلی بار فیض عالم ان سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ نجانے وہ کیا کہے گا؟ کہیں مسجد کی خدمت سے تو دستبردار نہیں ہو رہا۔

''میرے بھائیو اور دوستو!'' فیض عالم کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

اس پوٹلی میں موجود رقم میری چالیس برس کی کمائی ہے..... یہ کل رقم چالیس ہزار آٹھ سو بارہ روپے بنتی ہے۔ میں نے یہ رقم حج کرنے کے لیے جمع کی تھی۔ مگر امام صاحب کے حوالے کر رہا ہوں تاکہ آپ لوگ اس سے خونی نالے پر پل بنوا لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آئندہ کوئی بچہ خونی نالے میں ڈوب کر نہ مرے۔ جب بھی کوئی بچہ نالے میں گر کر زندگی ہارتا ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا بیٹا مر گیا۔ میں نے کئی برس آپ لوگوں کا نمک کھایا ہے۔ فیض عالم کی آواز رندھ گئی..... اس نے رندھی ہوئی آواز میں اپنی بات جاری رکھی ''میں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے یہ رقم دی ہے۔ اللہ اسے قبول فرمائے۔'' یہ کہہ کر اس نے پوٹلی امام مسجد کے حوالے کر دی۔ سبھی نمازی بڑھ کر اسے ملتے ہوئے اظہار مسرت کرنے لگے۔ وہ بہت خوش تھے۔

فیض عالم گھر پہنچا تو اسے ایسے لگا اس نے آج صدیوں کا سفر کیا ہے اور مشقت سے اس کے پاؤں میں آبلے پڑ چکے۔ جسم تھکن سے چور ہونے کے باوجود اس کا دماغ مسلسل جمود کی حالت میں تھا۔ سارا دن وہ اسی حالت میں رہا۔ گاؤں میں جلد یہ بات پھیل گئی کہ فیض عالم نے اپنی جمع پونجی پل کے لیے عطیہ کر دی۔ راجا شہباز نے فیض عالم کی اس سخاوت کا چرچا سنا تو تڑپ اٹھا۔ دن بھر گاؤں کے مرد اور عورتیں فیض عالم کی خدا ترسی پر اسے داد دینے اس کے گھر آتے رہے۔ مگر راجا کے گھر سے کوئی اسے شاباش دینے نہ آیا۔ رات ہوئی تو وہ بستر پر دراز ہو کر ماضی سے حال کی طرف پرواز کرنے لگا۔ ایک..... دو..... تین..... چالیس پچاس برس کی ریاضت اور مشقت اس کے اعضا میں سمانے لگی۔ اور پھر ایک ہندسہ جگمگایا: ''چالیس ہزار آٹھ سو بارہ روپے۔'' تب اس کے پیٹ میں گولہ سا اٹھا، سانس رکنے لگی، منہ سے سسکیاں نکلیں اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ اس کا چہرہ اور داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

''میری باری کب آئے گی؟'' مگر اب تو اس کی باری ہمیشہ کے لیے نہیں آنی تھی، اس نے اپنے پر خود ہی کاٹ ڈالے تھے۔ روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے نیند کے عالم میں گنبد خضریٰ کو دیکھا تو بے بسی کے احساس نے اسے اپاہج کر ڈالا۔ یہ اس نے کیا کر ڈالا؟ اپنا زادِ راہ اپنے ہاتھوں لٹا دیا۔ اسے یوں لگا کہ وہ ایک ملاح کے مانند ہے، جس نے پوری عمر سخت محنت سے منزل تک پہنچنے کے لیے کشتی بنائی پھر

[illegible] قریب آتے ہی کشتی کو سمندر میں بہا دیا۔ فیض [illegible] کا سانس بند ہونے لگا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ نہ [illegible] کتنی دیر اس کی آنکھیں آنسوؤں کے سیلاب میں [illegible] رہیں۔ حتیٰ کہ پھر آنکھ لگ گئی۔ لیکن وہ مکمل طور پر [illegible] نہیں پایا تھا کہ اچانک ایک پرنور اور شفیق شکل والے [illegible] نے اسے جگا دیا۔ اجنبی نے فیض عالم کا ہاتھ پکڑا [illegible] سے یوں لگا جیسے زمین نیچے سے سرک گئی۔ کیف و [illegible] سے سرشار ہوا میں تیرتا ہوا وہ نجانے کہاں جا [illegible] اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا جسم روئی کے [illegible] کی طرح محو پرواز ہے۔ دیر بعد اس کے پاؤں [illegible] پر لگے تو اسے اپنے اردگرد آوازیں سنائی دیں:

[illegible]یک اللھم لبیک۔ لبیک لا شریک لک [illegible]یک ان الحمدہ والنعمتہ لک والملک لا [illegible]یک لک.....''

اجنبی نے اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اردگرد لاکھوں [illegible] تعداد میں لوگ سفید احرام باندھے ہوئے تھے۔ [illegible] عالم یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا لباس بھی [illegible]رام میں بدل چکا تھا۔ پھر وہ بھی مناجات کے ہجوم [illegible] شامل ہو گیا۔ ''لبیک اللھم لبیک''

اجنبی کا رحمت بھرا ہاتھ اسے لیے پھر رہا تھا۔ [illegible] کہ گنبد خضریٰ کی جالیوں کے سامنے آ کر وہ تھم [illegible]یا۔ وہ ہاتھ باندھے سنہری جالیوں کے سامنے کھڑا [illegible]۔ اس نے سلام پڑھنے کی کوشش کی لیکن قوتِ گویائی [illegible] سلب ہو گئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ایک ذرّہ ہو [illegible] اسے ایک بہت بڑے بگولے نے اپنے حلقۂ اثر [illegible]لے رکھا ہے۔ آس پاس موجود ہر شے بلند تھی۔ [illegible] شے کی حدِ عرش کو چھو رہی تھی اور وہ بہت چھوٹا تھا۔ [illegible] کی گردن کافی دیر جھکی رہی۔ اچانک زبان کی ساری بندشیں کھل گئیں اور وہ لپک لپک کر بڑے سوز کے ساتھ درود و سلام پڑھنے لگا..... نجانے کتنا عرصہ بیت گیا..... کچھ لمحات یا چند صدیاں۔ وہ زمان و مکان سے بیگانہ کھڑا رہا کہ اجنبی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''آؤ واپس چلیں۔''

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی واپس مڑا تو اجنبی نے ایک کھجوروں والا پیکٹ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا ''یہ اس حاضری کی نشانی ہے، اسے ساتھ لیتے جاؤ۔''

''اچھا، اچھا،'' فیض عالم نے خوشی سے سر ہلایا۔

اجنبی نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ایک دفعہ پھر زمین سرکی اور وہ اسی طرح محو پرواز ہو گیا۔ نجانے کتنے لمحات بیت گئے۔ پھر اس نے خود کو چارپائی پر محسوس کیا۔ اجنبی وہاں موجود نہ تھا۔ فیض عالم کو تسکین کے زبردست احساس نے آ لیا۔ پلکیں کیف سے بوجھل ہو گئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ گہری نیند سو گیا۔

اگلی صبح جب فیض عالم کا بیٹا اور اس کا دوست خانو دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو انتہائی معطّر خوشبو نے ان کا استقبال کیا۔ فیض عالم چارپائی پر دراز تھا۔ چہرے پر ایک خوشگوار مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ خانو اور اس کے بیٹے نے اس کا لباس دیکھ کر بے یقینی میں اپنی آنکھیں ملیں۔ کیونکہ وہ سفید احرام میں ملبوس تھا۔ داہنا ہاتھ بند مٹھی کی صورت میں سینے پر دھرا تھا۔ خانو نے ڈرتے ڈرتے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا، مگر وہ تو نجانے کب کی تھم چکی تھی..... اتنے میں خانو کی نظر فیض عالم کی بند مٹھی پر پڑی..... اس میں کھجوریں دبی ہوئی تھیں۔

■■■

باتیں نئی
تحریریں نئی

روسی شہر سمارا کی سڑکیں 100 گاڑیاں نگل گئیں

اچانک گہرے گڑھے نمودار ہونے سے دو درجن سے زائد گاڑیاں دفن۔شہریوں میں خوف وہراس۔ڈرائیونگ پر پابندی لگادی گئی۔ارضیاتی ماہرین گڑھوں کا جائزہ لینے پہنچ گئے۔

عمیر محمود

روسی شہر کی سڑکیں گاڑیوں کو نگلنے لگیں۔کسی بھی وقت کوئی بھی گاڑی چلتے چلتے اچانک سڑک پر بننے والے بڑے گڑھے میں گر کر غائب ہوجاتی ہے۔شہریوں اور ڈرائیورز میں خوف و ہراس پھیل گیا۔انتظامیہ کی جانب سے کئی متاثرہ علاقوں میں گاڑیاں چلانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے روسی جریدے دی نیشنل کے مطابق سمارا کے حکام نے تصدیق کی ہے کہ یہ یہاں کے باشندے اور ڈرائیور ایک عجیب قسم کے خوف میں مبتلا ہیں کہ کہیں وہ گاڑی چلاتے ہوئے اچانک گاڑی سمیت زندہ درگور نہ ہوجائیں۔کیونکہ ایک ماہ کے دوران سڑکوں کے دھنسنے کے 100 سے زائد واقعات میں دو درجن سے زائد گاڑیاں زمین میں دفن ہو چکی ہیں۔جس کے نتیجے میں ایک شخص ہلاک اور ایک درجن افراد شدید زخمی ہوئے ہیں۔روسی خبر رساں ایجنسی انٹرفیکس کا ایک رپورٹ میں کہنا ہے کہ ایک ماہ کے دوران روسی شہر سمارا میں زمین دھنسنے کے باعث بن جانے والے دیوقامت گڑھوں (Sinkholes) میں دو درجن سے زائد گاڑیاں گر چکی ہیں اور ان میں سوار درجنوں افراد زخمی جبکہ ایک شخص ہلاک ہوا ہے۔انٹرفیکس سے بات چیت میں سمارا کے پولیس سربراہ کا ماننا ہے کہ ان کو ملنے والی اطلاعات میں کہا گیا ہے کہ نصف درجن کاروں کا کوئی اتا پتا نہیں ہے، کیوں کہ وہ درجنوں فٹ گہرے گڑھوں میں گری ہیں اور بعدازاں زمین دوبارہ اپنی جگہ بنا چکی ہے۔اس لئے انہیں ان کاروں کی تلاش میں کوئی کامیابی نہیں مل سکی ہے۔ماسکو میں کام کرنے والی ڈیلی میل کی نمائندہ خصوصی اماندا ولیمز کا ایک رپورٹ میں کہنا ہے کہ یہ واقعات چونکہ تواتر سے سمارا نامی شہر میں پیش آرہے ہیں اس لئے روسی عوام میں بہت خوف وہراس پایا جاتا ہے۔اس حوالے سے برطانوی جریدے ڈیلی میل میں شائع ہونے والی رپورٹ

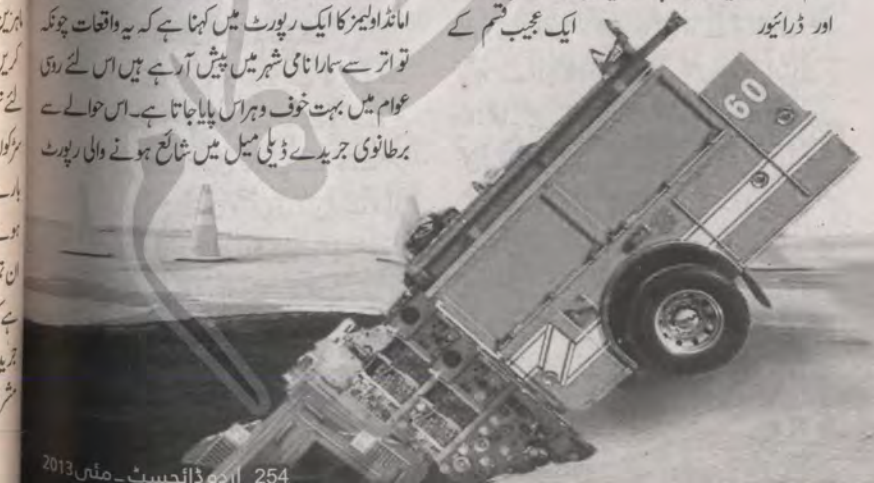

مزید بتایا گیا ہے کہ روس کے جنوب مشرق میں واقع
نامی شہر میں ایک ماہ کے دوران اچانک بننے والے
گڑھوں کی تعداد 100 سے زائد ہوچکی ہے اور اس
کے نتیجے میں شہر بھر میں گاڑیاں چلانے والے ڈرائیور انتہائی
پریشان اور خوفزدہ ہیں۔جبکہ سمارا کی شہری انتظامیہ کا اس
والے سے کہنا ہے کہ وہ خود ایسے واقعات پر پریشانی کا
ہے کیوں کہ ایک جانب شہری خوف وہراس میں مبتلا
تو دوسری جانب سڑکوں کی ٹوٹ پھوٹ سے لاکھوں
کا نقصان ہورہا ہے کیوں کہ تباہ ہو جانے والی
سڑکوں کی مرمت پر خطیر رقوم خرچ کرنی ہوں گی۔روسی
جریدے وائس آف رشیا کے مطابق روسی حکام نے بتایا ہے
کہ اچانک نمودار ہونے والے ان گڑھوں کا سائز بیس فٹ
سے 200 فٹ تک ہے اور حیران کن بات یہ ہے کہ کہیں یہ
گڑھے چٹانی زمین پر نمودار ہوئے ہیں تو کہیں ریتلی زمین
پر۔ان گڑھوں کے باعث درجنوں گاڑیوں کو جزوی نقصان
پہنچا ہے، جبکہ کئی گاڑیوں اور ٹرکوں کو شدید نقصان ہوا ہے۔

وائس آف رشیا کا کہنا ہے کہ سمارا شہر میں ان حیرت
انگیز گڑھوں کے نمودار ہونے کے بعد ماسکو سے ارضیاتی
ماہرین کو سمارا بھیجا گیا ہے جو ان پراسرار گڑھوں کا معائنہ
کریں گے اور اسباب کا جائزہ لے کر اس کے سدباب کے
لئے تجاویز بھی پیش کریں گے۔مقامی میونسپل حکام نے
سڑکوں پر سو سے زیادہ گڑھوں کی نشان دہی کی ہے اور اس
بارے میں کہا جارہا ہے کہ یہ پراسرار گڑھے اچانک رونما
ہوئے ہیں۔شہری انتظامیہ نے ایک حکم نامے کے ذریعے
ان تمام مقامات پر گاڑیاں چلانے کی پابندی عائد کر دی
ہے کہ جہاں بڑے گہرے گڑھے بن گئے ہیں۔روسی
جریدے پراودا کا کہنا ہے کہ دارالحکومت ماسکو سے جنوب
مشرق میں واقع سمارا شہر میں بعض گڑھے اس قدر بڑے
اور گہرے ہیں ان میں بڑے سائز کے ٹرک گر چکے ہیں
اور انہیں نکالا نہیں جاسکا ہے کیوں کہ یہ پچاس فٹ سے سو
فٹ گہرائی میں پہنچ چکے ہیں، جس پر روسی ماہرین ارضیات
نے حیرت کا اظہار کیا ہے، لیکن ایک روسی جیولوجسٹ
گریگوری مارکوف کا کہنا ہے کہ زمین کی گہرائی میں موجود
پانی کی سطح بڑھی ہوئی ہے، شدید سردی میں جب اس
علاقے میں سڑکوں سمیت ہر طرف برف جمی ہوئی تھی تو
اندر موجود پانی بھی قدرے جما ہوا تھا لیکن گرمی کی آمد پر
اندر موجود پانی نے مٹی کو بھربھرا کر دیا ہے۔زمین کے اوپر
سڑکوں پر چلنے والے ٹرکوں اور گاڑیوں کے وزن کے
باعث سڑک کے نیچے موجود چونے کے پتھر اور چکنی مٹی جو
بھربھری ہوچکی تھی بالکل ہی بیٹھ گئی اور زمین پر بڑے
بڑے ہول بن گئے کئی روسی ماہرین ارضیات کا استدلال
ہے کہ sinkholes کے بننے کی ایک بڑی وجہ اس شہر
کے اطراف کی جانے والی مائننگ (سرنگوں کی کھدائی) ہے
جس کے باعث زمین کے اندر پانی کی کمی ہوجاتی ہے اور
ارضیاتی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔روسی ماہرین کا کہنا
ہے کہ یہ نیا شہر ہے اور اس میں تیزی سے آبادی پھیل رہی
ہے۔لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ لاکھوں سال میں ایسی ارضیاتی
تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور سمارا شہر کا المیہ بھی یہی
ہے کہ یہاں اس وقت ارضیاتی تبدیلیوں کا عمل جاری ہے۔

روسی خبر رساں ادارے پراودا سے بات چیت میں
سمارا کے ایک رہائشی نوجوان نے بتایا ہے کہ نواحی علاقوں
میں زمین کے اندر گڑھے بننے کا عمل زیادہ تیزی سے ہورہا
ہے اور اس علاقے میں کئی ایسے گھر ہیں جو ٹوٹ پھوٹ کا
شکار ہوچکے ہیں، اس لئے ہم نے ایک پٹیشن میئر کے
دفتر میں جمع کروائی ہے جس میں اس انوکھے لیکن انتہائی
خوفناک مسئلے کے حل کا مطالبہ کیا ہے۔

مزدور کی پیشانی پر

بہتا ہے پسینہ

چوہدری عبدالخالق

اقبالؒ تیرا نام امر ہے

اقبالؒ تو زندہ ہے تیرا نام امر ہے
یہ ارض تیری ہی موجوں کا شمر ہے
تو نے خودی کے راز سے پردہ اٹھا دیا
دنیا میں ہمیں شان سے جینا سکھا دیا
جو بیج تم نے بویا تھا آج شجر ہے
غفلت کی نیند سوئے تھے تم نے جگا دیا
منزل ہے اپنی کون سی رستہ دکھا دیا
تم سنگ میل بن گئے یہ سب کو خبر ہے
قائد نے تیرے خواب کی تعبیر ڈھونڈ لی
سب سے حسین دنیا کی جاگیر ڈھونڈ لی
اپنے وطن کی ہر صبح خوش رنگ سحر ہے
مل جاتا ہے بے لوث اگر میر کارواں
اس قوم کے پاؤں تلے ہوتا ہے آسماں
کیا خوب تیرا فلسفہ کیا نقطہ نظر ہے
اقبالؒ تو زندہ تیرا نام امر ہے
یہ ارض وطن تیری ہی موجوں کا ثمر ہے

مزدوروں کا عالمی دن

مزدور کی پیشانی پہ بہتا ہے پسینہ
ہر قطرہ اس پسینے کا انمول نگینہ
مزدور ہی اک قوم کی قسمت کو سنوارے
طوفان میں آئی کشتیاں لاتا ہے کنارے
یہ معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کا کام دے
مزدور ہی اک ملک کو دنیا میں نام دے
سب کارخانے دیس کے چلاتا ہے مزدور
مشکل کی ہر گھڑی میں کام آتا ہے مزدور
پُل سڑکیں گزر گاہیں بناتا ہے مزدور
شہروں کو بستیوں کو بساتا ہے مزدور
موسم کی سختیوں سے دن رات یہ لڑے
دھرتی کا سینہ چیر کے روزی یہ سب کو دے
کوزے میں آج دریا میں کر رہا ہوں بند
محنت کشوں کو کرتے تھے حضور ﷺ بھی پسند
ہم بھی محبتوں کا اس کو پیغام دیں
یہ فخر کرے جس پر ایسا انعام دیں

اصل میں ڈائیٹ ہے کیا؟

نوشین ناز
نیوٹریشنسٹ / ماہر غذائیت

ڈائیٹ، لفظ تو سبھی نے سن رکھا ہے مگر اسے جانتے کم کم ہیں اسی لیے ڈائیٹ کو کتنی ہی غلط فہمیوں نے گھیر رکھا ہے

میں پوری یکسوئی اور اطمینان سے کہتی ہوں کہ ”محنت کرنا کمال نہیں ہے، مسلسل محنت کرنا کمال ہے“۔ اس لئے plan پر جانا کمال نہیں ہے بلکہ مسلسل اُسے پابندی سے کرنا کمال ہے“۔

کچھ حاصل کرنے کے لئے مسلسل محنت کرنا لازم ہے اور یہ محنت بے شک مقدار میں کم ہو لیکن مسلسل ہونی چاہیے۔

اپنی زندگی میں ہلکی پھلکی ورزشوں کو ضرور جگہ دیں۔ جہاں ہم گھنٹوں کے حساب سے ٹی وی، پارلر، گوسپ کو ٹائم دیتے ہیں اُسی طرح ہمیں کم از کم آدھ سے ایک گھنٹہ اپنی فزیکل ایکٹویٹی کو ٹائم دینا چاہیے۔

کچھ بے حد اہم اور ضروری ورزشیں بتا رہی ہوں ان کو اپنی روٹین میں شامل کریں بہت سلو ٹیمپو کی یہ ورزشیں آپ کے جسم کو tone کرنے میں مدد دیں گی۔

ورزش نمبر 1:۔

اس ورزش کے ذریعے آپ گردن اور پشت کے کھچاؤ کو کم کر سکیں گے اور آپ کے کولہوں، کمر اور جسم کے درمیانی حصے کو متوازن اور مضبوط بنا دے گی۔ ورزش کا طریقہ کار یہ ہے کہ دونوں پاؤں میں قدرے فاصلہ رکھ کر کھڑی ہو جائیے، آپ کے دونوں ہاتھ گردن کی پشت پر ہوں۔ اوپر کی پوزیشن کو برقرار رکھتے ہوئے آپ اپنی کمر کو بائیں طرف جھکا سکتی ہیں۔ اور اس طرح سے پچھلی طرف کو جھکیے تین سے لے کر پانچ مرتبہ ایسا کریں۔ یہ ورزشیں مسلسل ایک ماہ کرنے سے آپ کا جسم کافی متوازن اور پرکشش ہو جائے گا۔

ورزش نمبر 2:۔

یہ ورزش نہ صرف آپ کے جسم کو متوازن بنائے گی بلکہ آپ کے مسلز کو رواں کرنے میں آپ کی معاون ثابت ہو گی۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کو کرسی یا میز کے سرے پر رکھ کھڑی ہو جائیں سر کو اوپر کی طرف رکھیئے۔ جسم کمر سے آگے کی طرف جھکا

ہوا ہو۔ اس پوزیشن میں بازو، گھٹنے اور اپنی پشت بالکل سیدھی رکھیں۔ اوپر کی پوزیشن برقرار رکھتے ہوئے سر کو نیچے کیجئے اور اوپر اٹھا دیجئے۔ اس عمل کو پندرہ بیس منٹ تک دہرانے کیلئے کچھ منٹ ستا لیں۔

ورزش نمبر 3:۔

یہ ورزش بازوؤں اور کندھوں کو مضبوط اور متوازن بنانے کے لئے بے حد مفید ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ سیدھی کھڑی ہو جائیں اور کمر کو بالکل سیدھا رکھیں۔ ٹانگیں آپس میں اٹکھی ہوں اور دونوں ہاتھوں میں ایک ایک خالی بوتل لے کر بازوؤں کو دونوں طرف پورا پھیلا دیں۔ دونوں بازوؤں کو دائرے کی شکل میں گھمائیے۔ یاد رکھیں کہ جسم کا کوئی دوسرا حصہ نہ ہلائیں۔ ایک منٹ کیلئے یہ عمل جاری رکھیں اور پھر مخالف سمت کو دائرہ بنائیں اور اس طرف بھی ایک منٹ یہ عمل کریں۔ آپ یہ ورزش پچیس منٹ تک کر سکتی ہیں۔

قارئین اور میرے کلائنٹ اکثر مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اگر آپ ہمارے پلان میں روٹی اور آلو بھی ڈال رہی ہیں تو اس میں ڈائیٹ کہاں ہے۔ اس لمحے دل میں تو وہ بیچارے تقریباً مجھ سے مایوس ہی ہونے کو ہوتے ہیں۔ پھر میں انہیں بتاتی ہوں کہ ڈائیٹ کیا ہے؟ کیا diet یہ ہے کہ ہم وزن کم کریں، صحت کم کریں، انرجی کم کریں، میٹا بولک ریٹ کم کریں، کیا یہ ڈائیٹ ہے؟ یا ڈائٹ کا اصل تصور جو اس خیال سے مختلف ہے۔

میں نے تو زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے یہ سیکھا ہے کہ خوراک جو آپ ساری زندگی کھا سکیں وہ ہے ڈائیٹ۔ ڈائیٹ وہ ہے جو آپ کے جینز، آپ کی پسند ناپسند، آپ کے کام کے مطابق اور آپ کے ایکٹویٹی لیول کے مطابق ہو تاکہ آپ اپنی زندگی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کر سکیں۔

(جم کی مالکن کا تحفہ)

کچھ ماہ پہلے ایک مشہور جم کی مالکن لڑنے کو کھڑی ہو گئیں۔ ایک پارٹی میں وہ مجھ سے ملیں۔ وہ بحث کرنے کے موڈ میں تھیں۔ کہنے لگیں کل کی بچی جتنی تمہاری عمر ہے میرا تو اتنا experience ہے تم نے میری نواسی کو کس کام پر لگا دیا ہے۔ جب دیکھو پلیٹ پکڑے ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی ہے۔ گھر میں جم ہے۔ اس طرف نہیں آتی۔

آنٹی کا غصہ ان کے نظریے کے مطابق درست تھا۔ دیکھیں میں اُسے زبردستی بلا کر پلان نہیں دے رہی وہ خود اپنی خوشی اور مرضی سے آ رہی ہے۔ اگر اُس کا وزن اتنا کھانے سے بڑھتا ہے تو میرا نمبر اور کلینک ٹائم آپ کی بیٹی کو پتا ہے آپ ٹائم لے کر تشریف لے آئیں۔ میں نے بے حد پُرسکون لہجے میں کہا تھا۔ وہ مزید کچھ کہہ نہ سکیں تھیں۔ اگلے ہی پیر کو نانی اور اُنکی تیرہ سالہ نواسی جویریہ آئیں تو پہلے وہ خاموش رہیں۔ انہیں اپنے جملے یاد تھے ان کی نواسی نے ماشاء اللہ 10 کلو وزن گرا لیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ خود کو energetic محسوس کرتی ہے۔ وہ بہت خوش تھی کہ اُس کے بال گرنا بند ہو گئے ہیں۔ وہ بے پناہ خوشی اور اعتماد سے بتا رہی تھی کہ ڈاکٹر آپی اب سکول میں میرا مذاق نہیں بنتا کہ تمہاری تو نانی کا اپنا جم ہے اور تمہارا وزن کم کیوں نہیں ہے۔ اب میں بہت خوش ہوں۔ نانی نے دل بڑا کیا۔ مسکرانے کی کوشش کی اور اپنے رویے کی معافی چاہی۔ میں نے بے دلی سے مسکرا کر Its ok کہنے کی بجائے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا اللہ کی اس بنائی ہوئی کائنات میں

سارے راز، خوبیاں اور خوب صورتیاں بکھری ہوئی ہیں ان کو ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ یہ سن کر وہ اپنے جم ممبرز کیلئے مجھ سے پلان مانگنے لگیں۔ ایک بار پھر وہ غلط بات پر اصرار کر رہی تھیں اور ایک ہی پلان پر سب کو ہانکنے کے موڈ میں تھیں۔ انہیں سمجھایا کہ آنٹی پلان عمر، وزن اور ایکٹویٹی لیول کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ آپ پلیز یہ crime جیسا کام کبھی نہ کریں۔ میں کہے بنا نہ رہ سکی تھی۔ اس بار وہ کھل کر مسکرائیں تھیں۔ غالباً بات اُن کی سمجھ میں آ چکی تھی۔

اہم کال:۔

مجھے اسلام آباد سے ایک کال آئی، عالیہ تھیں وہ میرے ایک پلان کو پڑھ کر وزن کم کر چکی تھیں۔ کہنے لگیں مجھے قبض کا مسئلہ بہت زیادہ ہو گیا ہے، وہ رونے والی تھی۔

کیا میں نے آپ کو پلان کر کے دیا تھا؟ میں نے اپنے حافظے پر زور دیا تھا۔ ''نہیں میں نے آپ کے کسی کالم سے پڑھ کر خود ہی کر لیا، مسئلہ یہ ہے کہ وزن تو بڑا اچھا کم کر لیا ہے لیکن قبض بہت ہو گئی ہے۔

استغفر اللہ!! بی بی ہزار بار کہا ہے کہ سب کی عمر، قد، وزن اور فزیکل ہسٹری کے لحاظ سے الگ پلان ہوتا ہے پھر ہر ماہ پلان بدلنا بھی لازم ہے۔ آپ سب کو میں کہتی ہوں کریزی نہ بنا کریں۔ اب یوں کسی کا پلان اٹھا کر کوئی بھی پلان خود پر اپلائی کر لیں گی تو مشکل تو ہو گی ہی۔ اس طرح اپنی صحت سے نہ کھیلیں۔ Diet Plan بھی ایک دوا کی طرح ہوتے ہیں جو سب پر اپلائی نہیں ہو سکتے۔ کبھی کبھی تو فائدہ کے بجائے نقصان ہو جاتا ہے۔

ہاں کچھ سیدھے سادھے اُصول تو سب پر لاگو ہیں مثلاً فاسٹ فوڈ نہیں کھانا اس کو avoid کرنا۔ اور متوازن غذا اور مناسب دُودھ پانی کا استعمال اور ورزش ہیں یہ سب کر سکتے ہیں لیکن یوں کسی کا پلان اٹھا کر استعمال نہ کریں۔ اس میں کسی اور کا نہیں آپ کا ہی فائدہ ہے۔

آپ اپنا مسئلہ خط میں لکھ کر اردو ڈائجسٹ کے پتے پر بھجوا دیا کریں۔ باری آنے پر انشاء اللہ جواب مل جائے گا۔

آپ کے خطوط میں آئے سوالات۔

س: میری عمر 33 سال ہے میرے بال بہت healthy تھے لیکن اب بہت پتلے ہو گئے ہیں۔ مجھے کوئی آسان حل بتائیں۔ (منزہ شرجیل شاہ۔ کراچی)

جواب: بالوں کا گرنا موسم کے بدلنے سے، عمر یا پھر نئے بالوں کے آنے کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ بالوں کا گرنا اور اس کا treatment سپیشل کیئر مانگتا ہے۔ poor diet بہت زیادہ chemicals اور cosmetics، ہارمونل چینجز، سٹریس، anxiety اور فیبل سٹریس یہ سب بال گرنے کی وجوہات hair fall ہو سکتی ہیں۔ آپ اپنی خوراک میں گرین leafy سبزیوں کا، سلاد، دُودھ فروٹ اور sprouts کا استعمال کریں۔ بہت ساری پروٹین دودھ، بٹر ملک، wheat، سویابین، ہول گرین اور nuts کا استعمال پورشنز میں استعمال کریں۔ اس کے علاوہ اپنی scalp پر نرمی سے مساج کریں۔ (کوکونٹ آئل یا پھر بادام کے تیل کا دس پندرہ منٹ daily) پھر نیم کے پتوں کو دھو کر اُبال لیں اس پانی کو ٹھنڈا کر کے اپنے ہیئر واش کریں۔ وٹامن بی (B) اور E کا استعمال بھی کریں۔ سجدہ لمبا کیا کریں۔

س: مجھے یہ پوچھنا تھا کہ کھیرے اور ککڑی میں کیا فرق ہے؟ کس کی سلاد ویٹ لاس کے لئے اچھی ہے؟

نمرہ۔ کراچی

ج: ککڑی کو Armenian cucumber بھی کہتے ہیں۔ کھیرے اور ککڑی میں بہت معمولی سا فرق ہوتا ہے۔ ککڑی کھیرے سے ذرا زیادہ nutrients ویلیو کی حامل ہوتی ہے۔ کھیرے میں وٹامن سی، اے، پوٹاسیئم، میگنیشم اور dietry fiber ہوتے ہیں۔ salads کو مین میل کے طور پر استعمال کرنا مشکل ہے۔ لیکن اپنے مین میل سے پہلے اور اپنے hunger pangs میں استعمال کرنا چاہیے۔ لیکن salads تب ہی فائدہ دیتے ہیں جب آپ ان کو dressing کے بنا استعمال کرتے ہیں

س: میں 34 سال کی ہوں میں نے low fat، لو carbdiet لی تھیں اور 10 کلو کم کیا تھا لیکن اب میرے بال اور سکن کا بیڑہ غرق ہوگیا ہے۔ پلیز مجھے کوئی remedy بتا دیں اپنی کنڈیشن کو improve کرنے کی۔

عائشہ ذیشان۔ حیدر آباد کراچی

ج: کسی بھی qualified nutritionist سے رابطہ کئے بغیر کوئی بھی پلان بے حد نقصان دہ ہوتا ہے۔ ایک ایسی غذا جو لوکیلوری ہو لیکن اگر وہ آپ کی غذائی ضرورت پوری نہیں کر رہی تو بہت نقصان دہ ہوتی ہے۔ آپ اپنی غذا پر توجہ دیں پراپر وٹامن لیں۔ اپنی غذا میں olives، چقندر، سیب، پالک، سٹریس فروٹ، cod liver، ڈیری پروڈکٹ سب شامل کریں۔ ساتھ وٹامن سی، ای اور بی کا استعمال ضرور کریں۔ انشاء اللہ کافی بہتری آجائے گی۔

س: میری عمر 37 میرا قد 5 فٹ ہے۔ وزن 95 کلو ہے۔ پلیز میری مدد کریں۔

پروین احمد۔ آزاد کشمیر

ج: صبح اٹھ کر آپ ایک اورنج لے لیں پھر آٹھ بجے آپ ایک براؤن سلائس ایک کپ اسکم ملک ایک کھجور لے لیں۔ صبح کے mid snack ٹائم میں انار یا چار امرود کھا لیں۔

دوپہر کے کھانے میں فوڈ گرین آٹا روٹی کے ساتھ سیزن گھر کا بنا سالن سلاد کی بڑی پلیٹ اور گرین ٹی لے لیں۔

شام کے snake ٹائم میں دودھ کے ساتھ سیب لیں۔ رات ڈنر میں آدھا سیب، ایک پیالی سلاد ایک چھوٹی پیالی چنے اور گرین ٹی لیں۔ یہ ڈنر صرف ایک ماہ کے لئے ہے پھر فوراً بدلوالیں۔

سونے سے پہلے آدھا کپ اسکم ملک لیں۔

وٹامن بی، سی اور ڈی کی tablets ضرور استعمال کریں، ایک گھنٹہ سلو واک کریں۔ نماز میں سجدہ رکوع ٹھیک سے ادا کریں۔ انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔

مبارک ہو۔

سعدیہ ظہور فیصل آباد سے آپ نے 96 سے 90 وزن کر لیا ہے۔ سال لگا کر مسلسل محنت سے آپ کا وزن انشاء اللہ مزید نیچے چلا جائے گا۔

کامران کاشف:۔ آپ نے تین ماہ میں 12 کلو کم کیا ہے بہت اچھا ہے۔ دودھ اور پھلوں کا استعمال جاری رکھیں۔

سدرہ نے ماشاء اللہ 5 کلو وزن کم کیا ہے اور بے حد خوش ہیں جبکہ پروین بتول نے وزن میں 4 کلو کمی نوٹ کی ہے۔ کہہ رہی تھیں زندگی آسان ہوگئی ہے۔

یہ کالم آپ کی زندگی آسان کرنے اور آپ سے دعائیں لینے کا ہی تو ایک بہانہ ہے۔ اپنے خطوط اُردو ڈائجسٹ کے پتے پر بھجوایئے، مجھے اور میرے اہل خانہ کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیئے۔

■■■

واہ! ماڈئیر صاب!

نورنگر

ماڈئیر! صاب دوروپے کے چنے دینا! مجھے چٹنی کے ساتھ

نورالحسن

سال 1985ء میں پہلی بار ایسی بہت سی صدائیں اور آوازیں میں نے سنٹرل ماڈل اسکول لوئر مال کے سامنے سنیں۔ اسکول کا ہر بچہ ہر پھیری والے اور کھانے پینے کی چیزیں بیچنے والوں کو ماڈئیر کہہ رہا ہے۔ اور وہ بھی سودا بیچنے کے لیے جو صدا لگاتے ہیں اُس میں ماڈئیر کا لفظ پہلے آتا ہے۔ مجھے بہت سی دیگر باتوں کی طرح ایسا لگا کہ یہ بات بھی میری سمجھ سے باہر ہے۔ اور پوچھنے سے ہمیشہ کی طرح اب کی بار بھی اس لیے ڈر لگا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ اسے یہ بھی نہیں پتا۔

اظہار محبت ہو سوال ہو یا ہر وہ موقع جہاں ''انا'' اور ''میں'' خطرے میں نظر آئے تو دل کہتا ہے چھوڑیار نکل لے! سو پھر کسی ایسے بہادر آدمی کا انتظار رہتا ہے جو آئے اور پوچھ لے پھر اس کی بدولت مجھے بھی پتا لگ جائے اور جب میں جان جاؤں تو دوسرے پوچھنے والے کو یہ کہوں کہ تمھیں اتنا بھی نہیں پتا! کسی کو یہ کہنے میں بھی بڑی گھٹیا تسکین ملتی ہے بڑی فضول ہولی سی تسکین! ہاں تو اسکول میں داخلے کے بعد سب سے زیادہ شوق اس بات کا ہوا کہ میں بھی ماڈئیر بولوں کسی سے۔ کبھی یہ سنا تھا کہ اگر زیادہ لوگ مل کر گا رہے ہوں تو پتا نہیں لگتا برا کون گا رہا ہے۔ اسی طرح زیادہ لوگ شور کر رہے ہیں تو پتا نہیں لگتا زیادہ شور کا باعث کون ہے۔ اجتماعی عبادات بھی بہت سے گنہگاروں کے عیب ڈھانپ لیتی ہیں سو میں بھی ماڈئیر ماڈئیر کرنے لگا۔ پھر سجاد مغل جو میرا ہم جماعت تھا جسے سب سجاد میغل کہا کرتے تھے کہنے لگا دیکھو تو سب کو کیا ہوگیا ہے کہا تو یہ تھا کہ سب اوئے توئے یا کسی اور نام سے پکارنے کی بجائے My Dear کہا کریں اور تم بھی ماڈئیر ماڈئیر کر رہے ہو یہ لفظ My Dear ہے۔ سجاد کی بات تو میں سمجھ گیا لیکن اُس کا My Dear مجھے ماڈئیر کے مقابلے میں بودا سا ہی لگا۔ میں اپنے نئے سکول کی اس روایت سے بہت خوش بھی ہوا فخر سا بھی کرنے لگا کہ اچھی بات ہے! سب ایک دوسرے کا خیال بھی رکھ رہے ہیں اور محبت اور احترام کے رشتے میں بندھے بھی جا رہے ہیں سب سے مزے کی بات یہ لگی کہ بوٹے چنے والے کی دُکان اس زمانے میں وہاں تھی جہاں آج ڈپٹی کمشنر آفس یا کچہری کی دیوار ہے غالباً ایک تو بوٹے کی دُکان اسکول کے دائرہ اختیار اور دائر کار میں نہیں آتی تھی اس لیے مروجہ قوانین کا اس طرز پر

اطلاق نہیں ہوسکتا تھا لیکن سوال کے طالب علم بوٹا جی کے چنوں کے دیوانے تھے دوسرا بوٹا جی ایک مالدار آدمی تھا اُن کی ہزاروں کی روزانہ آمدنی تھی اور بہت مالدار آدمی کم کم ہی ماڈیئر ہوا کرتا ہے۔ وہ اپنے نام ذات اور عہدے سے ہی پہچانے جانے کی خواہش کرتا ہے! سو ماڈیئر کوئی ایسا جو آپ کو بھی پیارا ہو اور آپ بھی اُسے پیارے ہوں سنٹرل ماڈل سکول لوئر مال نے بھی غضب کا سبق سکھایا نہیں یہ تو نہیں پتا لیکن واہ! کہ ماڑوں سے پیار کروانہیں ماڈیئر کہو اور ان کے ماڈیئر بن جاؤ آج ادھر ادھر نگاہ دوڑائیں تو ماڈیئر پکارنے والے کم ہی ملیں گے۔ ماڈیئر چاہے زبان سے ہی کہا جائے دل شامل نہ ہو تو پھر بھی اپنا اثر رکھتا ہے۔ بابا جی کہا کرتے تھے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ املی کا نام لینے سے تو منہ میں پانی بھر آئے اور اللہ کا فقط نام لینے سے کچھ بھی نہ ہو!

اسی طرح اللہ کی مخلوق اور وہ مخلوق جو بظاہر آسودہ نہ ہو پھوں پھاں والی نہ ہو اور جنہیں اللہ معاف کرے غریب کہہ دیا جاتا ہے جس کی نسبت ضرورت مند، حقدار، تنگ دست کہنا زیادہ بہتر ہے بس مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ کہنے والا کوئی بھی ہو کسی بھی عہدے پر ہو جو ماڈیئر نہیں کہتا تو وہ ماڈیئر کہلاتا بھی نہیں، دل کرتا ہے کہ ماڈیئر کا یہ اصول ملک بھر میں سب جگہ لاگو ہو جائے جو غریبوں کے مسائل کی بجائے ماڈیئر کہیں تو آدھے مسائل ویسے ہی حل ہو جائیں گے اگر سیکھنا اور بولنا مشکل لگے تو اللہ کے ماڈیئر حضرت داتا علی ہجویریؒ کے مزار کے عقب میں واقع سنٹرل ماڈل سکول لوئر لاہور کے سامنے چلے جائیں اللہ کرے آج بھی وہاں ماڈیئر کہنے اور کہلوانے والے موجود ہوں لیکن سنا ہے اب کہ ہائی جینک اور صاف ستھری چیزیں زیادہ دستیاب ہیں اور ماڈیئر کم میرے منہ میں خاک اپنا پاکستان بھی ماڈیئر اور یہاں کے رہنے والے بھی ماڈیئر واہ!

ماڈیئر صاحب واہ! ■■■

Christians & Hindus become Muslim
عیسائی اور ہندو مسلمان ہو رہے ہیں بذریعہ
مسلم صوفی سکالر کلیم صدیقی صاحب
کتاب: آپ کی امانت آپ کی سیوا میں
Book: RETURNING YOUR TRUST
www.armughan.in
phulat.blogspot.com
کتاب: نسیم ہدایت کے جھونکے Winds of Islam
طالب دعا شیخ عاطف پوری اوکاڑہ

ماہِ رواں کی شخصیات

ماہ مئی سے متعلق بہت سی مرتب کیا جانا آپ کے لیے اہم معلومات کا نذرانہ ہے۔

محمد خلیل چودھری (دینہ)

ماہ مئی میں پیدا ہونے والی اہم عالمی و ملکی شخصیات

یکم مئی 1903ء جسٹس اے آر کارنیلیس (سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس)
یکم مئی 1954ء تسلیم عارف (پاکستان کے مشہور کرکٹر)
یکم مئی 1972ء شان (مشہور اداکار)
2 مئی 1940ء فاروق احمد لغاری (سابق صدر پاکستان)
2 مئی 1896ء یوسف سلیم چشتی (شارح اقبالؒ، ادیب، مورخ)
3 مئی 1613ء خوشحال خان خٹک (عظیم پشتو شاعر)
3 مئی 1928ء حسنی مبارک (مصر کے سابق صدر)
4 مئی 1905ء اختر شیرانی (اردو کے نامور شاعر)
4 مئی 1904ء محشر بدایونی (ادیب، شاعر)
4 مئی 1929ء آڈرے ہیپ برن (بالی وڈ کی مشہور اداکارہ)
5 مئی 1936ء پروین فنا سید (اردو کی مشہور شاعرہ)
6 مئی 1475ء مائیکل اینجلو (اطالوی مجسمہ ساز، مصور، شاعر)
6 مئی 1861ء موتی لال نہرو (کانگریسی رہنما)
6 مئی 1962ء مقصود وفا (اردو شاعر)
7 مئی 1893ء ملک فیروز خاں نون (سابق پاکستانی وزیراعظم)
7 مئی 1964ء رضی الدین رضی (ممتاز اردو شاعر)
8 مئی 1908ء آئین فلیمنگ (جیمز بانڈ کے خالق)
8 مئی 1938ء جاوید برکی (پاکستان کے مشہور کرکٹر)
9 مئی 1866ء گوکھلے (برصغیر کے نامور سیاستدان ماہر تعلیم اور مصلح)
10 مئی 1953ء پروین جاوید (اردو شاعرہ)
10 مئی 1958ء توصیف احمد (سابق ٹیسٹ کرکٹر)
11 مئی 1912ء سعادت حسن منٹو (اردو کے نامور افسانہ نگار)
12 مئی 1899ء مرتضیٰ احمد خان میکش (ممتاز صحافی)
13 مئی 1905ء فخر الدین علی احمد (بھارت کے سابق صدر)
13 مئی 1948ء نواب عبدالغنی تالپور (سندھ کے سیاستدان)
13 مئی 1950ء اسحٰق ڈار (پاکستان کے معروف سیاستدان)
14 مئی 1949ء اصغر ندیم سید (معروف شاعر، کالم نگار، ڈراما نگار)
15 مئی 1930ء نصیر بندہ (ہاکی کے مشہور اولمپین کھلاڑی)
16 مئی 1922ء رشید احمد لاشاری (سندھی زبان کے ادیب)
16 مئی 1942ء ڈاکٹر انتھونی ڈبلیو (امریکی سائنسدان، خلاباز)
17 مئی 1955ء حاجی عبدالرزاق نیسنی (عالمگیر ویلفیئر کے ٹرسٹی)
18 مئی 1922ء ڈاکٹر وزیر آغا (شاعر، انشا پرداز، محقق)
18 مئی 1950ء حسرت نعمانی (اردو شاعر اور نقاد)
19 مئی 1890ء ہو چی منہ (ویت نام کے عظیم انقلابی رہنما)
19 مئی 1924ء رضیہ بٹ (اردو کی ممتاز ناول نگار)
19 مئی 1939ء ذوالفقار احمد تابش (شاعر، دانشور)
20 مئی 1799ء آنرے دے بالزاک (مشہور فرانسیسی ادیب)
20 مئی 1806ء جان اسٹوارٹ مل (مشہور فلسفی)
20 مئی 1952ء اعجاز الحق (فرزند جنرل ضیاء الحق، سابق وفاقی وزیر)
21 مئی 1688ء الیگزینڈر پوپ (مشہور انگریز شاعر)
21 مئی 1916ء ہیرالڈ روبنز (انگریز ناول نگار)
21 مئی 1928ء جسٹس فخر الدین جی ابراہیم (قانون دان، چیف الیکشن کمشنر)
21 مئی 1973ء میرا (فلمی اداکارہ)
23 مئی 1733ء فرانز میسمر (مسمریزم کے بانی)
24 مئی 1819ء ملکہ وکٹوریہ (برطانوی ملکہ)
25 مئی 1899ء قاضی نذر الاسلام (مشہور بنگالی شاعر)
26 مئی 1990ء عمر اکمل (مشہور ٹیسٹ کرکٹر)
27 مئی 1935ء ڈاکٹر انور سجاد (افسانہ، ڈرامہ نگار، معالج)
28 مئی 1908ء آئین فلیمنگ (جیمز بانڈ کے خالق)
29 مئی 1982ء فاطمہ بھٹو (میر مرتضیٰ بھٹو کی صاحبزادی)
30 مئی 1959ء کرن سنگھ (اردو اور سندھی کے ادیب)

ماہ مئی میں وفات پانے والی اہم عالمی و ملکی شخصیات

یکم مئی 1982ء میر رسول بخش تالپور (صوبہ سندھ کے سابق گورنر)
یکم مئی 1993ء عظیم احمد طارق (مہاجر قومی موومنٹ کے چیئرمین)
2 مئی 1911ء سید علی بلگرامی (شمس العلماء، عالم دین، مترجم)
3 مئی 1912ء ڈپٹی نذیر احمد (اردو کے نامور ادیب)
3 مئی 1481ء سلطان محمد فاتح (فاتح قسطنطنیہ اور ترکی کے خلیفہ)
4 مئی 1799ء ٹیپو سلطان (جنگ آزادی کا ہیرو)
4 مئی 1963ء شوکت تھانوی (اردو کے مزاحیہ ادیب)
4 مئی 1969ء ضیاء الدین احمد برنی (اردو کے معروف ادیب اور صحافی)
5 مئی 1829ء نپولین بوناپارٹ (فرانس کا بادشاہ)
5 مئی 2008ء امین طارق قاسمی (ماہر تعلیم اور شاعر)
5 مئی 2006ء صابر براری (ممتاز شاعر)
6 مئی 1952ء ڈاکٹر ماریا مونٹیسوری (نرسری طریقہ تعلیم کی بانی)
6 مئی 1972ء سراج الدین ظفر (اردو کے نامور شاعر)
6 مئی 2009ء ڈاکٹر وحید عشرت (معروف ماہر اقبالیات)
7 مئی 2002ء ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک (ممتاز عالم دین، مفسر قرآن)
7 مئی 2005ء میاں معراج الدین (پنجاب کے سابق وزیر)
8 مئی 1903ء جسٹس سید محمود (سرسید احمد خان کے صاحبزادے)
8 مئی 2005ء صادق الاسلام (مشہور براڈ کاسٹر اور گلوکار)
8 مئی 2005ء غلام نبی کلو (مزدور کسان پارٹی کے رہنما)
9 مئی 1958ء ڈاکٹر خان صاحب (مغربی پاکستان کے سابق وزیر اعلیٰ)
9 مئی 2008ء فیروز دستور (نامور گائیک)
9 مئی 2005ء اظہار حیدر رضوی (مشہور ماہر قانون)
10 مئی 1999ء ڈاکٹر اقبال احمد (نامور دانشور اور محقق)
10 مئی 1918ء سید احمد دہلوی (فرہنگ آصفیہ کے مرتب و مدون)
11 مئی 1937ء حضرت مہر علی شاہ گولڑوی (ممتاز صوفی بزرگ)
11 مئی 1993ء سردار شیر محمد مری (مشہور بلوچ سیاستدان)
12 مئی 1999ء ضمیر جعفری (نامور شاعر، مزاح نگار)
13 مئی 1951ء مولانا حسرت موہانی (اردو کے ممتاز شاعر)
14 مئی 1852ء حکیم مومن خاں مومن (مشہور اردو فارسی شاعر)
14 مئی 2009ء ڈاکٹر خیال امروہوی (ممتاز شاعر اور نقاد)
15 مئی 2008ء ابوالخیر کشفی (معروف ادیب اور ماہر تعلیم)
15 مئی 2002ء محمد سعید شیخ (معروف ماہر تعلیم اور مصنف)
16 مئی 1983ء قاری مولانا عبدالکریم قادری (نامور قاری، شیخ القرار)
17 مئی 1954ء بلبل چودھری (پاکستان کے نامور رقاص)
17 مئی 1971ء محمد حسین شوق (اردو شاعر اور ماہر تعلیم)
18 مئی 1973ء چودھری خلیق الزماں (تحریک پاکستان کے رہنما)
18 مئی 1988ء اقبال ساجد (اردو کے ممتاز شاعر)
19 مئی 1989ء ولیم گلیڈ اسٹون (برطانیہ کا نامور سیاستدان)
19 مئی 1817ء انشاء اللہ خان انشاء (مشہور فارسی اردو شاعر، نثر نگار)
21 مئی 1991ء راجیو گاندھی (بھارت کے سابق وزیر اعظم)
21 مئی 1930ء مہاراجہ صاحب آف محمود آباد محمد علی خان (سیاسی رہنما)
22 مئی 1845ء شیر شاہ سوری (برصغیر کا سابق حکمران)
22 مئی 1993ء مقبول بیگ بدخشانی (اردو ادیب اور محقق)
23 مئی 1960ء گاما پہلوان (برصغیر کے مشہور پہلوان)
24 مئی 1543ء نکولاس کوپرنیکس (جدید علم ہیئت کے بانی)
24 مئی 1978ء شیخ عبدالمجید سندھی (سندھ کے معروف سیاسی رہنما)
24 مئی 1985ء مولانا سید احمد اکبر آبادی (ممتاز عالم دین)
24 مئی 1985ء مولانا مرزا محمد عباس (ممتاز عالم دین)
25 مئی 1977ء جعفر طاہر (اردو کے نامور شاعر)
25 مئی 1984ء موہن سنگھ دیوانہ (پنجابی شاعر)
26 مئی 1987ء غوث بخش رئیسانی (بلوچستان کے سابق گورنر)
26 مئی 1993ء رانی (پاکستان کی نامور فلمی اداکارہ)
27 مئی 1964ء جواہر لال نہرو (بھارت کے پہلے وزیر اعظم)
27 مئی 1948ء باب رپلے (کارٹون مانیں نہ مانیں سلسلے کا خالق)
27 مئی 1967ء شاہد احمد دہلوی (اردو کے ادیب اور ماہر موسیقی)
28 مئی 1972ء ایڈورڈ ہشتم (برطانوی بادشاہ)
29 مئی 1988ء مولانا منتخب الحق قادری (نامور عالم دین)
29 مئی 1989ء بریگیڈیئر طارق محمود (پاک فوج کے مایہ ناز کمانڈو)
30 مئی 1593ء کرسٹوفر مارلو (مشہور انگریز ڈرامہ نگار)
31 مئی 1910ء الزبتھ بلیک ویل (دنیا کی پہلی خاتون ڈاکٹر)

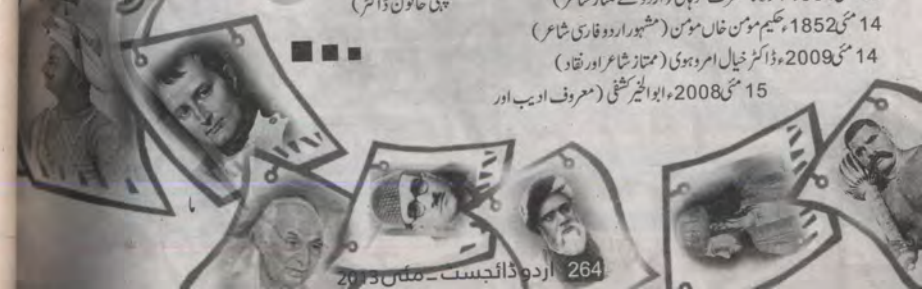

مشورہ حاضر ہے

صغیرہ بانو شیریں

دھوپ سے سوزش

مجھے کام کے سلسلے میں پیدل چلنا پڑتا ہے۔ سردی میں مسئلہ ٹھیک رہتا ہے۔ مگر اب جیسے جیسے گرمی آئے گی میرا چہرہ دھوپ سے جھلس جائے گا۔ سوزش ہوتی ہے، بعض دفعہ ایسا لگتا ہے میرے ہاتھ اور چہرہ سوزش سے پھٹ جائیں گے۔ میری عمر 30 سال ہے اس کے لیے بتائیے۔

(حمید اللہ، شمالی علاقہ جات)

دھوپ کی تمازت سے جسم جھلس جاتا ہے۔ جفاکش لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں۔ آپ گھر سے جب نکلیں تو پانی پی کر چلیں اور ایک پانی کی بوتل ساتھ رکھیں۔ پانی پیتے رہیں، گھیکوار کے پودے آپ کے علاقے میں ضرور ہوں گے۔ کیونکہ یہ پودا ہر جگہ لگ جاتا ہے۔ آپ اپنے چہرے اور ہاتھوں پر اس کا گودا اچھی طرح مل کر خشک ہونے دیں۔ گھیکوار کی شاخ بیچ میں سے کاٹیں، پیلا پانی صاف کریں اور چھری سے گودا نکال کر اچھی طرح لگائیں۔ جیسے کریم لگاتے ہیں اور بس شام کو گھر آ کر بھی دوبارہ اسی طرح گھیکوار کا گودا مل کر سو جائیں۔ چار پانچ دن میں سوزش، جلن، درد، گرمی دور ہو جائے گی جب بھی دھوپ میں کام کریں گھیکوار لگالیں۔ بلکہ اس کا چھوٹا سا ٹکڑا آپ کھا بھی سکتے ہیں۔ پانی زیادہ سے زیادہ پئیں۔ کوشش کریں کہ سر پر کوئی رومال یا کپڑا رکھ کر باہر جائیے تاکہ دھوپ کی تپش براہ راست نہ پڑے۔

میں نے ایسے جفاکش پہاڑی لوگوں کو دیکھا ہے جو مخمل کے دوپٹے کی تہہ لگا کر گیلا کر کے اس کے اندر درخت کے ہرے پتے رکھ کر سر پر رکھ لیتے ہیں۔ ہرے پتے بھی

دھوپ کی تپش کم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ چہرے کو سکون ملتا ہے۔

منہ میں پانی آتا ہے

پچھلے دنوں بیمار رہی، شاید دواؤں کے اثرات ہیں کہ ہر وقت میرے منہ میں پانی آتا ہے۔ اس سے بوریت ہوتی ہے۔ اس کے لیے بتائیں۔ (شمسہ عرفان)

منہ میں پانی آنے کی کئی وجوہات ہیں۔ آپ کا ہاضمہ بھی خراب ہے، کھانا بھی جلدی ہضم نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے آپ کو بار بار ایسا لگتا ہے کہ کھانا حلق میں آرہا ہے۔ دوائیاں تو آپ بہت کھا چکیں آپ قدرتی علاج کریے۔ جامن کا موسم ہے۔ صبح دس بجے ایک بڑا پیالہ بھر کر جامن کھائیں، شروع میں آپ تھوڑے جامن بھی کھا سکتی ہیں۔ اس کے کھانے سے آپ کو بہت سکون ملے گا۔ معدہ کی کمزوری دور ہو گی، جلن اور خراش میں کمی ہو گی۔ کھانا ہضم ہوگا۔ بار بار واش روم بھی نہیں جانا پڑے گا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ منہ میں پانی آنا بھی بند ہو جائے گا۔ آپ قدرت کے اس چھوٹے سے پھل کی خود تعریف کریں گی۔ آپ کا معدہ ٹھیک ہوگا تو صحت بھی بہتر ہو جائے گی۔

ناریل

مجھے ناریل بہت پسند ہے۔ آپ سے مجھے یہ پوچھنا ہے حمل کے دوران اور بعد میں بھی اسے کھا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں، ناریل نہیں کھانا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ اسے بھون کر کھانا مفید ہے یا ویسے ہی۔ اور بچے کو دودھ پلانے کے دوران بھی اسے کھایا جاسکتا ہے؟ (راحیلہ اعوان)

ناریل تو بڑے مزے کا ہوتا ہے۔ ناریل توڑنے پر اس کے اندر سے ایک پھول نکلتا ہے۔ وہ بھی مزے کا ہوتا ہے۔ دل کے لیے مفید ہوتا ہے، ڈھیر سارے ناریلوں میں سے دو تین پھول نکلتے ہیں۔ تازہ ناریل کا پانی بھی گلاس بھر پئیں۔ سوکھا ناریل تو کھانے میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ ناریل کاٹ کر ٹکڑے توے پر ہلکا سا بھون کر اس میں بھنی ہوئی سونف، مصری چھوٹی الائچی ملا کر کھاتے ہیں۔ رہی بات حمل کی، تو بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں، حمل کے شروع میں اگر ناریل کھایا جائے تو بچہ گورا ہوتا ہے۔

حمل کے آخری دنوں میں ناریل اور بادام پیس کر چینی ملا کر بوتل میں رکھیں۔ صبح شام چمچہ بھر دودھ کے ساتھ کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ بچہ کی ولادت کے بعد ثابت ناریل میں تھوڑا سا سوراخ کر کے گوند وغیرہ بھر کے اس پر گیلا آٹا لپیٹ کر تنور میں رکھوائیں۔ بعد میں آٹا ہٹا کر ناریل کوٹ لیں اور اس میں میوہ جات کوٹ کر ملائیں۔ بہت لذیذ اور قوت بخش ہوتا۔ آپ بچے کی ولادت کے بعد بھی تھوڑا ناریل کا ٹکڑا کھا سکتی ہیں۔ بچے کی اور آپ کی صحت ٹھیک رہے گی۔

پالک

مجھے پالک اچھی لگتی ہے۔ آپ سے یہ پوچھنا ہے ل کے دوران کھا سکتی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ بچہ نے کے بعد بھی اسے کھانے میں کوئی حرج تو ہیں۔ ہمارے ہاں کہا جاتا ہے پالک کھانے سے بچوں کو ہرے رنگ کا موشن آتا ہے۔ کیا دودھ پلاتے وقت پالک نقصان دیتی ہے؟ (امینہ)

آپ سے کس نے کہہ دیا۔ حمل کے دوران اور ولادت کے بعد پالک نہیں کھانا چاہیے۔ پالک میں تو فولک ایسڈ ہوتا ہے۔ آپ کو پتا ہے فولک ایسڈ کی کمی ہو تو کئی مسائل مثلاً خون کی کمی وغیرہ سامنے آتے ہیں۔ پالک کھانے سے ماں اور بچہ دونوں محفوظ رہتے ہیں۔ بچہ ضائع ہونے کا خطرہ بھی نہیں رہتا۔ پالک میں آئرن ہے، وٹامن اے اور ایسڈز وغیرہ ہونے سے یہ صحت کے لیے مفید ہے۔ پالک کھانے سے قبض بھی نہیں ہوتا اور حمل کے دوران خواتین کو جو شکایات ہوتی ہیں ان کا ازالہ بھی ہوتا ہے۔ کام کاج سے تھکاوٹ نہیں ہوتی، بس ایک بات کا خیال رکھیں کہ پالک کے پتے دھو کر استعمال کریں تا کہ مٹی وغیرہ نکل جائے۔ دوسری بات کہ پالک کو کبھی تیز آنچ پر نہ پکائیں۔ دھیمی آنچ رکھیں، اس میں پانی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ پالک اپنے ہی پانی میں گل جاتی ہے۔ اگر پتھری کی شکایت ہو، گٹھیا کا مرض ہو تو پالک استعمال نہ کریں۔ اپنے ڈاکٹر سے پوچھ لیجیے۔

چہرے کے دانے

تقریباً سات برس سے چہرے پر پھنسیاں نکل رہی ہیں۔ طرح طرح کی کریمیں، لوشن استعمال کیے مگر کوئی فائدہ نہیں۔ اب میرا چہرہ دانوں سے بھر گیا ہے اور چند موٹے دانے تو بہت تکلیف دہ ہیں۔ سارا چہرہ اکڑ گیا ہے، میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ اب میں دوا سے تنگ آ چکی ہوں۔ آپ کوئی گھریلو ٹوٹکہ بتائیں؟ (انیلہ)

اپنی غذا کی طرف توجہ کریں۔ سبزیاں، دہی وغیرہ استعمال کریں۔ قبض بالکل نہ ہونے دیں۔ دن میں آٹھ گلاس پانی کے پئیں۔ چہرے کے ساتھ آپ بہت زیادتی کر چکی ہیں۔ کوئی کریم استعمال نہ کریں، نیم کا صابن مل جائے تو اس سے منہ دھوئیں۔ دہی میں تھوڑا سا ہرا دھنیا کاٹ کر ملائیے۔ ایک پیالہ دہی، دو بڑے چمچ ہرا دھنیا اور تھوڑا سا ابلا ہوا ہرا گھیا ہونا چاہیے۔ چٹکی بھر کالی مرچ اور نمک ڈال کر دوپہر کو کھائیں اور رات کو سونے سے پہلے ہرا دھنیا تازہ لے کر کچل لیں۔ ایک چمچ ہرے دھنیے کا جوس اور اس میں چٹکی بھر کر ہلدی ملائیے۔ دو قطرے زیتون کا تیل ملا کر رکھیں۔ منہ دھو کر خشک کر کے دانوں پر لگائیں۔ تقریباً ڈیڑھ دو ہفتہ لگا کر دیکھیے۔ آپ کے چہرے پر ٹھنڈک پڑے گی۔ آہستہ آہستہ دانے ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہرا دھنیا تازہ ہونا چاہیے۔ ■■■

قصہ کوئز1

قیام پاکستان کے وقت پاکستان نہری پانی کے سلسلے میں تقریباً بھارت کے رحم وکرم پر تھا۔ آزادی کے بعد بہت سے اہم آبی وسائل اور ہیڈ ورکس بھارت کے حصے میں چلے گئے، اس لیے پاکستان کی زراعت کا متاثر ہونا لازمی امر تھا۔ بھارت نے تمام بین الاقوامی قوانین و آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یکم اپریل 1948ء میں پاکستان کی ان نہروں کا پانی بند کر دیا جن کے ہیڈ ورکس بھارت کے پاس تھے۔ یہاں سے پاکستان اور بھارت کے درمیان نہری پانی کا تنازعہ شروع ہوا، جو طویل مدت تک چلتا رہا۔ 1951ء میں ٹینیسی وادی اتھارٹی (امریکا) کے سابق صدر مسٹر ڈیوڈ ای للینتھن نے دونوں ملکوں کا دورہ کرنے کے بعد رپورٹ دی کہ تنازعے کا انجینئرنگ حل ممکن ہے جس کے لیے عالمی بینک مالیاتی امداد فراہم کرسکتا ہے۔ چنانچہ دونوں ملکوں کی حکومتوں نے اس رائے پر اتفاق کیا۔

(الف) بھارت اور پاکستان کے درمیان پانی کے مسئلے سے کون سا معاہدہ اور کب ہوا؟

(ب) پاکستان میں موجود کوئی سے دو ڈیموں کے نام لکھیں؟

قصہ کوئز2

جنرل محمد ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کر کے قومی اسمبلی کو کالعدم قرار دیا۔ فیروز خان نون کی وزارت کو برطرف کر دیا۔ آئین کو منسوخ کیا۔ تمام سیاسی جماعتوں کو خلاف قانون قرار دیا۔ اپنی ذات اور حکومت کے خلاف ہر طرح کی تحریری اور تحریری تنقید کی ممانعت کر دی..... اور یوں صدر ایوب خان نے صحافت کو پابہ زنجیر کر دیا۔

مارشل لاء عائد کرنے کے ایک ہفتے بعد پروگریسو پیپرز لمیٹڈ (پی پی ایل) کے تینوں مشہور اخبارات و جرائد یعنی ''پاکستان ٹائمز، امروز، اور لیل و نہار'' کے مدیروں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور سید سبط حسن کو گرفتار کر کے جہاں انھیں ''سی کلاس'' میں رکھا گیا۔

(الف) جنرل ایوب خان کا مارشل لاء کتنے عرصے رہا؟

(ب) پاکستان میں اب تک کتنے مارشل لاء لگے اور کس کس نے لگائے؟

قصہ کوئز3

جس سال مسلم لیگ قائم ہوئی اسی سال کانگریس کا سالانہ اجلاس کلکتے میں منعقد ہوا تھا۔ ہندوستان بھر کے 1663 نمائندوں نے شرکت کی، جن میں سے صرف 45 میں سے 24 خود بنگالی تھے۔ اسی سال ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے افتتاحی اجلاس میں جتنے بھی نمائندے شریک تھے، سب کے سب مسلمان تھے اور ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر علاقے سے آئے تھے۔ چنانچہ کانگریس کے اس مسلم دشمن سلوک کو دیکھتے ہوئے مسلمانان ہند اور ان کی جو چھوٹی موٹی انجمنیں تھیں، ان سب نے کانگریس کا بائیکاٹ کیا۔ اس وقت کے تمام مسلمان قائدین مثلاً نواب عبداللطیف، جسٹس سید امیر علی اور سرسید احمد خان نے کانگریس کے مقابلے میں مسلمانوں کی اپنی ایک جداگانہ ملک گیر سیاسی جماعت قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

(الف) مسلم لیگ کون سے سال قائم ہوئی؟

(ب)؟ قائداعظمؒ نے مسلم لیگ میں شمولیت کب اختیار کی؟

■■■

منشورات

خوبصورت اور معیاری کتب، کم قیمت اعلیٰ معیار

منصورہ، ملتان روڈ لاہور 042-35434909 042-35425356

سہولت کے لیے تعاون

حوالہ میری پسند کا

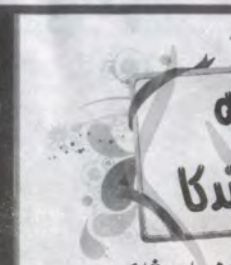

آج کے مہمان شاعر

امجد اسلام امجد

میزبان: نوید غازی

میں 4 اگست 1944ء کو لاہور میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم لاہور سے ہی حاصل کی اور ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد شعبہء تدریس سے وابستہ ہو گیا اور آج تک اسی شعبے سے منسلک ہوں۔ گورنمنٹ ایم اے او کالج میں لیکچرار سے ایسوسی ایٹ پروفیسر تک کا سفر 1968ء سے 1975ء اور پھر 1979ء سے 1997ء تک طے کیا۔ اسی دوران پنجاب کونسل آف آرٹ لاہور میں بطور ڈپٹی ڈائریکٹر (ڈراما اور ادب) کے فرائض انجام دیئے۔ 1997ء کے بعد سے مختلف سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں بطور پراجیکٹ ڈائریکٹر خدمات انجام دینے کے بعد 2010ء میں ایک نجی چینل میں بطور ایڈوائزر کنٹنٹ کام کیا اور اب 2012ء سے تاحال یونیورسٹی آف لاہور میں بطور چیف کنٹنٹ ایڈوائزر اینڈ سینئر پروفیسر کریئیٹو وبلیج خدمات انجام دے رہا ہوں۔ میری تاحال 58 مطبوعات شائع ہو چکی ہیں جو کہ شاعری، ڈرامے، تراجم، سفرنامے، کالم، گیت، انتخاب اور تنقید وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ اس تمام کام سے متعلق مجھے 29 مختلف اعزازات سے بھی نوازا گیا جن میں زیادہ تر ایوارڈز بشمول ستارہء امتیاز، تمغہء حسنِ کارکردگی، قومی ہجرہ اقبال ایوارڈ، بہترین ڈراما نگار پی ٹی وی ایوارڈز، خصوصی صدارتی ایوارڈ برائے ٹی وی سیریل 'وارث'، بیاض ایوارڈ، نگار ایوارڈ، احمد ندیم قاسمی ایوارڈ، چترآشی فراق گورکھپوری ایوارڈ وغیرہ۔ مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ میرے کام کے حوالے سے ایم۔اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح پر اب تک 7 مقالہ جات لکھے جا چکے ہیں۔

کرو جو بات کرنی ہے

کرو جو بات کرنی ہے
اگر اس آس پر بیٹھے گی دنیا
بس تمھیں سننے کی خاطر
گوش بر آواز ہو کر بیٹھ جائے گی
تو ایسا ہو نہیں سکتا
زمانہ ایک لوگوں سے بھرا فٹ پاتھ ہے جس پر
کسی کو ایک لمحے کے لیے رکنا نہیں ملتا
بٹھاؤ لاکھ تم پہرے
تماشا گاہِ عالم سے گزرتی جائے گی خلقت
بنا دیکھے، بنا ٹھہرے
دھندلکا سا کوئی جیسے زمیں سے آسماں تک ہے
یہ کوئی خواب ہے جیسے
نہیں معلوم کچھ اس خواب کی مہلت کہاں تک ہے
کرو جو بات کرنی ہے

مرزا اسد اللہ خان غالب

غالب کا نام ہر آدمی لیتا ہے اور لینا ہی پڑتا ہے کیونکہ ان کو بائی پاس کرنا ممکن ہی نہیں۔ غالب کے یہاں جو چیز بہت ہی حیران کن حد تک پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ پرانی بات کو ایسے بیان کرتے ہیں کہ نئی لگے۔ ان کے کلام کا Format کسی اور ہی دنیا میں لے جاتا ہے۔ غالب کے ہاں عجیب وسعت ہے کہ اس نے جو تجربے کیئے ہیں ان میں ایک universality پائی جاتی ہے۔

غزل

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ سے جفا اور سہی
تم ہو بیداد میں خوش، اس سے سوا اور سہی
غیر کی مرگ کا غم کس لیئے اے غیرتِ ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت ، وہ نہ ہوا اور سہی
تم ہو بت پھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟
تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی
حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی
آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی
کیوں نہ فردوس کو دوزخ میں ملا لیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی، آب بقا اور سہی
مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فضا اور سہی

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

اقبال بنیادی طور پر بہت قد آور شخصیت ہیں اور میں جو چیز سب سے بڑھ کر ان میں دیکھتا ہوں وہ ان کا vision ہے۔ وہ آنے والی صدیوں کی ترجمانی بھی اپنی شاعری میں کر گئے ہیں۔ ذرا غور کریں کہ اقبال نے یہودیوں کے بارے میں جو مصرع کہا کہ 'فرنگ کی رگِ جاں پنجہء یہود میں ہے' جبکہ اس وقت یہودی تقریباً ناپید تھے اور نہ ہی ان کی کوئی مملکت تھی مگر اقبال کا وژن اس سارے پس منظر سے آگاہ تھا۔ اسی طرح سپیس، ٹائم، شعور اور انسانی تاریخ سے متعلق اقبال کا وژن بہت ارفع تھا اور بحیثیت شاعر اور کرافٹس مین اتنے عظیم ہیں کہ ان کو Immitate نہیں کیا جا سکتا اور عظیم لوگ اسی لیئے عظیم ہوتے ہیں کہ ان جیسا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

غزل

منظر چمنستاں کے زیبا ہوں کہ نازیبا
محرومِ عمل نرگس مجبورِ تماشا ہے
رفتار کی لذت کا احساس نہیں اس کو
فطرت ہی صنوبر کی محرومِ تمنا ہے
تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں
انسان کی ہر قوت سرگرمِ تقاضا ہے
اس ذرے کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم
یہ ذرہ نہیں شاید، سمٹا ہوا صحرا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستیء دانا ہے ، بینا ہے، توانا ہے

مجید امجد

ترقی پسند تحریک میں کئی نام لیئے جا سکتے ہیں جن میں بہت سے شعرا شامل ہیں مگر چونکہ یہاں گنجائش صرف چھ شاعروں کی ہے تو اس وضاحت کے ساتھ مجھے مجید امجد کا نام زیادہ اہم محسوس ہوتا ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کے نام کے ساتھ بھی امجد آتا ہے۔ خیر تفنن برطرف ان کی نظم نے خاص طور سے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔

میں نے پہلی بار جب ان کی نظم آٹو گراف پڑھی تو حیران ہوا کہ آیا شاعری اس فارم میں بھی کی جا سکتی ہے۔ مجید امجد کو اگر شاعری کا مینیچر پینٹر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ نظم کے اندر فلسفہ کو یوں حل کر دیتے ہیں کہ قاری نغمگی کے حسن کے ساتھ ساتھ زندگی کو بھی گہرائی میں اتر کر چکھتا ہے۔

ڈاک خانے کے ٹکٹ گھر پر خریداروں کی بھیڑ
ایک چوبی طاقچے پر کچھ دواتیں، اک قلم
یہ قلم میں نے اٹھایا اور خط لکھنے لگا:
'پیارے ماموں جی! دعا کیجئے خدا رکھ لے بھرم
آج انٹرویو ہے!..... کل تک فیصلہ ہوجائے گا
دیکھیں کیا ہو؟ مجھ کو ڈر ہے۔' اتنے میں تم آگئیں
'اک ذرا تکلیف فرما کر پتا لکھ دیجئے'
میں نے تم سے وہ لفافہ لے لیا، جھجکا نہیں
بے دھڑک لکھ ڈالا میں نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ
مختصر، رنگیں پتہ: 'گلگت میں۔ گوہر خاں کے نام!'
'شکریہ'..... 'جی کیسا؟'..... اک ہنستی نگہ زیرِ نقاب
ڈاک میں خط..... تانگہ ٹمپل روڈ کو..... قصہ تمام!

فیض احمد فیض

فیض احمد فیض بلاشبہ اس انقلاب کا حصہ ہیں جو ان کی شاعری سے جھلکتا ہے۔ میں ذاتی طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ شاعری کا اصل مزا اس کی نغمگی، سر، لے، وزن اور آہنگ میں ہی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے مجھے ذاتی طور پر نثری نظم سے زیادہ رغبت نہیں ہو پائی۔ فیض کی پابند نظموں میں اور ان کی غزلوں میں یہ اجزا بہت ہی خوبی سے جڑے ہیں جو مجھے اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ان کی ایک نظم جو جس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

غزل

میرے قاتل میرے دلدار مرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
مرہمِ مشک لیئے، نشترِ الماس لیئے
بین کرتی ہوئی ہنستی ہوئی گاتی نکلے
درد کا کاسنی پازیب بجاتی نکلے
جس گھڑی سینوں میں ڈوبتے ہوئے دل
آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی راہ تکنے لگیں آس لیے
میرے قاتل مرے دلدار

احمد ندیم قاسمی

قاسمی صاحب کے ساتھ میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں اور ان کا خاص اسلوب مجھے بہت متاثر کرتا ہے۔ قاسمی صاحب کے ہاں جو چیز مجھے متاثر کرتی ہے وہ ان کا یونیک سٹائل اور وژن ہے۔ ان کی غزل پیش کرتا ہوں جو مجھے بہت پسند ہے۔

غزل

نہ وہ سماں ہیں فرصتِ عشق کے، نہ وہ دن ہیں کشفِ جمال کے
مگر اب بھی دل کو جواں رکھیں وہی شعبدے خدوخال کے
یہ جو گردِ بادِ حیات ہے کوئی اس کی زد سے بچا نہیں
مگر آج تک تری یاد کو میں رکھوں سنبھال سنبھال کے
میں امین وقدر شناس تھا، مجھے سانس سانس کا پاس تھا
یہ جبیں پہ ہیں جو لکھے ہوئے، یہ حساب ہیں مہ و سال کے
وہ کبھی شفق کا فسوں کہیں، کبھی گل کہیں کبھی خوں کہیں
کہ ہیں میری صبحِ عروج میں ابھی رنگ شامِ زوال کے
مری حسرتوں کو ہرا رکھے، مری کشتِ جاں کو بھرا رکھے
یہ یقیں کہ مجھ پہ کھلیں گے در کسی روز بادِ شمال کے
شبِ تار سے نہ ڈرا مجھے، اے خدا! جمال دکھا مجھے
کہ تری ثبوت ہیں بیشتر، تری شانِ جاہ و جلال کے
کوئی کوہکن ہو کہ قیس ہو، کوئی میر ہو کہ ندیم ہو
سبھی نام ایک ہی شخص کے، سبھی پھول ایک ہی ڈال کے

پروین شاکر

پروین کے ہاں جو انفرادی تجربہ پایا جاتا ہے اور جس شدت سے پایا جاتا ہے اس کا اظہار شاید کچھ سطروں میں ممکن نہ ہو سکے۔ کیفیات کے رچاؤ کے ساتھ اسلوب اور داخلی و خارجی تجربات ان کی شاعری کا اہم خاصہ ہیں اور بہت کم عمری میں زندگی کی گہرائیوں کو محسوس کرنا اور شاعری میں ڈھالنا بہت ہی معنی خیز بات ہے۔ زندگی نے ان کو زیادہ مہلت نہیں دی مگر اس کے باوجود پروین کے نام کے بغیر اردو شاعری نامکمل سی محسوس ہوتی ہے۔

غزل

چلنے کا حوصلہ نہیں، رکنا محال کر دیا
عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نڈھال کر دیا
اے مری گل زمیں تجھے چاہ تھی اک کتاب کی
اہلِ کتاب نے مگر کیا ترا حال کر دیا
ملتے ہوئے دلوں کے بیچ اور تھا فیصلہ کوئی
اس نے مگر بچھڑتے وقت اور سوال کر دیا
اب کے ہوا کے ساتھ ہے دامنِ یاد منتظر
بانوئے شب کے ہاتھ میں رکھنا سنبھال کر دیا
ممکنہ فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
ہم نے تو ایک بات کی، اس نے کمال کر دیا
میرے لبوں پہ مہر تھی پر مرے شیشہ رو نے تو
شہر کے شہر کو مرا واقفِ حال کر دیا
چہرہ و نام ایک ساتھ آج نہ یاد آ سکے
وقت نے کس شبیہ کو خواب و خیال کر دیا
مدتوں بعد اس نے آج مجھ سے کوئی گلہ کیا
منسبِ دلبری پہ کیا مجھ کو بحال کر دیا؟

تھینک یو جنید.....

تھینک یو ویری مچ.....!!!

وصی شاہ

مزاج بھی خالق کائنات نے دلچسپ اور عجیب وغریب شے بنائی ہے، ساری دنیا پر راج کرنے والے بڑی بڑی سلطنتوں کے مالک ومختار بعض اوقات اپنے مزاج کے معاملے میں بالکل لاچار وبے بس ہوا کرتے ہیں۔ ایک عالم کو شکست فاش دینے والے، ایک دنیا کو فتح کرنے والے، اپنے مزاج سے بری طرح شکست کھا جایا کرتے ہیں..... ''مزاج''..... جو شاید پاؤ بھر کے بھیجے میں کہیں پوشیدہ ہوتا ہے، اور چھ فٹ کے انسان کو بے بس کئے رکھتا ہے۔ میرا اپنا ہی ایک شعر ہے۔

مجبور ہیں سب اپنی افتادِ طبیعت سے
ہو شمع سے کیا شکوہ، پروانے کو کیا کہیے

مزاج کے معاملے میں تقریباً یہی حال عالموں، فاضلوں کا بھی ہوا کرتا ہے۔ سارا جہان جن سے مشورے لیا کرتا ہے جن کے علم وفضل کا قائل ہوا کرتا ہے وہ بھی اپنے مزاج کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں اور بیش تر کیسز میں تو اس کو سمجھنے سے بھی قاصر رہتے ہیں۔

مزاج ہی نفس کو رہنمائی فراہم کرتا ہے نفس کے من میں اٹھنے والے اچھے برے خیالات کے پیچھے مزاج ہی کی سازش کارفرما ہوتی ہے تبھی تو پنجابی کے عظیم شاعر بابا بلھے شاہ نے فرمایا تھا۔

پڑھ پڑھ عالم فاضل ہویا ایں
کدی اپنے آپ نوں پڑھیا ای نئیں
ایویں روز شیطان نال لڑنا ایں
کدی نفس اپنے نال لڑیا ای نئیں۔

میں خود بھی اپنی مزاج کی اداسی اور بے چینی سے بہت تنگ ہوں جو کبھی کبھی بلاوجہ ساون کے گھنے اور گہرے بادلوں کی طرح دل ودماغ کے ماحول پر چھا جایا کرتی ہے اور اس کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں ہوا کرتی، مزاج کا یہ اداس موسم بظاہر، دنیاوی لحاظ سے عین خوشی کے دنوں میں بھی طاری ہوسکتا ہے، یعنی عین ممکن ہے کہ جس شے کے لئے برسوں دعائیں مانگی ہوں عین اُس کے حصول کے موقع پر اداسی حملہ آور ہو جائے اور باوجود خوشی پانے کے من مستقل اداس رہے، یہ جو مزاج کے سوئچ کا وقت بے وقت، آن آف ہونے کا عمل ہے نفسیات کی زبان میں

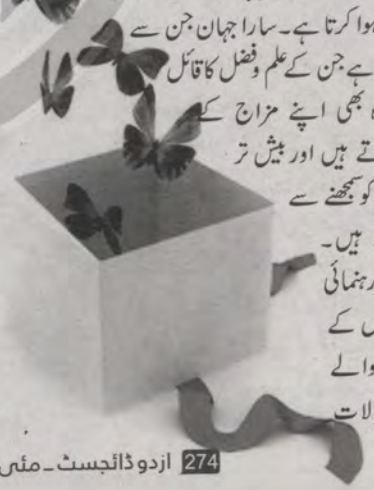

اس کو mood swings بھی کہتے ہیں اور سچی بات یہ ہے اب میرے ان mood swings کے باعث مجھ سے زیادہ میری اہلیہ پریشان رہتی ہیں، کیونکہ میرے پاس اداسی کی وجہ کے بارے میں کئے گئے سوال کا کوئی جواب نہیں ہوا کرتا اور بیگمات کا مسئلہ تو قارئین جانتے ہی ہیں کہ انہیں ہر بات کا شافی جواب چاہئے ہوتا ہے..... ورنہ.....!!!

اب شاعر بھلا بے سبب اداسی کی کیا وجہ بتائے کہ یہ وجہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تو شاعر خود جہان فانی سے کوچ کر جایا کرتے ہیں۔ مگر اس بے وجہ اداسی کی وجہ نہیں جان پاتے، جون ایلیا یاد آتے ہیں۔

روح پیاسی کہاں سے آتی ہے
یہ اداسی کہاں سے آتی ہے

کل صبح سے جی کچھ ایسا ہی اداس تھا، بے سبب، بے وجہ بے طرح اور بے پناہ اداس..... مجھے اپنے دیرینہ دوست محمد علی خان اور ان کی بیگم عافیہ خان کے شیخوپورہ میں قائم اسکول میں بطور مہمان خصوصی پہنچنا تھا مگر جی تھا کہ کسی طور سنبھل کر نہ دیتا تھا، اگر محمد علی خان میرے بچپن اور میرے شہر سرگودھا کے دوست نہ ہوتے تو میں کم از کم ایک بار معذرت کی کوشش ضرور کرتا مگر سچ ہے کہ مجھے علی خان کی مونچھوں گالیوں اور ''گھسن مکے'' سے آج بھی بہت ڈر لگتا ہے۔

سو اپنی اداسی ساتھ لئے وہاں پہنچ گیا، عموماً مجھے بچوں کو دیکھ کر بے پناہ خوشی ہوتی ہے اور علی کے اسکول کے طلباء کا نظم وضبط، خاص رنگ ڈھنگ لئے بچوں کے حسین لباس، ٹیبلوز، ڈرامے، سب کچھ بہت شاندار تھا مگر یہ کم بخت اور بے وقت اداسی.....!!!

خاموشی

خاموش انسان خاموش پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں۔ خاموشی خود ایک راز ہے اور پھر صاحبِ اسرار خاموش رہنا پسند کرتا ہے۔ خاموشی دانا کا زیور ہے اور احمق کا بھرم۔ خاموشی میں عافیت ہے۔ اگر ہم زبان کی پھیلائی ہوئی مصیبتوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا خاموشی میں کتنی راحت ہے اور زیادہ بولنے والا مجبور ہو کر رہ جاتا ہے کہ وہ سچ اور جھوٹ کو ملا کر بولے۔ اُس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ سوچے کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں۔

(ھانیہ محبوب۔ اسلام آباد)

تقسیم انعامات کے ایک سیشن کے بعد میں نے اجازت چاہی تو عافیہ بھابھی نے محمد علی خان کے کان میں کچھ کہا اور علی نے مجھ سے کہا کہ بس شاہ جی 5 منٹ اور پھر چاہے چلے جائیے گا۔ اور پھر اعلان کیا کہ جنید نامی ساتویں جماعت کا طالب عالم جو کہ دونوں بازوؤں سے محروم ہے، سٹیج پر آکر اپنا نام لکھ کر دکھائے گا اور علامہ اقبال کی پینٹنگ بھی بنائے گا۔ اس کے بعد ایک بچہ جس کے دونوں بازوؤں کی جگہ صرف آستینیں لٹک رہی تھیں تالیوں کی گونج میں اسٹیج پر آیا اور اسٹیج پر بیٹھ کر اس نے اپنے پیروں کی انگلیوں سے قلم پکڑا اور نہ صرف اپنا نام لکھا بلکہ دو منٹ سے بھی کم دورانیے میں علامہ اقبال کی شاندار تصویر بھی بنا ڈالی..... ایسی تصویر جو مجھ جیسا دونوں ہاتھوں سے نوازا گیا شخص نہیں بنا سکتا۔ جنید نامی اس بچے نے مجھے حیران کر دیا، صرف پیروں سے قلم پکڑ کر لکھنے یا تصویر بنانے نے نہیں کہ

ایسے ہنر مند اور بھی مل جاتے ہیں ۔ بلکہ جنید کے عزم، حوصلے اور ہمت نے جو یقیناً ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی کہیں بلند ہے۔ محمد علی خان نے مجھے اور ساتھ جانے والے میرے دوست میثم عباس کو بتایا کہ جنید اپنی پوری فیملی کے ساتھ ایک آٹھ بائی چھ کے کمرے میں رہتا ہے اور ایک غریب گورکن کا بیٹا ہے۔ ساتھ آئی ہوئی گورکن کی بیوی اور جنید کی ماں نے بتایا کہ اسے بچپن ہی سے پڑھنے کا شوق تھا، اور محاورتاً نہیں حقیقتاً یہ دیے کی روشنی اور قبرستان کے صدر دروازے پر لگی کھمبے کی سرکاری ٹیوب لائٹ کے نیچے بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا۔ میری حیرانی کی مزید انتہا نہ رہی جب جنید اور اس کی والدہ نے مجھے اور میثم عباس کو جنید کے ہاتھوں کی بنی کلرڈ پینٹنگز دکھائیں۔ جنید نے ہمیں پیروں کی انگلیوں سے ہی کمپیوٹر بھی آپریٹ کر کے دکھایا اور اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ کمپیوٹر پروگرامر بننا چاہتا ہے۔ جنید کھانا بھی پیروں کی انگلیوں کے ذریعے چمچ تھام کر خود کھاتا ہے،..... وہ معذور ہے محتاج نہیں.....

اس سارے عرصے میں انتہائی خاص بات جنید کے چہرے پر مسلسل اور مستقل رقصاں جنید کی مسکراہٹ تھی جو میں بہت دیر سے نوٹ کر رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی نعمت سے محروم جنید کی مسکراہٹ پہلے ہی میری اداسی کو جڑ سے اکھاڑ چکی تھی چلنے سے پہلے آخر مجھ سے رہا نہ گیا میں جنید سے پوچھ ہی بیٹھا! ''بیٹا تمہارے دونوں بازو نہیں ہیں تمہیں اس کا دکھ اس کا گلہ نہیں ہوتا، تم پھر بھی مسکراتے رہتے ہو.....؟''

جنید نے ایک لمحے سے بھی پہلے بغیر کسی توقف کے جواب دیا ''سر! اللہ میاں نے مجھے دیکھنے کیلئے آنکھیں دی ہیں، سونگھنے کیلئے ناک، بولنے کے لئے زبان، سننے کے لئے کان، چلنے کے لئے پاؤں اور میرا باقی مکمل وجود، بس یہی سوچ سوچ کر مسکراتا رہتا ہوں کہ اللہ کا شکر کیسے ادا کروں؟؟؟ اور اگر مسکراؤں گا نہیں، اداس رہوں گا تو کہیں اللہ میاں مجھ سے خفا نہ ہو جائیں، میرے تو صرف دونوں بازو نہیں ہیں، بہت سے لوگوں کے پاس تو دنیا میں آنکھیں، کان، بازو، ٹانگیں بھی نہیں ہوتیں، تو جب میں ایسے لاکھوں لوگوں سے بہتر ہوں تو کیوں نہ مسکراؤں.....؟؟؟

آپ خود بتائیں سر میرا مسکرانا اور اللہ میاں کا شکر ادا کرنا بنتا ہے ناں.....؟؟؟

میری اور میثم کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر خوشی اور تحسین کے، ہم دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا ''ہاں تمہارا مسکرانا بنتا ہے بلکہ ہم سب کا مسکرانا خوش رہنا بنتا ہے'' مگر افسوس ہم ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر اس کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے۔ لاہور واپسی کے سفر میں اداسی کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا اور میثم کے ساتھ سرگودھا کی یادیں اور نور جہاں کے گانے شیئر کرتا ہوا سوچ رہا تھا کہ آج مجھے mood swings کا علاج مل گیا۔ اب جب بھی اداسی اور مایوسی گھیرا ڈالے گی میں دونوں ہاتھوں سے محروم مگر ہر وقت مسکراتے ہوئے جنید کو یاد کر لیا کروں گا..... اگر آپ کسی بھی وجہ سے اداس رہتے ہیں تو آپ بھی اپنے اردگرد کسی ''جنید'' کو تلاش کیجئے اور اس سے ہر وقت مسکرانا سیکھئے۔

تھینک یو جنید..... تھینک یو ویری مچ.....!!!

عمران ہیل یوبی کی

مسکراتی لکیریں

الیکشن کے نتائج

(شاعر: تنویر خواجہ)

بھری ہوں گی روحیں تو سلوٹوں سے لباس میں اک شکن نہ ہوگا
غیرت حمیت کا فقدان ہو گا، مروتوں کا چلن نہ ہو گا
بغیر پیندے کے لوٹے ہوں گے، بینگن ہوں گے وہ تھالیوں کے
ادھر سے ادھر وہ رہیں گے بہتے، کہ جیسے تنکے ہوں نالیوں کے

ایوان ہوں گے ہو جیسے منڈی بکیں گے لوٹوں سے گڑویوں سے
رنگ برنگے سے آنچلوں سے، رنگ برنگی سی ٹائیوں سے
محکمے تو بس چند ہوں گے، وزارتیں دوگنا بنیں گی
وزارتیں ہوں گی ریوڑیاں اور ہاتھ اندھوں کے جو لگیں گی
ٹہنیوں پہ تھے اُلو بیٹھے، انجام گلشن کا سب نے دیکھا
اب بھی شاخوں پہ آکے ہوں گے پٹھے ان کے ہی جلوہ فرما

جو گزر گیا اس دور میں تو کچھ بچے تھے کچھ کڑچھے تھے
اطوار بھی ٹیڑھے میڑھے تھے کچھ چہرے آڑے ترچھے تھے
ایوانِ حکومت میں یار و اب گڑویاں لوٹے آئیں گے
کچھ ڈگریاں جعلی آئیں گی کچھ سکے کھوٹے آئیں گے

کل گوشت پوست کے اُلو تھے اب کاٹھ کے اُلو بیٹھیں گے
تکریم گلستان کیا ہو گی جب للو کلو بیٹھیں گے
کسی کی غیرت جاگ اٹھے شاید کوئی اس میں آڈوبے
اس خوش فہمی میں پانی سے ہم بھر کر چلو بیٹھیں گے

غزل

کب تلک دیکھیے دنیا کو گوارا ہوں میں
رنج کرتی ہوئی پلکوں کا ستارہ ہوں میں
میں تو اپنا بھی نہیں ہوں کہ کوئی دعویٰ کروں
تم سے یہ کس نے کہا ہے کہ تمھارا ہوں میں
دکھ تو یہ ہے کہ کوئی دکھ بھی نہیں تھا ایسا
عمر بھر جس کی اذیت سے گزارا ہوں میں
تیری وحشت کو سمیٹوں گا تو میں ہی آخر
تو ہے گر بپھرا سمندر تو کنارا ہوں میں
روشنی کرتا ہوں، لوگوں کو دعا دیتا ہوں
شہر کی آخری مسجد کا منارہ ہوں میں

(شاعر: نوید غازی)

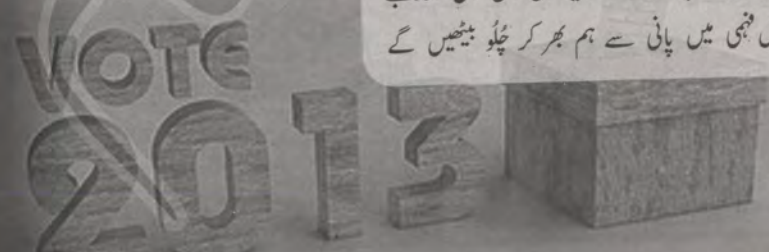

چمنِ خیال

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

مجھے خوشی ہوئی

مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے میری تجاویز کو اہمیت دی۔ لیکن فہرست والی تجاویز سے میری مراد تھی کہ مکمل ڈائجسٹ کے مضامین کی فہرست بھی ترتیب کے ساتھ اگر ہو تو بہت فائدہ ہوگا۔

ایک سلسلہ جس کی مجھے خواہش تھی کہ نومسلموں کے ایمان لانے کے واقعات بھی شائع ہونے چاہیے۔ ''جاپانی گڑیا'' سے اس کی ابتدا ہو گئی یہ سلسلہ مزید جاری رہنا چاہیے۔

ماشاء اللہ! لے آؤٹ، ڈیزائننگ اور فونٹ سائز میں تبدیلی بہت شاندار اور مناسب ہے۔

(محمد افضل کاسی، کوئٹہ)

سینہ تان کر بیٹھا فرعون

تازہ شمارہ حسب معمول خوشی کا باعث بنا مگر مواد خاص الخاص تھا۔ ہر مضمون، ہر کہانی موتی کی طرح لگی۔ آپ کا سفر نامہ چودہ دن خاصے کی چیز ہے۔ نایاب دھاتیں اور ادب کے شاہکار قابل تعریف تھے۔ بہرحال میں خاص طور پر ''کیا بندر کے ہاتھ چھری'' میں عمیر محمود نے اس ٹی وی شو خبرناک کے متعلق لکھ کر تو میرے دل کی آواز کو قرطاسِ ابیض پر بکھیر دیا ہے۔

یہ پروگرام عامیانہ اسٹیج شو سے بھی گرا پڑا ہے یہ چار پانچ اسٹیج کے تھرڈ کلاس بھانڈ لے آئے ہیں جنھیں تمیز اور اخلاق تو چھو کر بھی نہیں گیا۔ بہت سی مائیں، بہنیں تو خش اور انتہائی غلیظ محاورے بازی سے منہ میں انگلیاں دے لیتی ہیں۔ ابھی اتوار کو بھی ایک کالے رنگ کے بڑے معزز اور اچھی عمر کے بندے کی ان چاروں نے بے عزتی کر کے انتہائی ''گناہ حاصل کرنے والے'' فقرے چست کیے۔ آفتاب اقبال نے انتہائی احمقانہ پن سے شو کو جاری رکھا ہوا ہے۔ مثلاً ان بھانڈوں کی بدتمیزیاں،

پھر گانے کے بول سن کر ایک صاحب سے فلم لکھنے والے کا نام وغیرہ پوچھا جاتا ہے۔ اب یہ صاحب سقراط کے بھی بزرگوار لگتے ہیں کہ زبان و بیان کا حصہ جوان جیسے کم پڑھے لکھے لوگوں کے سر کے اوپر سے گزر جاتا ہے اور پھر کچھ پرانی فلموں میں سے گانا سنا دیتے ہیں۔ لیجیے یہ لچر، فحش، غیر اخلاقی اور انتہائی ناقص ترین ٹی وی شو اختتام کو پہنچا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ موصوف کی نشست اس انداز کی ہوتی ہے جیسے کوئی فرعون سینہ تان کے تقریباً پنجابی لہجے میں اپنے کمیّوں کی سرزنش کر رہا ہوتا ہے۔ کندھے ہلا ہلا کر اور مغروریت سے بھرپور ہنسی میں شو ختم کیا جاتا ہے۔

اس سے عام بچے، جوان یہ سیکھتے ہیں کہ لچر، فحش گفتگو اور بدتمیزی کیسے کی جاتی ہے، اس دوران بڑوں کا کوئی احترام نہ کیا جائے، دوسروں اور اپنی ماں بہنوں اور والدین تک سے ہتک آمیز فقرہ بازی کیسے کی جاتی ہے، گانے سنیں اور نام یاد رکھیں۔ گانا بھی سننا بڑا ضروری ہے، مہمانوں کی کس کس طریقے سے بے عزتی کر سکتے ہیں اور انھیں کیسے کیسے مخرب اخلاق فقروں اور جگتوں سے نواز سکتے ہیں۔

کیا جیو والے اندھے ہو گئے ہیں اور موصوف کے والد صاحب تو مشہور بااخلاق شخص اور بہترین شاعر ہیں، وہی اپنی تربیت کو غلط سمت لے جانے والے بے مہار صاحبزادے کو لگام ڈالیں۔

(جاوید احمد صدیقی، راولپنڈی)

60 سال بعد نظریہ پاکستان پہ سوال

یہ افسوس ناک امر ہے کہ دنیا میں خالصتاً نظریاتی بنیادوں پر معرض وجود میں آنے والی مملکت خداداد پاکستان کی مسلمہ نظریاتی اساس اور بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ذات ستودہ صفات کو بوجوہ متنازعہ بنانے میں جاہ طلب، مصلحت پسند اور مفنی عزائم کے حامل افراد ساٹھ سال کے بعد یہ سوال اٹھا رہے ہیں کہ پاکستان کیوں منصۂ شہود پر ابھرا اور اس کا نظریہ کیا تھا؟ یہ خود تو پاکستان بننے کے بعد ہی پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں کیا خبر کہ نظریے بارے کبھی دو آراء نہیں تھیں بلکہ اپنے پرائے، سب کا اتفاق تھا کہ

پاکستان کا مطلب کیا..... لا الٰہ الا اللہ

پروفیسر محمد اصغر سودائی مرحوم کے ترانہ پاکستان کا یہ ضرب المثال مصرع ہر مسلمان کے دل کی آواز تھی اور یہی مصرع پوری تحریک پاکستان کی جان تھا۔ قائداعظم نے سو سے زائد گفتگوؤں، تقریروں اور اخباری بیانوں میں پاکستان کو اسلام کے عالمگیر اصولوں کی تجربہ گاہ قرار دیا۔ انھوں نے واضح کیا کہ پاکستان کا دستور قرآن پاک کے فرمودات کا آئینہ دار ہوگا۔

11 اگست 1947ء کی جس تقریر کا حوالہ دے کر نام نہاد سیکولر اور امریکا نواز، پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ قرار دینے پر ادھار کھائے بیٹھے دکھائی دیتے ہیں، وہ پاکستان کے شہریوں کے بلاامتیاز حقوق شہریت کا اعلامیہ تھا نہ کہ اسلام کے مسلمہ نظریات سے انحراف کا اظہار۔ اس کا متن غور سے پڑھیں تو قائداعظم کہیں بھی یہ کہتے دکھائے نہیں دیتے کہ ہمارا دستور اور قانون اسلام سے ہٹ کر ہوگا۔ ان کا بس چلے تو قائداعظم کی شخصیت کو بھی داغ دار کر دیں۔

(پروفیسر سید ریاض حسین زیدی، ساہیوال)

ٹائٹل پسند نہیں آیا

اردو ڈائجسٹ کا نام ڈائجسٹ ہے، اسے براہ کرم

سیاسی نہ بنائیے۔ اس کی تحریریں آسانی سے ڈائجسٹ ہوتی رہیں۔

آپ کا یہ پہلا ٹائٹل ہے جو ناپسند رہا۔ ہاتھی معصوم جانور تو نہیں ہے۔ آپ نے کیا سوچ کر اسے ٹائٹل پہ بٹھایا۔ عوام کو ہاتھی سے تشبیہ دینے کی کوئی دلیل سمجھ نہیں آئی۔ اوپر پھانسی کا پھندہ لٹکا دیا ہے۔ یہ پھندہ بھی مناسب جگہ پر نہیں ہے۔ دل کی بات کہوں تو یہ ٹائٹل ذوقِ جمالیات پہ پورا نہیں اترتا۔ ادبی مزاج سے لے کر سماجی خوب صورتی کو ٹائٹل پہ لایا کریں۔ اندر مواد اور انتخاب پر اتنی محنت نظر آتی ہے۔ اس کا اظہار ٹائٹل پر بھی ہونا چاہیے۔

(خالد سعید اختر، لاہور)

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

آپ کا ارسال کردہ سوالنامہ کاغذات میں کھو گیا تھا ابھی یہ متاع گم گشتہ ہاتھ اور فوری طور پر حوالہ ڈاک کیا کیونکہ اگر ایسا نہ کرتا تو شاید پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔

مجھ سے زیادہ میرے بچے اُردو ڈائجسٹ کے منتظر رہتے ہیں اور جب ایک دفعہ گھر لے جاؤں تو پھر بچوں سے مستعار لینا پڑتا ہے۔ پہلے وہ اس کی ورق گردانی کرتے ہیں بعد میں میری باری آتی ہے۔ اردو ڈائجسٹ کا ہر مضمون پڑھنے کے قابل ہوتا ہے کیونکہ اس میں ہر ذوق اور ہر عمر کے لوگوں کی پسند کا خیال رکھا جاتا ہے۔

(حیران خٹک، ایڈیشنل ڈائریکٹر انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد)

لفظ ''دیوی'' کا بڑھتا استعمال

میں اردو ڈائجسٹ کے معزز قارئین کی توجہ ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف دلانا چاہتی ہوں۔ وہ یہ کہ میں نے نوٹ کیا کہ اکثر خواتین و حضرات بغیر سوچے سمجھے کچھ ہندی الفاظ کثرت سے ادا کرنے لگے ہیں۔ مثلاً ''قسمت کی دیوی، نیند کی دیوی، دولت کی دیوی'' وغیرہ۔ کیا اللہ نے قسمت، نیند اور دولت ان دیویوں کو سونپ دی ہے۔ ہمارا تو ایمان ہی اللہ کے ربِ کائنات ہونے پر ہے۔ کلمہ توحید ''لا الٰہ الا اللہ'' اسی کا اظہار اور اقرار ہے۔

لیکن غیر مسلموں کی نقالی میں بغیر سوچے سمجھے لفظ ''دیوی'' تحریر و تقریر میں استعمال کرتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے یہ کفر و شرک صرف مذاق میں یا غیر شعوری طور پر استعمال کرنے تک ہی محدود ہے۔ اس کا اثر آنے والی مسلمان نسلوں پر پڑ رہا ہے۔ ڈرامے فلمیں دیکھ کر ہندوؤں کی رسمیں، کپڑے اور لفظ سبھی ہمارے ہاں آ رہے ہیں۔ ابھی تو شاید حماقت اور جہالت کی وجہ سے یہ الفاظ ادا کیے جاتے ہیں۔ خدانخواستہ کل یہ سوچ کا حصہ بن گئے ہمارا کوئی پیارا سر پر گیروی کپڑا باندھ کر کسی دیوی کے آگے پرارتھنا کرتا نظر آیا تو کیسا لگے گا۔

(سارہ بتول، راولپنڈی)

بندر کے ہاتھ چھری

کیا بندر کے ہاتھ میں چھری آ گئی، ایک منفرد موضوع کا فیچر تھا۔ ایک صحافی کا دوسرے صحافی کے لیے ایسا رویہ، بری طرح ''منفرد'' لگا۔ خصوصاً اس حوالے سے کہ وہ بھی اسی پلیٹ فارم سے گزر کر صحافی بنا ہو۔ لے آؤٹ، ڈیزائن میں تبدیلیوں اور فونٹ سائز کو بڑا کرنے کے بعد شمارہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ دیکھنے میں بے حد اچھا لگ رہا ہے۔

(رانا محمد شاہد، گلستان کالونی بورے والا)

ریلوے کا بوجھ بوڑھوں کے سر

آج کے دور میں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو ڈوب رہا ہو۔ اس کے کاندھے پر پیر رکھ کے اسے ڈبو دیا جاتا ہے۔

ریلوے کو دیکھ لیں، دونوں ہاتھوں اور پیروں سے لوٹ کے کھانے والوں نے اسے کنگال کر کے اطمینان کا سانس نہیں لیا۔ بلکہ 65 سال کے بزرگ شہریوں کی ٹکٹ آدھی کر دی ہے تاکہ ریلوے ڈوبنے کا پورا الزام ان بزرگوں پر ڈال سکیں۔

(بشیر احمد بھٹی، بہاول پور)

صوبہ صوبہ کھیلیں

پاکستان میں نئے صوبوں کے ضمن میں حکومت کی پالیسی کے بارے میں۔ ''آؤ! صوبہ صوبہ کھیلیں!'' کے عنوان سے ایک تحریر آپ کی خدمت میں ایک دو دن قبل ارسال کی تھی۔

اس کے بارے میں عرض کرنا مقصود ہے کہ اس کی ابتدائی سطور میں سہواً کچھ الفاظ درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔

مرسلہ تحریر میں علامہ اقبال کے الفاظ ''قومیں حکیموں (فلسفیوں، مدبروں) کی رہنمائی میں تولد (پیدا) ہوتی ہیں، سیاستدانوں کے ہتھے چڑھ کر مر جاتی ہیں۔'' حالانکہ صحیح اور پورا حوالہ یہ ہے ''قومیں حکیموں (فلسفیوں، مدبروں) کی رہنمائی میں تولد ہوتی ہیں۔ شاعروں کے ہاتھوں پروان چڑھتی ہیں اور سیاستدانوں کے ہتھے چڑھ کر مر جاتی ہیں۔'' خط کشیدہ الفاظ مرسلہ تحریر میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ براہ کرم تصحیح فرما لیجیے گا۔ (پروفیسر محمد اسلم اعوان، گوجرانوالہ)

(پروفیسر صاحب! تحریر تو چھپنے سے رہ گئی کہ اب ایشو ہی ختم ہو گیا۔ البتہ آپ کی وضاحت چھاپ دی ہے تاکہ تصحیح نہ ہونے کا افسوس تو نہ ہو۔)

جیل میں غنیمت اور نعمت

اپریل کا رسالہ 12 تاریخ کو ملا۔ ہر بار جلدی میں بھی آدھا مہینا گزر جاتا ہے۔ جیل میں ہمارے لیے یہ غنیمت بھی ہے اور نعمت بھی۔ اُلٹی طرف سے ابتداء کی۔ درِ دل پہ دستک میں ایک اور حساس موضوع پر مضمون پڑھنے کو ملا۔ یقیناً ایسے مضامین سے کتنے ہی لوگ سبق حاصل کرتے ہوں گے۔ کالم سے فراغت کے بعد سرورق کی طرف دھیان دیا۔ جہاں زرداری صاحب چھوٹتی زنجیر کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آئے۔ طیب صاحب کا نوٹ بھی خوب تھا مگر ہم فیس بک اور انٹرنیٹ جیسی سہولت سے محروم ہیں اس لیے پرانے میگزین ہماری پہنچ سے دور ہیں۔ شعراء کا کلام البتہ رسالے میں پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ پُرانے میگزین سے یاد آیا کہ ہمارے پاس موجود 2011ء کے تمام رسالے کھو گئے ہیں۔ مسئلہ کچھ یوں ہے کہ ہمارے پاس جو ملازمین ڈیوٹی کے لیے آتے ہیں ان میں سے کچھ مطالعے کا شوق رکھتے ہیں اور ان کے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے ہمارے پاس اردو ڈائجسٹ ہے۔ اور جو اسے ایک دفعہ پڑھتا ہے دوبارہ ضرور مانگتا ہے بعض تو ایسے ہوتے ہیں جو اپنے ساتھ ہی لے جاتے ہیں اور ہم رہ جاتے ہیں ہاتھ ملتے۔ آئندہ نہ دینے کا ارادہ اُس وقت ٹوٹ جاتا ہے جب اپنے نقصان کو دوسروں کے فائدے کے لیے برداشت کرنے کا جذبہ ہم خود میں دیکھتے ہیں۔ اب عرض یہ ہے کہ 2011ء کے

تمام رسائل ہمیں درکار ہیں اگر آپ کے یہاں سے مل جائیں تو بہت اچھا ورنہ کوئی اور رستہ دکھا دیں۔ تاکہ وہ تمام میگزین ہم حاصل کر سکیں۔ جو ہمارے لیے نایاب چیزیں ہیں۔ اُمید ہے ہمارے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے آپ ضرور کوشش کریں گے۔

فہرست میں نیا انداز دیکھنے کو ملا: جو میری طرح دوسرے قارئین کو بھی پسند آئے گا۔ صرف پانچ منٹ کا تعارف پڑھنے کے بعد فوراً صفحہ نمبر 133 کھولا۔ ہبۃ الدباغ کی کہانی پڑھ کر مجھے اپنی یہ جیل ریسٹ ہاؤس لگنے لگی۔ رب العزت ان کی قربانی کو قبول فرمائے اور ہمیں استقامت نصیب فرمائے، آمین۔ گمراہ نصیری، علوی کے ساتھ اگر شیعہ کا اضافہ کر دیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ شاید اکثر قارئین نصیری علوی فرقے کو نہ جانتے ہوں۔ عرب بہار سے ایک جھونکا سرزمین شام کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے اور جلد ہی شام کے مسلمان بھی مصر، لیبیا، تیونس کی طرح سکون کا سانس لیں گے۔ ان شاء اللہ۔

صرف پانچ منٹ کے بعد مصر کی سیر کے لیے نکلے۔ آپ کے ہمراہ قاہرہ کے چند علاقوں میں گھومے۔ اہرام مصر بارے معلومات میں کچھ اضافہ کیا۔ مرسی صاحب پاکستان کا مختصر دورہ کر چکے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں نے مگر اُنہیں وہ پروٹوکول نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک ایسے جدید اسلامی ملک کے سربراہ ہیں جو امریکا کے ماتحت نہیں؟ رفاہ بارڈر پر آپ کا استقبال تو وزراتِ صحت کے وفد نے کیا مگر ہمارے لیے شاید ہی کبھی ڈاکٹروں کا وفد آئے طویل انتظار میں بیماری کا حملہ بھی ہو سکتا ہے۔ ایک یہ بھی تو خوبی ہے اپنے اردو میں کہ قسط وار مضامین بہت کم ہوتے ہیں اس میں خیر سے اب گزارہ تو کرنا ہی ہے سو کر لیں گے۔ آئی جی کا بیٹا اگر سات سال قید کاٹ لیتا تو اتنے مصائب سے بچ جاتا۔ اب شاید اُسے ڈبل سزا بھگتنی پڑے۔ ویسے اس طرح کے واقعات عموماً کھلے ماحول کی وجہ سے ہی ہوتے ہیں۔ جواب ہمارے ہاں بھی رواج پاتا جا رہا ہے۔ ہماری بعض بہنیں اشتہارات پر اعتراض کرتی ہیں۔ یہ ان کا حق بھی ہے مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ اُردو کے مقابلے میں باقی رسائل اور اخبارات کہاں کھڑے ہیں۔ ہمارے پاس روزانہ جو اخبار آتے ہیں ان میں ایسے بے ہودہ اور فحش اشتہار ہوتے ہیں کہ انہیں سنسر کرتے ہوئے کافی وقت لگ جاتا ہے۔ اب اخبار بند کرنے سے تو ہم رہے اس لیے آسان طریقہ یہی ہے کہ جو اشتہار خلافِ طبیعت ہو اُس پر قلم چلا دیں۔ ویسے حجاب النساء جیسے پاکیزہ اشتہار بھی تو اردو کا ہی خاصہ ہیں۔

سابقہ رسالے میں قاضی صاحب کی شخصیت پر چند تحاریر پڑھنے کو ملیں۔ اُمید ہے آئندہ بھی اُن کی ذات پر لکھا جاتا رہے گا۔

آخر میں ایک تجویز کہ ''اردو ڈائجسٹ کے نئے شمارے کا اشتہار اگر ملک کے اچھے اخبارات میں دے دیا جائے تو بہت سے لوگوں کا بھلا ہو جائے گا۔ کیونکہ آج کے اکثر لوگ اردو ڈائجسٹ سے آشنا ہی نہیں ہیں۔ جب انہیں ایک صاف ستھرا رسالہ پڑھنے کو ملے گا تو گھٹیا قسم کے رسائل سے ان کی جان چھوٹ جائے گی

(محمد رفاقت فاروقی۔ اسیر سیل سنٹرل جیل اڈیالہ روالپنڈی)

دردِل پہ دستک

اختر عباس

urdudigest.pk

akhterabas@ymail.com

گندے نالے پر ایک اور گھر

گندے نالے کے بالکل قریب گاڑی کھڑی کر کے ایک لمبا فون سننا کوئی ایسا خوشگوار تجربہ بھی نہیں کہ اسے یاد رکھا جائے۔ میں اسے بھول جانا چاہتا ہوں کہ دفتر سے نکل کر برڈ وڈ روڈ سے ہوتے ہوئے کچا لارنس روڈ پر جب ایک فون نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''آپ نے اپنے کالم میں آدھی ادھوری بات لکھی ہے۔ کیا پورا سچ لکھنے کا حوصلہ نہیں ہے؟''

اس جملے کے بعد مجھے رک کر ہی بات سننی چاہیے تھی، بلکہ حق تو یہ تھا کہ پورے جسم کو کان بنا کر سنتی چاہیے تھی۔ میں نے موزوں جگہ کی جستجو میں نگاہوں کو دوڑایا اور گندے نالے کے آخری گھر کے بالکل سامنے موزوں جگہ پا کر گاڑی روک دی۔

''میرا نام وقاص احمد ہے اور میں شاہ رکن عالم کالونی ملتان میں رہتا ہوں۔ میری عمر 17 سال ہے اور ایک این جی او نے کم عمری کے باعث مجھے اپنا ممبر بنانے سے معذرت کر لی ہے۔ میں ''سیف سیکس'' کے حوالے سے کام کرنے والی اسلام آباد کی ''ساحل'' نامی تنظیم کے بلند مقاصد سے متاثر ہو کر اس میں شامل ہونا چاہتا تھا۔

''آپ سچ کے داعی ہیں، تو سچ یہ ہے کہ سچ بے حد کڑوا ہو چکا ہے۔ آپ بھی اسے برداشت نہیں کر پائیں گے۔'' وقاص نے کہا۔

میں وقاص کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ''وہ ایسی کیا بات کرنے والا ہے جو پورا سچ ہو گی اور ادھوری نہیں ہو گی اور اتنی کڑوی بھی ہو گی کہ اسے برداشت کرنے کے لیے سوچنا پڑے گا۔

''یا تو آپ میں ہمت نہیں کہ پوری بات لکھیں یا آپ کو پوری خبر نہیں۔'' اس کی یہ بات سن کر میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اتنی سی عمر میں تمھیں اس سچ کا کیسے پتا چلا جو ہم تک بھی پورا نہیں پہنچا۔''

اس کا جواب ترنت آیا کہ ''میں گزشتہ چھ ماہ سے اس سچ کا حصہ ہوں اور اسی سلسلے میں آپ کو فون کیا ہے کہ آپ سے مشورہ لوں، میں اب کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتائیے گا کہ میں اب کیا کروں؟''

کیا کبھی کوئی بات واقعی گرم سیسے کی طرح ہو سکتی ہے کہ آپ کے کانوں میں جائے اور اندر باہر سے سلگاتی، آگ لگاتی، اس ناقابل برداشت، ناقابل تصور تلخ کیفیت سے دوچار کر دے۔ میں اسی لمحے سے گزر رہا ہوں اور ایک فون کال نے مجھے اس تلخی سے دوچار کیا ہے۔

''آپ کے ملک کے چار بڑے شہر ''بچوں کی سیکس مارکیٹ'' بن چکے ہیں۔ یہ ''گے سیکس سنٹرز'' کہلاتے ہیں۔ کراچی، لاہور، ملتان اور اسلام آباد۔ ان کے بارے میں معلومات اور بزنس اتنا اوپن ہے کہ MIRC چینل کے اوپر آپ نیٹ چیٹ (Net Chat) کر سکتے ہیں۔ Gay Pakistani سائٹ ہے، یہ بالکل ویسے ہی آپریٹ کرتی ہے جیسے Gay America اور Gay india۔ اس کو سرکاری، غیر سرکاری طور پر کبھی Lock نہیں کیا گیا۔

اس کو وہ لوگ جوائن کرتے ہیں جو ذہنی اور جسمانی طور پر سیکس پرورٹڈ ہیں۔ یہ پڑھے لکھے اور بہت اچھے گھروں اور خاندانوں کے لڑکے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ بچپن میں، ان کے اپنے گھروں میں سیکس ابیوز ہوا (کسی بچے بچی کے ساتھ 18 سال کی عمر میں جسمانی اور جنسی زیادتی ہو تو وہ ریپ کہلاتا ہے، اس سے کم عمری میں وہ اس عذاب سے گزرے تو اسے Sex Abuse کہا جاتا ہے) جن کے ساتھ یہ عمل ہوتا رہا وہ بالآخر اس کے عادی ہوتے گئے اور اس لت یا بیماری میں مبتلا ہو گئے اور اب Gays کہلاتے ہیں اور Lust اور پیسے کے لیے اس غلیظ کاروبار کا حصہ ہیں۔

جب اس سیکس سائٹ پر جاتے ہیں تو وہ ASL پوچھتے ہیں یعنی Age, Sex, Location پھر Status یعنی Weight, Color, Body۔ یہ تفصیلات یوں دی اور لی جاتی ہیں جیسے منڈی سے کسی چوپائے کو خریدتے اور بیچتے ہوئے درکار ہوتی ہیں۔

پھر آئی ڈی اور، Contact لیا جاتا ہے، ریٹ کبھی وہاں اور کبھی بعد میں موقع پر طے کیا جاتا ہے۔ ان کی روشن خیالی یہیں سے شروع ہوتی ہے اور یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ لڑکے اتنے بڑے بڑے گھروں اور پوش علاقوں کے ہیں کہ انسان یقین نہ کرے۔ ان کے والدین کو پتا چلے تو شرم سے مر جائیں۔

کراچی جیسے شہر میں ان کی کثرت، رابطوں اور کاروبارِ گناہ کا عالم یہ ہے کہ باقاعدہ Gay Parties منعقد ہوتی ہیں۔ چائے کی ایک بڑی کمپنی کا نوجوان مالک ان پارٹیوں کا اہتمام کرتا ہے۔ ایک لڑکے ''بریکنگ'' کا رقص، ان پارٹیوں کی جان کہلاتا ہے۔ دو ملکوں کے سفارت کار بھی ان تقریبات میں مددگار ہوتے ہیں۔ شوبز سے تعلق رکھنے والے کئی لوگ اور ان کے میک اپ آرٹسٹ اس دلدل میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کراچی کے ایک گلوکار کو دنیا جانتی ہے کہ Gay Community کا حصہ ہے۔ اس طرح لاہور کا ایک خوبصورت ماڈل اور اداکار بھی اس لعنت کا شکار ہے۔''

وقاص کی باتیں، انگاروں کی طرح میرے کانوں میں اتر رہی تھیں۔ جب اس نے کہا کہ ''ملتان، لاہور، کراچی اور اسلام آباد میں باقاعدہ Child Prositutes ہیں۔ تو مجھے یاد آیا کہ اسلام آباد کے ایک میگزین نے ایک چائلڈ پروس طارق کا باقاعدہ انٹرویو بھی چھاپا تھا اور یہ تک لکھا تھا کہ ایک پولیس والے نے اس کو 20 روپے دیئے تھے جو اس سے اس کے مالک نے لے لیے۔ اسے اپنے مالک کو یومیہ دو سو روپے ہر صورت میں دینے ہوتے ہیں۔ تب پڑھ کر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ملتان میں بسوں کے اڈے، شاہ رکن عالم کالونی، کھاد فیکٹری سے بہاول پور مظفر گڑھ بائی پاس تک پوری ایل شیپ پٹی ہے جہاں ٹین ایجر پروس دستیاب ہوتے

ہیں۔ پولیس، ٹرک ڈرائیور، دوسرے شہروں سے آنے والے تاجر اور عیاش زمیندار ان سے براہِ راست رابطہ کرتے ہیں، جب کہ پڑھے لکھے اور امیر تاجر نیٹ پر رابطہ کرتے ہیں اور ہوٹلوں میں ملاقاتیں کرتے ہیں۔"

"وقاص! یہ ساری باتیں آپ کو کیسے پتا چلیں؟" میرا ابھی تک ان پر یقین کرنے کو دل آمادہ نہیں تھا۔"

اس نے میری بات سنی اور پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولا "میں گزشتہ 6 ماہ سے اس غلیظ نیٹ ورک کا حصہ ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ تجرباتی طور پر خود مشاہدہ کروں مگر پھر اس میں دھنستا چلا گیا۔ جن جن لوگوں سے میری ہوٹلوں میں ملاقات ہوئی ہے وہ سارے بہت پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے تاجر ہی نہیں بعض کمپنیوں کے اعلیٰ افسر بھی تھے۔ میں ان لڑکوں سے بھی معلومات لیتا رہا ہوں۔ تب ہی اتنا باخبر ہوں کہ آپ کو یہاں بیٹھا بتا سکتا ہوں کہ لاہور میں یو گنڈا ہوٹل اور اس کے آس پاس رہنے والے کالے جمیکے اب ڈیفنس میں کہاں رہتے ہیں۔ الفلاح سینما، الحمرا اور نہر کے پل سے لبرٹی چوک تک کہاں کہاں یہ مارکیٹ آپریٹ کر رہی ہے۔

کچے لارنس روڈ کی آخری کوٹھی کے سامنے گاڑی کھڑی کیے اور موبائل کان سے لگائے مجھے آدھ گھنٹہ بیت چکا ہے۔ ڈیش بورڈ پر رکھی ڈائری نوٹس سے بھر چکی ہے، وقاص کی گفتگو جاری ہے۔ وہ نام بتا رہا ہے، مقام بتا رہا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ لاعلمی اور بے علمی کیا دونوں ایک ہی جیسی کیفیت کے عنوان ہو سکتے ہیں؟ کیا میں ذاتی سطح پر اور ہمارے اہلِ اختیار اجتماعی سطح پر ایک سی بے خبری اور بے نیازی کا شکار ہیں۔

میرے سامنے والے گھر کے باہر کیلے کے بڑے بڑے پتے لہرا رہے ہیں۔ یہ سارے گھر بالکل گندے نالے کے اوپر واقع ہیں۔ پہلے دو گھر اور پھر ایک چھوڑ کر تین گھر ایسے ہیں جنھوں نے نالے پر پُل بنا کر اپنے آنے جانے کے الگ راستے بنا رکھے ہیں۔ گھر کی دیواروں سے متصل اور سڑک کی جانب کیلے کے کتنے ہی پودے اور جھاڑی نما پھول پودے اُگائے ہوئے ہیں۔ یہ روز گھر سے آتے جاتے گزرتے ہیں تو یہاں کے مکینوں کو صرف پودے اور سبزہ ہی نظر آتا ہے، بُو انھیں محسوس ہوتی ہی نہیں۔

برسوں پہلے جب میں نے لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ پرسنل کونسلنگ (Personal Councling) شروع کی تو خیال تھا کہ اتنے برسوں میں جو علم حاصل کیا ہے اس کی روشنی میں دوسروں کو سننے کے بعد کوئی بہتر مشورہ دے سکوں گا۔ اللہ کی دُکھی اور مایوس مخلوق کی زندگی میں تھوڑی آسانی اور آسودگی کا باعث بن سکوں گا۔ یہ کب علم تھا کہ دنیا کے مشکل کاموں میں سے ایک کام دوسروں کے دُکھوں اور مسئلوں کو سننا اور ان کے آنسوؤں کو جذب کرنا ہے۔ اکثر آنے والے حل جاننے سے زیادہ رونے کے لیے ایک کندھے یا نرم سے تکیے جیسے وجود کے متلاشی ہوتے ہیں۔ سچی بات ہے کہ کالم نگاری بھی اسی قبیل کا کام ہے، اسی کام کی ایکسٹینشن ہے۔ چاہے تو گندے نالے پر گھر آباد کر کے، کیلے کے پودے اُگا کے نالے کے وجود سے ہی بے نیاز ہو جایا جائے، نہ خود دیکھا جائے نہ ہی کسی کے دیکھے جانے کو تسلیم کیا جائے۔ زندگی تو بڑے ہی آرام سے گزر جائے گی اور چاہے تو حقیقت کو جان اور مان کر اس کی بُو روکنے، گندگی کی صفائی کے لیے انتظام اور آگہی (Awareness) کے لیے کچھ کیا جائے۔ یوں بہت سے ہاتھ اور بہت سے ذہن مل کر مسئلے کا حل سوچیں اور کسی فرد اور ادارے کے ذمے

لگائیں اور بُرا بھلا کہنے کی بجائے مثبت اور پائیدار سوچ کو بوئیں تو شاید اس سیکس مارکیٹ کو نئے ورکر ملنے کم ہو جائیں، بند ہو جائیں۔ نئی زندگیاں برباد ہونے سے اور نئی ذلتیں تقسیم ہونے سے رک جائیں۔

کوئی مشورہ دینے سے پہلے وقاص سے پوچھا "تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" اس نے کہا کہ میں ان "چائلڈ پروس" بچوں میں "سیف سیکس" کے لیے کام کرنا چاہتا ہوں تاکہ انھیں ایڈز سے بچنے اور HIV پازیٹو ہونے، نہ ہونے کی احتیاطیں بتا سکوں۔"

"تم جانتے ہو نا یہ کام ہے کیا؟ جو کرنے کا تم نے فیصلہ کیا ہے؟ جی ہاں کینیڈا کے تعاون سے کئی این جی اوز یہی کر رہی ہیں۔ میں بھی ان کا ممبر بن جاؤں گا، وہ لٹریچر کے علاوہ ساری امدادی چیزیں مفت فراہم کرتی ہیں۔"

مجھے لگا گندگی سے بھرے نالے پر ایک اور گھر تعمیر ہونے لگا ہے، اس لیے تعمیر کے آغاز سے پہلے بول پڑا "جانتے ہو سیف سیکس کی خدمات کا مطلب کیا ہے؟ یعنی یہ کہ آپ ان سے کہو گے گناہ اور خرابی کے جس کام میں تم مبتلا اور ملوث ہو وہ کرتے رہو، مگر یہ کچھ احتیاطی تدابیر ہیں ان کو استعمال کرو تاکہ جسمانی طور پر بیمار نہ ہو جاؤ اور تم سے یہ بیماری، تمھیں استعمال کرنے والوں کو نہ لگ جائے۔ وہ کم نصیب جو دوسروں کے لیے صرف عیاشی اور جسمانی لذت کا ذریعہ بن کر خدا کی نافرمانی، خاندان کی بے عزتی اور معاشرے کی بے حرمتی کا باعث بنتے ہیں۔ انھیں نہ تو سمجھایا جائے، نہ عذاب سے ڈرایا جائے۔ وہ جس مالی، روحانی، جسمانی بحران کا شکار ہیں اس کا ان سے ذکر بھی نہ کیا جائے اور انھیں کسی بیماری سے پاک صاف بکری، بھیڑ اور چوپائے کی طرح تیار کیا جائے تاکہ وہ معاشرے کے بدترین اور غلیظ ترین کام میں استعمال ہوتے رہیں۔ کیا ان کا حق نہیں کہ انھیں "سیف سیکس" کے بجائے "سیف لائف اینڈ ڈیتھ" کا سبق سکھایا اور پڑھایا جائے۔ یہ جنسی ابنارملٹی، ایک جرم اور گناہ سے پہلے ایک مرض ہے۔ جس کا باقاعدہ علاج ہو جاتا ہے۔ انھیں اس کا کیوں نہ بتایا جائے، انھیں مارکیٹ میں بکنے کے لیے تیار مال کے طور پر کیوں محفوظ کیا جائے کہ انھیں ایڈز نہ ہو اور یہ کسی دردناک موت سے دوچار نہ ہو جائیں۔"

وقاص بار بار میرا شکریہ ادا کر رہا ہے۔ "سر! آپ نے تو میرا نقطۂ نظر ہی بدل دیا ہے۔ میں تو گناہ کے کاروبار کو بڑھاوا دینے اور محفوظ کرنے کے کام میں شریک ہونے والا تھا۔ شاید کسی بدبخت اور رذیل دلال کی طرح..... میں کتنے ہی اچھے جذبے سے کرتا، کام تو سیکس مارکیٹ کو محفوظ مال کی فراہمی اور دستیابی کو ممکن بنانا ہی تھا۔"

مجھے دور تک گندے نالے کے ساتھ کیلے کے درخت اور ان کے پتے نظر آ رہے تھے۔ وقتی طور پر نالا نظر آنا بند ہو گیا تھا۔ ہمارے سماج کے بڑوں کے لیے بھی بس اتنی سہولت کافی ہوتی ہے کہ ان کو وہ نظر نہیں آتا جو حقیقت میں ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے دیکھنا، سوچنا اور حل کرنا ہی نہیں چاہتے۔ مگر کیا ابھی بھی وقت نہیں آیا کہ پورے جسم کو کان بنا کر یہ بات سننی چاہیے اور بدنامی و رسوائی سے بھرے اس گندے نالے کو سرے سے بند کرنے کی تدبیریں کی جائیں جس کی لہریں چار شہروں کو تو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہیں۔

مرا در دل نہاں در دیست، اگر گویم زباں سوزد
وگر پنہاں کنم، ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

(میرے دل میں ایسا درد پوشیدہ ہے کہ کہوں تو زباں جلتی ہے اور اگر چھپاؤں تو ہڈیوں کا گودا (تک) جلا دے (گا)۔)

■■■